اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد 26

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

تفسیر نمونہ جلد ۲۶

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
سُورۂ نبأ	۲۹
سورۂ نبأ کے مضامین اور اس کا دائرہ کار	۳۱
اس سورہ کے مضامین کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔	۳۱
تلاوت کی فضیلت	۳۲
آیت ۱ تا ۵	
اہم خبر	۳۳
چند نکات	
۱: مسئلۂ ولایت اور نبأ عظیم	۳۵
۲: معاد و قیامت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟	۳۷
آیت ۶ تا ۱۶	۳۹
ایک نکتہ	
ان آیات کا مسئلۂ معاد سے تعلق	۴۹
آیت ۱۷ تا ۲۰	۵۱
آخر کار روزِ موعود آکر رہے گا۔	۵۱
آیت ۲۱ تا ۳۰	۵۶
جہنم ایک عظیم کمین گاہ	۵۷
آیت ۳۱ تا ۳۷	۶۲
پرہیز گاروں کی عظیم جزا کا ایک حصہ	۶۲

عنوان	صفحہ
چند نکات	
۱: متقین کے لیے عطیات اور سرکشوں کے لیے عذاب	۶۷
۲: جنت کے مشروب	۶۷
آیت ۳۸ تا ۴۰	۶۹
کافر کہیں گے کہ کاش ہم مٹی ہوتے۔	۶۹
ایک نکتہ	
مسئلہ جبر و اختیار کے حل ہونے کا واضح راستہ	۷۵
سورۂ نازعات	۷۹
سورۂ نازعات کے مضامین اور اس کا دائرۂ فکر	۸۱
تلاوت کی فضیلت	۸۱
آیت ۱ تا ۵	۸۳
انتھک فرشتوں کی قسم	۸۳
دو سوالوں کا جواب	۸۷
آیت ۶ تا ۱۴	۸۸
معاد صرف ایک عظیم صیحہ سے رونما ہو گا	۸۹

آیت ۱۵ تا ۲۶ ۹۳
فرعون کہتا تھا کہ میں تمہارا بہت بڑا خدا ہوں۔ ۹۴
ایک نکتہ
قرآن کی فضیلت کا ایک گوشہ ۹۹
آیت ۲۷ تا ۳۳ ۱۰۰
تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمانوں کی۔
(معاد پر ایک دوسری دلیل۔) ۱۰۱
آیت ۳۴ تا ۴۱ ۱۰۵
وہ جو اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے باز رکھیں۔ ۱۰۶
چند نکات
۱ : مقامِ رب کیا ہے۔ ۱۰۸
۲ : طغیان اور دنیا پرستی کے درمیان ربط ۱۰۹
۳ : صرف دو گروہ ۱۱۰
آیت ۴۲ تا ۴۶ ۱۱۱
قیامت کی تاریخ صرف خدا جانتا ہے۔ ۱۱۱
سورۂ عبس ۱۱۵
سورۂ عبس کے مضامین ۱۱۷
اس سورہ کا نام اس کی مناسبت سے
تلاوت کی فضیلت ۱۱۷
آیت ۱ تا ۱۰ ۱۱۹
حق طلب نابینا سے بے اعتنائی برتنے پر شدید
عتاب۔ ۱۲۲
آیت ۱۱ تا ۲۳ ۱۲۴
صرف پاک لوگوں کا ہاتھ قرآن کے دامن تک
پہنچتا ہے۔ ۱۲۵
آیت ۲۴ تا ۳۲ ۱۳۳
انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی غذا کی طرف دیکھے۔ ۱۳۴
ایک نکتہ
صحیح و سالم موادِ غذائی ۱۴۰
آیت ۳۳ تا ۴۲ ۱۴۲
صیحۂ قیامت ۱۴۳
ایک نکتہ
تعمیرِ ذات کی راہ ۱۴۶
سورۂ تکویر ۱۴۹
سورۂ تکویر کے مضامین ۱۵۱
تلاوت کی فضیلت ۱۵۱
آیت ۱ تا ۹ ۱۵۳
جس دن کائنات کے دفتر کو لپیٹ دیا جائیگا۔ ۱۵۴
چند نکات
۱ : لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا۔ ۱۵۸
۲ : اس جرم کے مختلف اسباب و عوامل تھے۔ ۱۵۹
آیت ۱۰ تا ۱۴ ۱۶۰
اس دن معلوم ہو گا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ ۱۶۰
چند نکات
۱ : نظمِ آیات ۱۶۲
۲ : کیا نظامِ شمسی ختم ہو جائے گا اور ستاروں کے
چراغ گل ہو جائیں گے؟ ۱۶۳
آیت ۱۵ تا ۲۵ ۱۶۵
وحیِ الٰہی اس پر نازل ہوئی۔ ۱۶۶
ایک نکتہ

رسولؐ کی شائستگی کی شرطیں ۱۷۳
آیت ۲۶ تا ۲۹ ۱۷۵
اے غافلو کہاں جا رہے ہو؟ ۱۷۵
سورہ انفطار ۱۷۹
سورۂ انفطار کے مضامین ۱۸۱
تلاوت کی فضیلت ۱۸۱
آیت ۱ تا ۵ ۱۸۳
جس وقت اس جہان کا نظام زیروزبر ہو جائیگا ۱۸۳
ایک نکتہ
وہ آثار جو انسان کے بعد باقی رہ جاتے ہیں۔ ۱۸۶
آیت ۶ تا ۱۲ ۱۸۹
اے انسان تجھے کس چیز نے مغرور کر دیا ہے؟ ۱۹۰
ایک نکتہ
ثبتِ اعمال کے مامورین ۱۹۷
آیت ۱۳ تا ۱۹ ۲۰۰
وہ دن جس میں کوئی شخص کسی کے لیے کوئی کام انجام نہیں دے گا۔ ۲۰۱
سورۂ مطففین ۲۰۵
سورۂ مطففین کے مضامین کا دائرۂ کار ۲۰۷
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت ۲۰۷
آیت ۱ تا ۶ ۲۰۹
کم تولنے والوں پر وائے ہے ۲۱۰
ایک نکتہ ۲۱۴
آیت ۷ تا ۱۰ ۲۱۷
تو کیا جانے کہ سجین کیا ہے؟ ۲۱۷
جو قرآن ان معانی کی تائید کرتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔ ۲۱۸
آیت ۱۱ تا ۱۷ ۲۲۲
گناہ دلوں کا زنگ ہیں۔ ۲۲۳
چند نکات
۱: دل کے لیے گناہ کیوں زنگ ہے۔ ۲۲۶
۲: روح و جان کے چہرہ پر عذاب ۲۲۸
آیت ۱۸ تا ۲۸ ۲۲۹
علیین ابرار کے انتظار میں ہے ۲۳۰
چند نکات
۱: ابرار اور مقربین کون لوگ ہیں؟ ۲۳۶
۲: جنت کی شرابیں ۲۳۷
آیت ۲۹ تا ۳۶ ۲۳۹
اس دن وہ مومنین کا مذاق اڑاتے تھے لیکن آج ۲۴۰
ایک نکتہ
دشمنانِ حق کا مذاق اڑانے کا بزدلانہ حربہ ۲۴۴
سورۂ انشقاق ۲۴۷
سورۂ انشقاق کے مضامین اور اس کی تلاوت کی فضیلت ۲۴۹
آیت ۱ تا ۹ ۲۵۱
کمالِ مطلق کی طرف رنج آمیز سعی و کوشش ۲۵۲
چند نکات

۱: ایک ایسی حدیث جس میں اعجاز ہے۔ ۲۵۷
۲: دنیا رنج و تکلیف اور دکھ درد کا گھر ہے۔ ۲۵۷
آیت ۱۰ تا ۱۵ ۲۵۸
وہ جو شرم و حیا کے باعث اپنا نامہ اعمال پشت کی طرف سے لیں گے۔ ۲۵۹
آیت ۱۶ تا ۲۵ ۲۶۳
تم ہمیشہ دگرگوں ہوتے رہتے ہو ۲۶۴
ایک نکتہ ۲۶۹
سورۂ بروج ۲۷۱
سورۂ بروج کے مضامین اور فضیلت ۲۷۳
آیت ۱ تا ۹ ۲۷۵
مومنین انسانوں کو جلانے والی بھٹیوں کے سامنے۔ ۲۷۶
چند نکات
۱: اصحاب اخدود کون لوگ تھے۔ ۲۸۲
آیت ۱۰ تا ۱۶ ۲۸۶
تشدد کرنے والے عذاب الٰہی کے سامنے ۲۸۷
آیت ۱۷ تا ۲۲ ۲۹۱
تو نے دیکھا کہ خدا نے فرعون و ثمود کے لشکروں کے ساتھ کیا کیا؟ ۲۹۱
سورۂ طارق ۲۹۵
سورۂ طارق کے مضامین اور فضیلت ۲۹۷
آیت ۱ تا ۱۰ ۲۹۹
اے انسان دیکھ کہ تو کس چیز سے پیدا ہوا ہے۔ ۳۰۰
آیت ۱۱ تا ۱۷ ۳۰۸
میں دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہوں۔ ۳۰۸
سورۂ اعلیٰ ۳۱۳
سورۂ اعلیٰ کے مضامین اور ان کی فضیلت ۳۱۵
آیت ۱ تا ۵ ۳۱۷
خداوند عظیم کی تسبیح کر ۳۱۷
آیت ۶ تا ۱۳ ۳۲۳
ہم تجھے ہر اچھے کام کے لیے آمادہ کریں گے۔ ۳۲۴
آیت ۱۴ تا ۱۹ ۳۲۹
وہ دستور العمل جو تمام آسمانی کتب میں آیا ہے۔ ۳۲۹
ایک نکتہ
حب الدنیا اس کل خطیئۃ کی تحلیل ۳۳۲
سورہ غاشیہ ۳۳۵
سورۂ غاشیہ کے مشتملات اور اس کی فضیلت ۳۳۷
آیت ۱ تا ۷ ۳۳۹
بدنصیب تھکے ماندے ۳۴۰
آیت ۸ تا ۱۶ ۳۴۳
بہشت کی روح پرور نعمتوں کے مناظر ۳۴۴

* * *

آیت ۱۷ تا ۲۶ ۳۱۸
اونٹ کی طرف دیکھو جو خود ایک آیت ہے ۳۴۹
سورۂ فجر ۳۵۵
سورۂ فجر کے مشمولات اور اس کی فضیلت ۳۵۷
آیت ۱ تا ۵ ۳۵۹
تمھاری صبح کی سفیدی کی قسم ۳۵۹
آیت ۶ تا ۱۴ ۳۶۵
تیرا پروردگار ظالموں کی گھات میں ہے۔ ۳۶۶
آیت ۱۵ تا ۲۰ ۳۷۲
نہ اس کی نعمت کے ملنے پر غور کرو اور نہ سلبِ نعمت پر مایوس ہو ۳۷۲

تفسیرِ نمونہ

جلد : ۲۶

قرآن مجید کے تیسویں پارہ کا آغاز

سورۂ ۱ نبأ

یہ سورہ مکّی ہے اور اس کی چالیس آیتیں ہیں۔

تاریخ ابتداء

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

سورہ نبأ کے مضامین اور اس کا دائرہ کار

قرآنِ مجید کے آخری پارہ کی سورتوں کی اکثریت، اصولی طور پر، مفسرین کے اتفاق رائے کے مطابق مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ ان سورتوں میں مسئلہ مبداء و معاد اور بشارت و انذار ہی کی گفتگو ہے اس لیے کہ مکی سورتوں کا یہی مزاج ہے۔ یہ آیتیں عام طور پر دل ہلا دینے والی ہیں اور یہ سرکوبی کرنے والا لب و لہجہ رکھتی ہیں۔ ان کا انداز ایسا ہے جو خفتہ دلوں کو بیدار کر دے۔ ان تمام سورتوں کی آیتیں، سوائے چند مختصر موارد کے، اشاروں سے پُر ہیں۔ اسی وجہ سے ہر قلبِ آگاہ پر بڑا گہرا اثر ڈالتی ہیں حتیٰ کہ جو ناواقف ہیں انہیں بھی متاثر کرتی ہیں۔ یہ بے روح ڈھانچوں میں جان ڈالتی دیتی ہیں اور غیر متوجہ افراد کو عہد کے پورا کرنے کا اور ذمہ داری و جوابدہی کا احساس بخشتی ہیں۔ یہ اپنا ایک علیحدہ جہانِ معانی رکھتی ہیں۔ سورہ نبأ کے مزاج کی کیفیت بھی اپنی وجاہت کے اعتبار سے پورے پارے کی طرح ہے۔ یہ سورہ بیدار کرنے والے سوال سے شروع ہوتا ہے اور عبرتناک جملے پر ختم ہوتا ہے۔

اس سورہ کے مضامین کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ سوال جو سورہ کی ابتداء میں ایک عظیم حادثہ (نبأ عظیم) یعنی روزِ قیامت کے بارے میں کیا گیا ہے۔

۲۔ اس کے بعد چند نمونے خدا کی قدرت کے مظاہر کے، آسمان و زمین کے اور انسانوں کی زندگی کے پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے لطف و کرم کو معاد و قیامت کے امکان کی دلیل کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔

۳۔ تیسرے حصہ میں قیامت کے آغاز کی کچھ نشانیاں بتاتا ہے۔
۴۔ اس حصہ میں سرکشی کرنے والوں پر نازل ہونے والے عذاب کا ایک رُخ پیش کرتا ہے۔
۵۔ اس حصہ میں جنت کی تشویق دلانے والی نعمتوں کی تشریح کرتا ہے
۶۔ آخر میں عذاب قریب کے سلسلہ میں شدید خوف پر اور کافروں کی المناک سرنوشت کے ذکر پر سورہ ختم ہوتا ہے۔

اس سورہ کا نام رکھنے کی وجہ وہ تعبیر ہے جو اس کی دوسری آیت میں آئی ہے بعض اوقات اسے "سورۂ عم" کا نام بھی دیا جاتا ہے اور یہ اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

سورۂ نبأ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث ہے (من قرأ سورة عمّ یتساءلون سقاه الله برد الشراب یوم القیامة) "جو شخص سورۂ عمّ یتساءلون پڑھے اسے خداوند عالم قیامت میں جنت کے ٹھنڈے اور خوشگوار مشروب سے سیراب کرے گا۔"[1] ایک اور حدیث حضرت امام جعفر صادقؑ کی ہے (من قرأ عمّ یتساءلون لم یخرج سنته اذا کان یدمنها فی کل یوم حتی یزور البیت الحرام) "جو شخص روزانہ سورہ عمّ یتساءلون کی تلاوت کرتا رہے اس کا ایک سال مکمل نہیں ہوگا کہ وہ خانۂ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوگا"[2] ایک اور حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ (من قرأها وحفظها کان حسابه یوم القیامة بمقدار صلوٰة واحد) "جو شخص اسے پڑھے اور یاد کرے تو قیامت میں اس کا حساب اتنی جلدی مکمل ہوگا جتنی دیر میں ایک نماز پڑھی جاتی ہے"[3]

---

[1] و [2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۲۰۔
[3] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۱۹۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ۚ

(۲) عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ۙ

(۳) الَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ ؕ

(۴) کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ۙ

(۵) ثُمَّ کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ

ترجمہ

اُس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

۱۔ وہ ایک دوسرے سے کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

۲۔ عظیم اور اہم خبر (قیامت) کے بارے میں۔

۳۔ وہی خبر جس کے بارے میں وہ ہمیشہ اختلاف رکھتے ہیں۔

۴۔ ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتے ہیں۔ انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

۵۔ پھر بھی ویسا نہیں ہے جو وہ خیال کرتے ہیں۔ انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

تفسیر

اہم خبر

سورہ کی پہلی آیت میں تعجب آمیز استفہام کے عنوان سے فرماتا ہے: "وہ ایک دوسرے سے کس چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں" (عمّ یتساءلون)[1] اس کے بعد بغیر اس کے کہ جواب کا انتظار کرتا خود اس کے جواب میں مزید فرماتا ہے: "وہ ایک عظیم اور اہم خبر کے بارے میں سوال کرتے ہیں" (عن النبأ العظیم)۔

---

[1] مفردات راغب، مادہ نبأ۔

"وہی خبر جس میں ہمیشہ اختلاف رکھتے ہیں" (الذی ھم فیہ مختلفون)۔ اس خبر عظیم سے مراد کیا ہے، مفسرین نے اس سوال کے کئی جواب دیئے ہیں۔ ایک گروہ نے اسے قیامت کے دن کی طرف، بعض نے قرآن مجید کے نزول کی طرف اور بعض نے توحید سے لے کر قیامت تک کے تمام اصول دین کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور چند روایات میں اس کی تفسیر مسئلہ امامت و ولایت کے ساتھ ہوئی ہے جس کی طرف آئندہ نکات کی بحث میں اشارہ ہوگا۔ اس سورہ کی تمام آیات میں غور و فکر کرنے سے اور ان تعبیروں کو پیش نظر رکھنے سے جو بعد والی آیات میں آئی ہیں مثلاً (ان یوم الفصل کان میقاتا) کا جملہ جو زمین و آسمان میں خدا کی قدرت کی نشانیوں کے ذکر کے بعد آیا ہے، اور اس حقیقت کی طرف توجہ کہ مشرکین کی شدید ترین مخالفت مسئلہ معاد میں تھی، یہ سب امور پہلی تفسیر یعنی معاد و قیامت کی تائید کرتے ہیں۔ "نبأ" بقول راغب مفردات میں اس خبر کے معنی میں ہے جو اہمیت رکھتی ہو اور فائدہ کی حامل ہو اور انسان اس کی نسبت علم یا ظن غالب رکھے۔ یہ تینوں باتیں نبأ کے معنی کی شرائط ہیں[1]

اس بنا پر عظیم کا لفظ بہت زیادہ تاکید کا اظہار کرتا ہے اور بحیثیت مجموعی اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ خبر جس میں ایک گروہ شک کرتا تھا ایک جانی پہچانی اہم اور باعظمت حقیقت تھی اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس سے مراد قیامت تھی۔ (یتساءلون) "ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں" کا جملہ ہو سکتا ہے کہ صرف کفار ہی کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ہمیشہ قیامت کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے۔ لیکن یہ سوال تحقیق اور ادراک کی غرض سے نہیں ہوتا تھا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد مؤمنین سے سوال کرنا ہو یا خود پیغمبرؐ سے سوال کرنا ہو۔[2] یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر "نباء عظیم" سے مراد قیامت ہے تو اس سے ظاہر بظاہر سب کافر انکار کرتے تھے، تو پھر یہ کیوں فرماتا ہے کہ وہ اس میں اختلاف کرتے ہیں تو جواب میں ہم کہتے ہیں کہ معاد کا انکار مطلق طور پر قطعی و یقینی نہیں ہے، اس لیے کہ کافروں میں سے بہت سے فنائے جسم کے بعد روح کی بقاء کے قائل تھے، دوسرے لفظوں میں معادِ روحانی کو اجمالاً تسلیم کرتے تھے۔ جہاں تک معادِ جسمانی کا تعلق ہے تو بعض اس میں شک کا اظہار کرتے تھے۔ اس بات کو آیات قرآنی کا لب و لہجہ واضح کرتا ہے (نمل / ۶۶) کافروں میں سے بعض افراد شدت سے انکار کرتے تھے، یہاں تک کہ پیغمبر اسلامؐ کو معادِ جسمانی کا دعویٰ کرنے کی بناء پر معاذ اللہ دیوانہ یا خدا سے جھوٹ منسوب

---

[1] مفردات راغب، مادہ نباء۔

[2] توجہ کرنی چاہیئے کہ باب تفاعل اگرچہ عام طور پر ایسے کام کے معنی میں آتا ہے جو بصورت متقابل انجام پائے لیکن بعض موارد میں ثلاثی مجرد کے معنی رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے معانی بھی رکھتا ہے (بعض اہل لغت نے تفاعل کے پانچ معانی بیان کیے ہیں۔ ۱۔ کسی کام کے انجام دینے میں دو یا دو سے زیادہ افراد کی مشارکت۔ ۲۔ مطاوعت مثلاً تباعد۔ ۳۔ واقعیت کے بغیر کسی چیز کا اظہار مثلاً تمارض (اپنے آپ کو مریض ظاہر کرنا)۔ ۴۔ کسی چیز کا بتدریج وقوع مثلاً تجاور۔ ۵۔ ثلاثی مجرد کے معنی میں مثلاً۔ تعالیٰ جو "علا" "بلند ہوا" کے معنی میں ہے۔

کرنے والا سمجھتے تھے۔ "اور عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا" (کلّا سیعلمون)[1]۔ "پھر بھی ایسا نہیں ہے جیسا وہ گمان کرتے ہیں اور عنقریب وہ آگاہ ہو جائیں گے" (ثم کلّا سیعلمون)۔ اس دن باخبر ہوں گے جس دن ان کی واحسرتا کی فریاد بلند ہوگی۔ وہ اپنی کوتاہی اور کمی سے سخت پشیمان ہوں گے۔ (ان تقول نفس یا حسرتی علی ما فرطت فی جنب اللہ) (زمر/۵۶)۔ وہ دن جس میں عذاب کی لہریں ان کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کا تقاضا کریں گے۔ (ھل الی مرد من سبیل) کیا واپس لوٹنے کی کوئی راہ ہے؟ (شوریٰ/۴۴) یہاں تک کہ موت کے وقت جب انسان کی آنکھوں سے پردے اٹھ جائیں گے اور دوسری دنیا کے حقائق اس کے سامنے ظاہر ہوں گے اور اُسے برزخ و معاد کا یقین ہو جائے گا تو اس وقت اس کی فریاد بلند ہوگی کہ مجھے واپس لوٹاؤ تاکہ میں عمل صالح انجام دوں (رب ارجعون لعلی اعمل صالحاً فیما ترکت) (مؤمنون/۹۹-۱۰۰) سیعلمون کی تعبیر (اس لیے کہ عام طور پر مستقبل قریب کے لیے آتی ہے) اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا مرحلہ نزدیک ہے اور دنیا کی ساری زندگی اس کے مقابلہ میں ایک لمحے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ کہ اوپر کی دو آیتیں، جو بصورت تکرار آئی ہیں، ان سے ایک واقعیت کی (ان کی مستقبل قریب میں قیامت کے بارے میں آگاہی) تاکید مراد ہے یا دو الگ مطالب کا بیان ہے (پہلا اشارہ اس طرف ہے کہ مستقبل قریب میں دنیاوی عذاب کو دیکھیں گے اور دوسرا اشارہ اس طرف ہے کہ اس کے بعد آخرت کے عذاب کو دیکھیں گے) اس سلسلہ میں مفسرین نے دو احتمال پیش کیے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے علم و دانش کی ترقی کے ساتھ ساتھ قیامت کے وجود کے دلائل و شواہد اس قدر زیادہ ہو جائیں گے کہ اس کا انکار کرنے والے بھی اقرار کیے بغیر نہ رہ سکیں گے لیکن اس تفسیر میں مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی آگاہی نوعِ بشر کے آئندہ کے لوگوں کے لیے ہوگی نہ کہ اس گروہ کے لیے جو زمانۂ پیغمبرؐ میں موجود تھا اور قیامت کے معاملہ میں اختلاف رکھتا تھا جبکہ آیت اُسی گروہ کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے۔

چند نکات

مسئلہ ولایت اور نبأ عظیم

جیسا کہ ہم نے کہا ہے، نبأ عظیم کی کئی تفسیریں ہوئی ہیں۔ قیامت، قرآن اور تمام اصولِ عقائدِ دینی جن

---

[1] علمائے ادبِ عربی اور مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "کلّا" حرف ردع ہے اور اس کے معنی گزشتہ مطالب کی نفی یا نہی ہوتا ہے لیکن بعض نے کہا ہے کہ نادر طور پر دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے جن میں سے انہوں نے تین معانی کا نام لیا ہے۔ تاکید اور الا استفتاحیہ اور حرف جواب جو نعم کی منزلت رکھتا ہو۔ ان میں سے بعض نے ہر ایک کو منتخب کیا ہے۔ مجمع البحرین اور دوسری کتب۔

میں مبداء و معاد عام طور پر شامل ہیں لیکن اس سورہ کے مجموعۂ آیات میں جو قرائن موجود ہیں وہ یہی بتاتے ہیں کہ نباءِ عظیم کی تفسیر معاد سے کرنا سب سے بہتر ہے۔

بہت سی اہل بیت سے اور بعض اہل سنت کے طرق سے نقل شدہ روایات میں "نبأ عظیم" (بہت بڑی خبر) کی تفسیر امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی ولایت و امامت سے ہوئی ہے جس سے ایک جماعت کو اختلاف ہے اس کی تفسیر ولایت عمومی سے بھی ہوئی ہے۔ یہ روایات بعض اوقات خود حضرت علیؑ سے اور بعض اوقات دوسرے آئمہ سے منقول ہیں۔ ہم یہاں تین روایتیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اوّل: وہ روایت ہے جسے حافظ محمد بن مومن شیرازی نے نقل کیا ہے جو علمائے اہل سنت میں سے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے "عم یتساءلون عن النبأ العظیم" کی تفسیر کے سلسلے میں فرمایا کہ اس سے مراد علیؑ کی ولایت ہے۔ اس کے بارے میں قبر میں سوال ہوگا اور کوئی شخص مشرق و مغرب میں اور بحر و بر میں نہیں مرتا مگر یہ کہ فرشتے اس سے موت کے بعد امیر المؤمنینؑ کی ولایت کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ تیرا پیغمبر کون ہے؟ اور تیرا امام کون ہے؟[1]

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جنگ صفین کے دوران لشکر شام میں سے ایک شخص جو بدن پر ہتھیار لگائے ہوئے تھا اور اس کے گلے میں قرآن حمائل تھا میدان میں وارد ہوا وہ سورہ عم یتساءلون عن النبأ العظیم کی تلاوت کر رہا تھا۔ حضرت علیؑ خود میدان میں آئے اور اس سے فرمایا: (اتعرف النبأ العظیم الذی هم فیه مختلفون) کیا تو اس نباءِ عظیم کو جانتا ہے جس میں وہ اختلاف رکھتے ہیں؟ وہ کیا ہے؟ اس شخص نے جواب میں کہا کہ میں نہیں جانتا۔ تو آپ نے فرمایا: (انا واللہ النبأ العظیم الذی فیه اختلفتم و علی ولایته تنازعتم و عن ولایتی رجعتم بعد ما قبلتم .... و یوم القیامة تعلمون ما علمتم) "میں ہوں وہ نباءِ عظیم جس کے بارے میں تم اختلاف رکھتے ہو اور اس کی ولایت کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔ تم میری ولایت سے پھر گئے ہو بعد اس کے کہ تم نے اسے قبول کر لیا تھا اور قیامت میں دوبارہ اس چیز کو جسے اس سلسلہ میں جان چکے ہو جانو گے"[2]

۳۔ ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: (النبأ العظیم الولایة) نبأ عظیم سے مراد ولایت ہے[3]

ان روایتوں کے مضامین میں اور آیت کی تفسیر کے بارے میں ہم نے قیامت کا جو ذکر کیا ہے ان دونوں

---

[1] رسالہ "الاعتقاد" ابوبکر محمد بن مومن شیرازی (طبق نقل احقاق الحق جلد ۳ ص ۴۸۴)۔

[2] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۲۰ حدیث ۹۔

[3] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۱۹ حدیث ۳۔

کا اجتماع دو صورتوں میں ممکن ہے۔ ایک تو یہ کہ نبأ عظیم کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ان سب مفاہیم پر حاوی ہے اگرچہ ان آیتوں کے نزول کے وقت قرآن مجید سب سے زیادہ اس جملہ کے بیان کرنے کے سلسلہ میں مسئلہ معاد کی طرف واضح اشارے کر رہا تھا لیکن یہ اس میں مانع نہیں ہے کہ اس آیت کے اور بھی مصداق ہوں۔ دوسرے یہ کہ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور بارہا ہم نے کہا بھی ہے، قرآن کے مختلف باطن ہیں یعنی اس بات کا امکان ہے کہ آیت کے کئی معانی ہوں جن میں سے ایک معنی ظاہر ہوں اور دوسرے بطونِ قرآن سے تعلق رکھتے ہوں، جن سے مختلف قرائن کے ذریعہ استفادہ کیا جا سکتا ہو۔

با الفاظ دیگر یہ ایک قسم کی التزامی دلالت ہے جو ہر فرد پر واضح نہیں ہوتی۔ صرف یہی آیت نہیں جو ظاہر و باطن کی حامل ہے بلکہ قرآن مجید میں ایسی بہت آیتیں ہیں جن کے بارے میں روایات میں مختلف تفاسیر تجویز ہوئی ہیں جن میں سے بعض ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور بعض باطنِ قرآن کی ترجمان ہیں۔

لیکن اس نکتہ پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی یاد دلاتے ہیں اور ذہن نشین کراتے ہیں کہ واضح قرائن کے بغیر یا ایسی تفاسیر کے بغیر جو پیغمبر اکرمؐ یا ائمہ معصومین سے منقول نہ ہوں بطونِ قرآن کا سمجھنا جائز نہیں ہے اور وہ قرآن کے بطون اس لیے نہیں ہیں کہ مفاد پرست اور منحرف قسم کے افراد آیاتِ قرآنی کی جس طرح چاہیں تاویل و تفسیر کریں۔

۲۔ معاد و قیامت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ اہم ترین مسئلہ جس پر قرآن کے تیسویں پارہ کی بیشتر آیات میں، باتفاق مفسرین، زور دیا گیا ہے وہ مسئلہ معاد و قیامت ہے اور مذکورہ سب آیتیں مکی ہیں۔ ان آیتوں میں قیامت کے دن سے متعلق انسان کے حالات کی تشریح و تفصیل ہے۔

یہ اس بنا پر ہے کہ یہ انسان کی اصلاح کے سلسلہ کا پہلا قدم ہے تاکہ اسے معلوم ہو کہ حساب کا سامنا کرنا ہے، ایسی عدالت میں پیش ہونا ہے جس کے حاکم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی صورت ہے جس میں نہ ظلم و جور کی کوئی گنجائش ہے، نہ وہاں خطا و اشتباہ کا کوئی امکان ہے، نہ اس میں سفارش و رشوت کام آسکتی ہے، نہ جھوٹ بولنے سے کام چل سکتا ہے اور نہ انکار کرنے کی گنجائش ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ وہاں عذاب و سزا کے چنگل سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ صرف ایک ہی راستہ ہے کہ یہاں دنیا میں رہتے ہوئے گناہ کو ترک کر دیا جائے۔ تو اس قسم کے محکمے اور عدالت کے وجود پر ایمان رکھنا انسان کے دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور سوئی ہوئی روحوں کو بیدار کرتا ہے۔

تقویٰ کی روح، عہد کی پاسداری، جوابدہی اور ذمہ داری کا احساس انسان میں پیدا کرتا ہے اور اسے فرض شناسی کے عرفان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جس ماحول میں فساد ہو اور وہاں تخریبی عناصر رخنہ اندازی کریں، اصولی طور پر دو اسباب میں سے ایک اس کا سبب ضرور ہوتا ہے۔ ایک تو نگرانی و نگہبانی کی قوت کی کمزوری، دوسرے نظام عدالت کا ضعف۔ اگر تیز نگاہ رکھنے والے نگران انسانوں کے اعمال پر نظر رکھیں اور عدالتیں گہری نظر کے ساتھ جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کی سزا پر عملدرآمد کریں اور کوئی مجرم سزا سے نہ بچے تو اس قسم کے ماحول میں یقیناً فساد، گناہ، تجاوز عن الحدود، ظلم اور سرکشی کا تقریباً خاتمہ ہو جائے گا۔

چنانچہ جہاں مادی زندگی نگہبانوں اور عدالتوں کے اس طرح زیر سایہ ہو وہاں معنوی زندگی جو اللہ کے لیے ہو اس کا معاملہ واضح ہے۔ لہٰذا ایسے مبدا پر ایمان رکھنا جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہو (لا یعزب عنه مثقال ذرّة) "ایک ذرہ کی مقدار کا بوجھ بھی اس کے علم سے مخفی نہیں ہے" (سبا/۳)۔

اور قیامت کے وجود پر ایمان جو (فمن یعمل مثقال ذرة خیرًا یره ومن یعمل مثقال ذرّة شرًّا یره) (زلزال/۷-۸)۔ "اچھے اور برے کام کا ایک ذرہ بھی فراموشی کے سپرد نہیں ہوگا" اور وہاں اس کے سامنے موجود ہوگا، انسان میں ایسا تقویٰ پیدا کرتا ہے جو زندگی بھر راہ خیر میں اس کا راہنما ہو سکتا ہے۔

٦ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ
٧ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۖ
٨ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ
٩ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ
١٠ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ
١١ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۖ
١٢ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ
١٣ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۖ
١٤ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ
١٥ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ
١٦ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۭ

ترجمہ

٦ کیا ہم نے زمین کو (تمہارے) آرام وسکون کی جگہ قرار نہیں دیا
٧ اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں (نہیں بنایا)۔
٨ اور تمہیں زوج زوج کی شکل میں پیدا (نہیں کیا)۔
٩ اور تمہاری نیند کو ہم نے تمہارے سکون کا باعث قرار دیا۔
١٠ اور رات کو (تمہارے لیے) لباس (بنایا)۔

(۱۱) اور دن کو معاش کا ذریعہ (قرار دیا)۔

(۱۲) اور تم پر ہم نے سات مستحکم آسمان بنائے۔

(۱۳) اور روشن اور حرارت بخش چراغ ہم نے پیدا کیا۔

(۱۴) اور برسنے والے بادلوں سے بہت زیادہ پانی ہم نے نازل کیا۔

(۱۵) تاکہ اس کے ذریعہ ہم بہت سی فصلیں اور نباتات اُگائیں۔

(۱۶) اور درختوں سے پُر باغات۔

تفسیر

یہ آیتیں حقیقت میں منکرینِ معاد اور نباءِ عظیم میں اختلاف کرنے والوں کے سوالوں کا جواب ہیں، اس لیے کہ ان آیات میں اس عالمِ ہستی کے حکیمانہ نظام اور حساب شدہ نعمتوں کا ایک ایسا گوشہ بیان ہوا ہے جو انسانوں کی زندگی پر بہت ہی اثر انداز ہے جو ایک طرف تو ہر چیز پر، علی الخصوص مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر قدرتِ خدا کی واضح دلیل ہے، دوسری طرف اس سمت اشارہ ہے کہ یہ حکیمانہ نظام فضول اور عبث نہیں۔

حالانکہ اگر دنیا کی اس مادی زندگی کے ختم ہونے کے ساتھ ہی تمام معاملات ختم ہو جاتے تو یقیناً یہ منصوبہ عبث اور فضول ہوتا۔ اس طرح یہ آیات دو جہتوں سے مسئلہ معاد کے لیے استدلال فراہم کرتی ہیں "برہانِ قدرت" کے ذریعہ بھی اور "برہانِ حکمت" کے طریق سے بھی۔

ان گیارہ آیتوں میں بارہ اہم نعمتوں کی طرف لطف و محبت سے لبریز استدلال اور کرم و مہربانی کی تشویق سے ہم آغوش تعبیروں کے ساتھ اشارہ ہوا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ اگر عقلی دلائل کے ساتھ روحانی مسرت کا سامان نہ ہو تو پھر استدلالِ عقلی کی تاثیر کم ہو جائے گی۔

ابتدا زمین سے کی ہے فرماتا ہے: "کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور تمہارے لیے سکون کی جگہ قرار نہیں دیا ہے؟" (الم نجعل الارض مهادًا)۔

"مهاد"، جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے، صاف ستھری اور مرتب جگہ کے معنی میں ہے اور اصل میں مہد سے لیا گیا ہے۔ یہ اس جگہ کے معنوں میں ہے جو بچے کے آرام کے لیے تیار کی گئی ہو۔ (وہ خواہ بستر ہو یا گہوارہ)۔

اربابِ لغت اور مفسرین کی ایک جماعت نے اس کی تفسیر فرش یعنی بستر سے کی ہے جو صاف و نرم بھی

ہو اور آرام دہ بھی۔ زمین کے لیے اس تعبیر کا انتخاب بہت ہی پُرمعنی ہے، اس لیے کہ ایک تو زمین کے بہت سے حصے اس طرح نرم و صاف اور مرتب ہیں کہ انسان ان پر اچھی طرح سے گھر بنا سکتا ہے، زراعت کر سکتا ہے اور باغ لگا سکتا ہے۔ دوسرے اس کی تمام ضرورتیں سطح زمین پر یا زمین کی گہرائیوں میں مواد اولیہ اور قیمتی معدنیات کی شکل میں موجود ہیں۔ تیسرے یہ کہ انسان کے زائد مواد کو زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ مُردوں کے جسم اس کے اندر دفن کرنے سے بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں اور اس طرح انواع و اقسام کے جراثیم ان پوشیدہ اثرات کے ماتحت ختم ہو جاتے ہیں جو دستِ قدرت نے زمین کو ودیعت کیے ہیں۔

چوتھے یہ کہ زمین سورج کے گرد اور خود اپنے گرد نرم اور تیز قسم کی گردش کرتی ہے جس سے رات اور دن بنتے ہیں اور وہ چار فصلیں حاصل ہوتی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ پانچویں بات یہ کہ یہ پانی کے بہت زیادہ حصہ کو جو اس کی سطح پر برستا ہے، اپنے اندر ذخیرہ کر لیتی ہے اور چشموں اور ندی نالوں کی شکل میں باہر بھیجتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس آرام دہ بستر میں اس زمین کی اولاد کے لیے آسائش کے تمام وسائل موجود ہیں۔ اس نعمت کی اہمیت اس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب معمولی سا زلزلہ اور الٹ پلٹ کر دینے والا تزلزل اس میں پیدا ہوتا ہے۔ اور چونکہ ممکن ہے کہ مسطح زمینوں کی نرمی کے مقابلہ میں پہاڑوں کی اہمیت اور انسانی زندگی میں ان کے اثرات فراموش ہو جائیں، اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

"کیا ہم نے پہاڑوں کو زمین کی میخیں قرار نہیں دیا" (والجبال اوتادًا)۔ پہاڑ اس کے علاوہ کہ بہت عظیم اور بڑی بڑی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں رکھتے ہیں اور وہاں یہ ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور یہ زمین کی کھال کو زرہ کی طرح اندرونی طور پر پگھلنے والے مواد کے دباؤ سے اور چاند سے پیدا ہونے والے مدوجزر کے جاذبہ کی تاثیر سے محفوظ رکھتے ہیں اور شدید اور زبردست طوفانوں کے مقابلہ میں دیوار ثابت ہوتے ہیں اور اس طرح انسان کی آسائش کے گہوارے کی ایک قابلِ اطمینان پناہ گاہ تیار کرتے ہیں۔

حقیقتاً اگر یہ نہ ہوتے تو انسانی زندگی ہمیشہ طوفانوں کی سر پچلنے والی ضربوں کے زیرِ اثر بے سکون ہو کر رہ جاتی۔ مزید یہ کہ یہ پانی اور قیمتی معدنیات کا مرکز ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ کرۂ زمین کے اطراف میں ہوا کا ایک عظیم خطہ موجود ہے جس میں پہاڑ، سائیکل کے دندانے دار چکر کی شکل میں، پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور زمین کے ہمراہ حرکت کرتے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر سطح زمین صاف ہوتی تو ہوا کا طبقہ زمین کی حرکت کے وقت اس کے اوپر ہلتا رہتا اور بڑے بڑے طوفان پیدا کرتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ دائمی ٹکراؤ زمین کو زیادہ گرم، جلن پیدا کرنے والی اور ناقابلِ سکونت بنا دیتا۔

آفاقی نعمتوں کے دو نمونے بیان کرنے کے بعد وجودِ انسان کی اندرونی اور انفسی آیات کو موضوعِ گفتگو

بناتے ہوئے فرماتا ہے : "ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا" (و خلقناکم ازواجاً)[1]

"ازواج" "زوج" کی جمع ہے جو مذکر و مؤنث کی جنس کے معنوں میں ہے۔ انسان کی خلقت ان دو صنفوں سے، علاوہ اِس کے کہ اُس کی نسل کی بقاء کی ضامن ہے، اُس کے جسم و جان کے سکون کا سبب بھی ہے، جیسا کہ سورہ روم کی آیت ۲۱ میں ہم پڑھتے ہیں :

(ومن اٰیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة و رحمة) "(عظمتِ) خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری نوع میں سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا ہے تاکہ ان کے ذریعہ تمہیں سکون نصیب ہو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت قرار دی ہے"

دوسرے لفظوں میں مذکر و مؤنث کی نوع میں سے ہر ایک دوسرے کے وجود کی تکمیل کرتی ہے اور اپنے مقابل کے نقائص کو ختم کرتی ہے۔ اور چونکہ ازواج کا لفظ لغت میں اصناف و انواع کے معانی میں بھی آیا ہے اس لیے کچھ افراد نے اس آیت کو انسانوں کی مختلف اصناف کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور رنگ و نسل و جذبات و استعداد کا جو فرق انسانوں کے درمیان ہے وہ حق تعالیٰ کی عظمت کی دلیل اور انسانی معاشرے کے تکامل و ارتقاء کا سبب ہے۔

اس کے بعد نیند جو انسان کے لیے خدا کی ایک عظیم نعمت ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے : "ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لیے آرام و سکون کا باعث قرار دیا ہے" (و جعلنا نومکم سباتاً)۔

"سبات" "سبت" (بروزن وقت) کے مادہ سے اصل میں کاٹنے کے معنی میں ہے۔ اس کے علاوہ آرام کی خاطر کام چھوڑنے کے معنی میں بھی آیا ہے اور یہ جو عربی زبان میں ہفتہ کا دن "یوم السبت" کے نام سے موسوم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نام یہودیوں سے متاثر ہونے کے نتیجے میں ہوا اس لیے کہ وہ ہفتہ کے دن کو چھٹی کا دن سمجھتے ہیں۔

سبات کی تعبیر ایک لطیف اشارہ ہے اور یہ اشارہ نیند کی حالت میں انسان کی قابلِ توجہ جسمانی اور روحانی فعالیتوں کے کئی حصّوں کے معطل ہونے کی طرف ہے اور یہی وقتی تعطیلی تھکے ماندے اعضاء و جوارح کے آرام، روح و جسم کی تقویت، نشاطِ انسانی کی تجدید اور ہر قسم کی تھکن اور بے آرامی کے دور ہونے کا سبب ہے اور بالآخر تجدیدِ فعالیت کے لیے آمادگی کا باعث ہے۔

باوجودیکہ انسانی زندگی کے ایک تہائی حصے کو نیند گھیرے ہوئے ہے اور یہ صورتِ حال ہمیشہ انسان کو

---

[1] (و خلقناکم ازواجاً) کا جملہ اور اس طرح اس سے مشابہ جملے جو بعد والی آیتوں میں آئے ہیں مستقل اور مثبت جملوں کی شکل میں ہیں اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال تجویز کیا ہے کہ منفی شکل میں ہیں اور "الم نجعل" جو گزشتہ آیت میں تھا اس کے مفہوم پر عطف ہیں، بعید نظر آتا ہے اور وہ تقدیر و حذف کا محتاج ہے۔

پیش آتی ہے لیکن نیند کے اسرار ابھی تک اچھی طرح نہیں کھلے حتیٰ کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ وہ کونسا عامل ہے جو اس چیز کا سبب بنتا ہے کہ ایک معین وقت میں دفاع کی فعالیتوں کا ایک حصّہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اس کے بعد آنکھوں کی پلکیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور تمام اعضائے بدن سکون سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

یہ حقیقت ابھی تک صحیح طریقہ سے واضح نہیں ہوئی۔لیکن یہ چیز بالکل واضح ہے کہ نیند انسان کی صحت و سلامتی کے لیے نہایت ضروری ہے۔اسی بناء پر نفسیات و روح کے معالج اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے بیماروں کی نیند کو عام اور عادی شکل میں لے آئیں،اس لیے کہ اس کے بغیر نفسیاتی اعتدال ممکن ہی نہیں ہے۔

وہ افراد جو طبعی اور فطری شکل میں نہیں سو سکتے وہ پژمردہ،غصیل، افسردہ و غمگین اور پریشان قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جو افراد معتدل نیند کا لطف اٹھاتے ہیں جب وہ بیدار ہوتے ہیں تو حد سے زیادہ خوشی اور قوت اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ایک آرام بخش نیند کے بعد جو مطالعہ کیا جائے وہ بہت جلد اثر کرتا ہے اور فکری و جسمانی کام اس قسم کی نیند کے بعد ہمیشہ بہت ہی خوشگوار محسوس ہوتے ہیں اور یہ سب چیزیں نیند کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔

کسی انسان کے لیے بے چین کر دینے والی بے خوابی سے بڑھ کر کوئی شے تکلیف دہ نہیں۔یہ اسے مجبور محض بنا کر رکھ دیتی ہے،اور تجربہ بتاتا ہے کہ بے خوابی کے مقابلہ میں انسان کی قوت برداشت بہت ہی کم ہوتی ہے۔ایسا انسان بہت کم عرصہ میں شدید امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

اب تک نیند کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے مراد وہ نیند ہے جو اعتدال کی حالت میں ہو ورنہ زیادہ سونا اتنا ہی بُرا ہے جتنا زیادہ خوراک کھانا۔یہ دونوں چیزیں مختلف امراض کی پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ فطری اور طبعی نیند کی مقدار تمام انسانوں میں یکساں نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی معین حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔لہٰذا یہ ہر شخص کا اپنا فرض ہے کہ وہ اپنی جسمانی اور روحانی فعالیتوں کو جانچ تول کر یہ فیصلہ کرے کہ اس کے لیے کتنی نیند مفید ہے۔

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ سخت قسم کے حادثات رونما ہونے کے وقت جس وقت انسان لاچار محض ہوتا ہے،وہ بہت دیر تک بیدار رہتا ہے۔بے خوابی کے مقابلہ میں انسان کی قوت برداشت وقتی طور پر بہت بڑھ جاتی ہے۔نیند کا احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو بہت حد تک نیند کم ہو جاتی ہے۔ایک یا دو گھنٹے کی نیند رہ جاتی ہے۔لیکن بہت دفعہ دیکھا گیا ہے کہ اس کمی کا حالات کے معمول پر پہنچنے کے بعد فقدان ہو جاتا ہے اور انسان کے جسم و روح نیند کی مطلوبہ مقدار کو چاہنے لگتے ہیں۔

البتہ ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جو کئی مہینے مسلسل جاگتے رہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی نیند ان کی آنکھوں میں نہ آئے۔ اس کے برعکس کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو کوچہ و بازار میں چلتے پھرتے، بلکہ اس وقت جس وقت وہ آپ سے باتیں کر رہے ہوں، انہیں نیند آجاتی ہے۔ وہ اگر تنہا ہوں تو معاملہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس قسم کے افراد یقیناً صحت مند نہیں ہوتے اور وہ بالآخر جسمانی و روحانی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وہ چیز جسے نیند کہتے ہیں ایک بہت ہی عجیب قسم کی تبدیلی ہوتی ہے جو انسان میں نمودار ہوتی ہے اور یہ بہت زیادہ عجائبات کی حامل ہوتی ہے اور انسان کی زندگی میں ایک قسم کے معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے [1]

اگرچہ مندرجہ بالا آیت نیند کو خدا کی عطا کی ہوئی ایک نعمت قرار دیتی ہے لیکن چونکہ نیند موت سے مشابہت رکھتی ہے اور بیداری قیامت اور مُردوں کے قبروں سے اُٹھنے سے مشابہ ہے، لہٰذا اس طرف بھی اشارہ ممکن نظر آتا ہے۔ اس کے بعد نیند ہی کے حوالے سے رات کی بات نکل آئی ہے جو بجائے خود اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"ہم نے رات کو لباس قرار دیا ہے" (وجعلنا اللیل لباسًا)۔ پھر بلافاصلہ مزید فرماتا ہے: "اور دن کو زندگی کے لیے ہم نے وسیلہ قرار دیا ہے" (وجعلنا النھار معاشًا) [2]

ثنویین (دو خداؤں کے ماننے والے) اسرارِ خلقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ نور اور دن کی روشنی نعمت ہے اور رات اور اس کی تاریکی شر ہے اور عذاب ہے۔ وہ ہر ایک کے لیے الگ الگ خدا کے قائل ہیں۔ ایک کو یزداں کہتے ہیں اور دوسرے کو اہرمن کے نام سے پکارتے ہیں۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ دن، رات دونوں اپنی جگہ نعمتِ پروردگار ہیں اور بہت سی دوسری نعمتوں کے لیے سرچشمے کا کام دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت کے مطابق پردۂ شب زمین کی پوشش اور لباس کا کام دیتا ہے اور تمام زندہ موجودات جو

---

[1] نیند کے عجائبات کے سلسلہ میں ہم ایک دوسری بحث جلد ۱۶ صفحہ ۴۰۴ سے آگے سورہ روم کی آیت ۲۴ کے ذیل میں درج کر چکے ہیں۔ اسی طرح ان مناظر کے سلسلہ میں جو انسان خواب میں دیکھتا ہے اور اس کی عجیب و غریب چیزوں کے متعلق تفصیلی بحث جلد ۹ صفحہ ۳۱۱ تا ۳۱۷ (سورہ یوسف کی آیت ۴ کے ذیل میں) ہم بیان کر چکے ہیں۔

[2] "معاش" ہو سکتا ہے کہ اسم زمان یا اسم مکان زندگی کے زمانہ یا مکان کے معنی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر ہو اور اس صورت میں اس میں محذوف ہو اور تقدیر عبارت میں "سببًا لمعاشکم" ہو اور ضمنی طور پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاش "عیش" مادہ سے زندگی کے معنی میں ہو۔ اس کا فرق حیات سے یہ ہے کہ حیات کا اطلاق خدا اور فرشتوں پر بھی ہوتا ہے لیکن "عیش" کا لفظ انسان اور حیوان کی زندگی سے مخصوص ہے۔

زمین پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ زندگی کی تھکا دینے والی مصروفیتوں کو مجبوراً معطل کر دیتے ہیں اور انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور تاریکی جو سکون و آرام اور استراحت کا سبب ہے، ہر چیز پر تسلط اختیار کر لیتی ہے تاکہ تھکے ماندے جسم تر و تازہ ہو جائیں اور خستہ و کوبیدہ انسان دوبارہ نشاطِ روح کو حاصل کر لے، اس لیے کہ سکون و آرام کی نیند تاریکی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قطع نظر ان سب باتوں سے پردۂ شب کے حائل ہو جانے سے سورج کی روشنی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اگر مسلسل پڑتی رہے تو تمام نباتات و جمادات کو جلا کر رکھ دے اور کام کے قابل نہ رہے۔ اس بنا پر قرآن مجید نے بارہا اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے۔ پروردگارِ عالم ایک مقام پر فرماتا ہے:

(قل ارء یتم ان جعل اللہ علیکم النہار سرمدًا الی یوم القیامۃ من الہ غیر اللہ یأتیکم بلیل تسکنون فیہ) "کہہ دے مجھے بتاؤ کہ اگر خدا دن کو قیامت تک جاری رکھے تو خدا کے علاوہ کون ہے جو رات کو تمہارے لیے لے آئے گا تاکہ تم اس میں سکون و اطمینان حاصل کرو" (قصص/۷۲)۔

اس کے بعد فرماتا ہے: (ومن رحمتہ جعل لکم اللیل والنہار لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ) یہ اس کی رحمت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن قرار دیئے تاکہ اس میں تم سکون و اطمینان حاصل کرو اور اس میں فضلِ خدا سے فائدہ اٹھانے کے لیے سعی و کوشش کرو" (قصص/۷۳)۔

قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے اہم موضوعات کی ایک دفعہ قسم کھائی گئی ہے جبکہ رات کی سات مرتبہ قسم کھائی گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قسم اہم امور کی کھائی جاتی ہے اور یہ بجائے خود پردۂ ظلمتِ شب کی اہمیت کی دلیل ہے۔ وہ لوگ جو رات کو مصنوعی روشنی سے منور کرتے ہیں اور ساری رات جاگتے رہتے ہیں اور اس کی بجائے دن کو سوتے ہیں، وہ رنجیدہ، غیر صحت مند اور محروم مسرت رہتے ہیں۔

دیہات جہاں شہر کے برعکس رات کو جلدی سو جاتے ہیں اور صبح کو جلدی اٹھتے ہیں، وہاں زندگی زیادہ صحت و سلامتی کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ رات کے کچھ اپنے اور ضمنی منافع بھی ہیں۔ اس کے آخری لمحات بارگاہِ خدا میں رازو نیاز، عبادت، تعمیرِ ذات اور تربیتِ نفوس کے لیے بہترین ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآنِ مجید پرہیزگاروں کی تعریف میں کہتا ہے: (و بالاسحار ھم یستغفرون) "وہ اوقاتِ سحر میں استغفار کرتے ہیں" (ذاریات/۱۸)۔[1]

دن کی روشنی بھی بجائے خود ایک نعمت ہے۔ یہ انسان میں جوش و حرکت پیدا کرتی ہے اور اسے کام اور تلاشِ معاش کی تحریک دیتی ہے اور نباتات کو اپنی روشنی کے سائے میں اگاتی ہے اور حیوانات کو اپنے

---

[1] رات اور دن کے اسرار اور نور و ظلمت کے نظام کے بارے میں جلد ۱۶ صفحہ ۱۴۶ کے بعد سے (سورہ قصص کی آیت ۱، تا ۳، کے ذیل میں) اور جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۲ تا ۱۱۴ (سورہ فرقان کی آیت ۴۷ کے ذیل میں) اور جلد ۲۲ صفحہ ۳۲۶ (سورہ ذاریات کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) ہم نے اور بحثیں بھی کی ہیں۔

زیر سایہ منزلِ رشد تک پہنچاتی ہے، انہیں نشو و نما بخشتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تعبیر جس میں فرماتا ہے:

"ہم نے دن کو تمہاری معاش اور زندگی کا وسیلہ و ذریعہ قرار دیا ہے" ہر لحاظ سے عمدہ اور پُر معنی تعبیر ہے جو کسی شرح و توصیف کی محتاج نہیں ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ دن اور رات کی آمد و رفت اور ان کے نظام دقیق کے تدریجی تغیرات عملِ تخلیق کی ایک آیت اور خدا کی ایک نشانی ہیں۔ اس کے علاوہ انسانوں کی زندگی کی زمانی نظام بندی کے لیے ایک طبعی اور فطری تقویم کے پیدا ہونے کا سرچشمہ شمار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد زمین سے آسمان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے تمہارے سر کے اوپر سات مستحکم آسمان بنائے ہیں" (و بنینا فوقکم سبعًا شدادًا) یہاں سات کا عدد ہو سکتا ہے کہ عدد تکثیر ہو اور آسمان کے متعدد کُرّوں، کہکشاؤں اور نظام ہائے شمسی کے مجموعہ کی طرف اشارہ ہو جو مستحکم خلقت اور عظیم و قوی تعمیر کے حامل ہیں۔ یا یہ عدد "تعداد" ہو، اس طرح کہ جتنے ستارے ہم دیکھتے ہیں ــــ سورہ صافات کی آیت ۶ کے حکم کے مطابق (انا زینّا السماء الدنیا بزینة الکواکب) "ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں سے زینت بخشی"، پہلے آسمان سے متعلق ہوں اور ان کے علاوہ چھ دوسرے عوالم اور آسمان وجود رکھتے ہوں جو علمِ بشر کی دسترس سے خارج ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد زمین کے اطراف میں ہوا کے متعدد طبقات ہوں جو ظاہری طور پر رقیق ہونے کے باوجود اس طرح مستحکم ہیں کہ اس کرہ خاکی کو آسمانی پتھروں کے مسلسل حملوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور جس وقت بھی ان میں سے کوئی کُرہ زمین میں جذب ہوتا ہے خطۂ ہوا سے شدید تصادم کی بنا پر اس طرح گرم ہو جاتا ہے کہ اس میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے اور اس کی خاکستر نرم و ملائم ہو کر زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ اگر یہ خطۂ ہوا نہ ہوتا تو ہمارے شہر اور آبادیاں شب و روز ان پتھروں کے گرنے کی زد پر ہوتیں۔

بعض ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ اطرافِ زمین میں پائے جانے والے خطۂ ہوا کی استقامت جو ایک سو کلومیٹر کی ضخامت سے زیادہ ہے، ایک پولاڈین کی چھت کی دس میٹر کی ضخامت کے برابر ہے اور "سبع شداد" کی یہ ایک تفسیر ہے[1]

آسمانوں کی خلقت کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرنے کے بعد آفتابِ عالمتاب جیسی عظیم نعمت کی طرف رُخ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے نورانی اور حرارت بخش چراغ پیدا کیا ہے" (و جعلنا سراجًا وھّاجًا)[2]

"وھّاج" "وھج" (بروزن کرج) کے مادہ سے اس نور و حرارت کے معنی میں ہے جو آگ

---

[1] سات آسمانوں اور ان کی تفسیر کے سلسلہ میں (سورہ بقر کی آیت ۲۹ کے ذیل میں) ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

[2] "جعلنا" یہاں خلقنا کے معنی میں ہے اس نے ایک مفعول لیا ہے۔

سے برآمد ہوتے ہیں [1]

اس بنا پر اس پُرفروغ چراغِ آسمانی کی اس صفت کا ذکر دو عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس جہان کی عام مادی نعمتوں کا سرچشمہ ہیں یعنی "نور و حرارت"۔ سورج کی روشنی نہ صرف یہ کہ انسان کی زندگی کے تمام نظامِ شمسی کے صحن کو روشن کرتی ہے بلکہ زندہ موجودات کی پرورش میں بڑا گہرا دخل رکھتی ہے۔ سورج کی حرارت علاوہ اس کے کہ انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی میں براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے، بادلوں کے بننے، ہواؤں کے چلنے، بارشوں کے برسنے اور خشک زمینوں کی آبیاری کا اصلی منبع و سرچشمہ ہے۔

سورج مخصوص شعاعوں کی وجہ سے (آبی اور سرخ شعاؤں کے علاوہ) جراثیم کشی میں بہت زیادہ کارآمد ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کرۂ ارض ایک بڑے ہسپتال میں تبدیل ہو جاتا اور یہ ممکن تھا کہ مختصر سی مدت میں تمام زندہ موجودات کی نسل مردہ ہو جاتی۔ سورج صحیح و سالم مفت اور دائمی مناسب فاصلے سے نہ زیادہ گرم اور جلانے والی، نہ سرد اور بے روح روشنی ہم سب کو عطا کرتا ہے۔

اگر سورج سے نکلنے والی قوت کی قیمت کا قوت کے دوسرے منابع کی قیمت کے ساتھ ہم حساب لگائیں تو وہ بہت بڑے عدد کو تشکیل دے۔ اگر فرض کریں کہ ہم ایک سیب کے درخت کی مصنوعی روشنی اور قوت کو پرورش کریں تو سیب کے ہر دانہ کی قیمت ہم کو پریشان کر کے رکھ دے۔ جی ہاں! یہ عالم ہستی کا "سراج وھاج" تمام قوت ہم سب کو مفت عطا کرتا ہے [2]

ماہرین کے اندازے کے مطابق سورج کا دائرہ کرۂ زمین سے تقریباً ایک ملین اور تین لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کا فاصلہ تقریباً ایک سو پچاس ملین کلو میٹر ہے اور سطحِ خورشید کی بیرونی حرارت قریب قریب بیس ملین درجہ ہے۔ یہ سب کچھ اس قدر جچا تلا حساب شدہ ہے کہ اگر تھوڑا سا کم یا زیادہ ہو جاتا تو اہلِ زمین کے لیے عرصہ حیات

---

[1] مفرداتِ راغب، مادہ "وھج"۔ "لسان العرب" اس لفظ کے معنی میں کہتی ہے "دور کے فاصلہ سے سورج اور آگ کی حرارت"۔

[2] کتاب "دنیائے سیارگان" تالیف "انتری دایت" میں اس نور و حرارت کا حساب لگایا گیا ہے جو سورج اہلِ زمین کو دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر فرض کریں اس نور و حرارت کے لیے جو ہم سورج سے مفت لیتے ہیں بجلی کی عام قیمت کے مطابق پیسہ خرچ کریں تو روئے زمین کے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ ہر گھنٹے ایک ارب اور سات سو ملین ڈالر ادا کریں۔ اور ایک سال میں یہ رقم لرزہ بر اندام کر کے رکھ دے گی۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ کتنی عظیم دولت اس وسیلہ سے ہمیں مفت مل رہی ہے۔ "از جہانہائے دور" کے مصنف کے بقول اگر زمین کے لوگ اس روشنی کو جو سورج سے لیتے ہیں بلبوں سے حاصل کریں جو اُسی جگہ نصیب ہوں جہاں سورج ہے تو ہر ایک شخص کے بدلے سو شمع والے پانچ ملین ارب بلب روشن ہونے چاہئیں۔

تنگ ہو جاتا اور زندگی کا امکان ختم ہو جاتا۔ اس کی تفصیل مختصراً بیان میں نہیں آسکتی۔ نور و حرارت کی نعمت کے بعد ایک اور حیاتی مادہ جو سورج کے چمکنے سے تعلق رکھتا ہے، اس کی بات درمیان میں لاتا ہے اور مزید فرماتا ہے:

"اور ہم نے بارش برسانے والے بادلوں سے بہت سا پانی نازل فرمایا" (وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجًا)۔

"معصرات"، "معصر" کی جمع ہے یہ عصر کے مادہ سے ہے اس کے معنی دبانے اور نچوڑنے کے ہیں، جن سے بارش برسانے والے بادلوں کی طرف اشارہ ہے، گویا وہ اپنے آپ کو دباتے اور نچوڑتے ہیں تاکہ پانی ان کے اندر سے باہر نکلے[1]

توجہ فرمائیں کہ (معصرات اسم فاعل ہے یعنی نچوڑنے اور دبانے والے) بعض مفسرین نے اس کی تفسیر برسنے کے لیے آمادہ بادلوں سے کی ہے، اس لیے کہ اسم فاعل کبھی کبھی کسی چیز کے لیے آمادگی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ کچھ نے یہ بھی کہا ہے کہ معصرات بادلوں کی صفت نہیں ہے بلکہ یہ ہواؤں کی صفت ہے جو بادلوں پر ہر طرف سے دباؤ ڈالتی ہیں اور بارش برسانے کے لیے انہیں دباتی ہیں۔

اور "ثجاج"، "ثج" (بروزن حج) کے مادہ سے پانی کے مسلسل اور فراوانی کے ساتھ نیچے گرنے کے معنی میں ہے اور یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ "ثجاج" مبالغہ کا صیغہ ہے یہ کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ اب مجموعی اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے بارش برسانے والے بادلوں سے بہت زیادہ اور مسلسل طور پر پانی نازل کیا۔

اوّل تو بارش کا ہونا بجائے خود خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ہوا کو لطیف کرتا ہے، آلودگیوں کو دھو ڈالتا ہے، کثافتوں کو ختم کر دیتا ہے، ہوا کی گرمی میں کمی پیدا کرتا ہے، یہاں تک کہ سردی کو معتدل بنا دیتا ہے۔ اس سے بیماری کے عوامل میں کمی ہو جاتی ہے اور انسان کو روحِ نشاط حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اس سے اگلی آیت میں، اس کے تین اہم فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"بارش کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ ہم غذائی فصلوں اور سبزہ کو اس کے ذریعہ زمین سے باہر نکالیں" (لنخرج به حبًّا و نباتًا)۔ "اور درختوں سے پُر باغات" (و جنات الفافًا)۔

"الفاف"، راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ اس سے باغوں کے ان درختوں کی طرف اشارہ ہے

---

[1] بعض ماہرین کے بقول بادلوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی وجہ سے ان پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دباتے اور نچوڑتے ہیں جس کے نتیجے میں بارش ہوتی ہے۔ یہ تعبیر حقیقت میں قرآن مجید کے علمی معجزات میں شمار ہوتی ہے۔
(کتاب بادو باراں ص ۱۲۶ سے رجوع کیا جائے)۔

جو بہت زیادہ ہوں اور ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہوں [1]

درحقیقت ان دو آیتوں میں اس تمام موادِ غذا کی طرف اشارہ ہے جس سے انسان اور حیوان فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ مواد زمین سے اُگتا ہے۔ اس موادِ غذائی کے اہم حصّہ کو غذائی دانے تشکیل دیتے ہیں (حبًّا)

دوسرا حصّہ سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کا ہے۔ (و نباتًا) ایک اور حصہ میووں اور پھلوں کا ہے" (و جنات)

یہ ٹھیک ہے کہ ان دو آیتوں میں بارش کے نزول کے صرف یہی تین عظیم منابع بیان ہوئے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ بارش کے فوائد یہی نہیں ہیں۔ بدنِ انسانی کے سو میں سے ستر حصوں کو اصولی طور پر پانی ہی تشکیل دیتا ہے اور تمام زندہ موجودات کی پیدائش کا سرچشمہ قرآن کے مطابق صریحی طور پر پانی ہے۔ (و جعلنا من الماء کل شیء حی) (انبیاء/۳۰)۔

اس بناء پر پانی کا زندہ موجودات، بالخصوص انسانوں پر، اصلی و بنیادی اثر ہے، نہ صرف انسانی بدن بلکہ زیادہ تر کارخانے بھی پانی کے بغیر مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں اور صنعتی کارخانوں کا نظام بھی معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسانی چہرہ کی زیبائی اور خوبصورتی اور اس کی مسرت پانی ہی سے تعلق رکھتی ہے اور دنیا کے بہترین تجارتی اور اقتصادی طریقوں کو پانی کے راستے ہی تشکیل دیتے ہیں۔

ایک نکتہ

ان آیات کا مسئلہ معاد سے تعلق

مندرجہ بالا گیارہ آیتوں میں اہم ترین نعماتِ الٰہی اور انسانی زندگی کے بنیادی ارکان یعنی نور و ظلمت، حرارت، پانی، مٹی اور گیاہ و نبات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اس دقیق نظام کا بیان، ایک تو ہر چیز پر خدا کی قدرت کو واضح کرتا ہے جس کے بعد اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ کوئی یہ کہے کہ خدا مُردوں کو دوبارہ کس طرح زندہ کرے گا، جیسا کہ منکرینِ معاد کے جواب میں سورہ یٰسین کی آخری آیتوں میں کمال وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے جہاں پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس امر پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا

---

[1] "الفاف" بہت سے اربابِ لغت و تفسیر کے بقول "لفیف" کی جمع ہے جو ایک دوسرے سے الجھے ہوئے کے معنوں میں ہے۔ بعض نے اسے "لُف" (لام کے پیش کے ساتھ) کی جمع سمجھا ہے اور بعض نے "لِف" (لام کے زیر کے ساتھ) کی جمع خیال کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان جملوں میں سے ہے جن کا مفرد نہیں ہے، مشہور وہی اوّل ہے۔

کرے۔ (یٰسین / ۸۱)۔

دوسرے ان عظیم تشکیلات کا یقیناً کوئی مقصد ہے اور یہ مقصد دنیا کی چند روزہ زندگی نہیں ہو سکتا جس میں صرف کھانے پینے، سونے اور جاگنے پر اکتفا ہو۔ بلکہ حکمتِ خداوندی کا یہ تقاضا ہے کہ اس کا کوئی بلند مقصد ہے۔

بالفاظ دیگر نشاۃ اولیٰ نشاۃ اُخریٰ کے لیے یاد دہانی ہے اور یہ بشر کی طولانی سیرگاہ کے لیے منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ سورہ مومنون کی آیت ۱۱۵ میں فرماتا ہے:

(افحسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون) "کیا تم نے گمان کیا ہے کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے"

تیسرے نیند اور بیداری کا مسئلہ جو خود موت اور نئی زندگی کا ایک نمونہ ہے اور مردہ زمینوں کا بارش کے نزول کے نتیجے میں زندہ ہونا جو منظرِ معاد کو ہر سال انسانوں کی آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے، قیامت اور موت کے بعد کی زندگی کی طرف پُرمعنی اشارہ ہے جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت ۹ میں بارش کی وجہ سے مُردہ زمینوں کی تجدیدِ حیات کے بیان کے بعد فرماتا ہے:

(کذالک النشور) قیامت میں قبروں سے اٹھنا بھی اسی طرح ہے۔

۱۷ اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا ۙ
۱۸ یَّوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ۙ
۱۹ وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَکَانَتۡ اَبۡوَابًا ۙ
۲۰ وَّ سُیِّرَتِ الۡجِبَالُ فَکَانَتۡ سَرَابًا ؕ

ترجمہ

۱۷ جدائی کا دن سب کی میعاد ہے۔
۱۸ وہ دن جس میں صور پھونکا جائے گا اور تم فوج فوج ہو کر میدانِ محشر میں وارد ہو گے۔
۱۹ اور آسمان کھول دیا جائے گا اور وہ متعدد دروازوں کی صورت میں ہو جائے گا۔
۲۰ اور پہاڑ چلنے لگیں گے اور سراب کی شکل میں ہو جائیں گے۔

تفسیر

آخر کار روزِ موعود آکر رہے گا

گزشتہ آیتوں میں معاد کے مختلف دلائل آئے تھے۔ پہلی زیرِ بحث آیت میں ایک نتیجہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جدائی کا دن سب کے وعدہ کا دن ہے" (ان یوم الفصل کان میقاتًا)[1]

"یوم الفصل" کی تعبیر بہت ہی پُرمعنی ہے جو اس عظیم دن میں ہونے والی جدائیوں کو بیان کرتی ہے

---

[1] عام طور پر "کان" جو فعلِ ماضی ہے اس کی تعبیر اس دن کے بارے میں جو آئندہ تحقق پذیر ہوگا اس دن کے قطعی اور یقینی ہونے کے بیان کے لیے ہے۔

حق کی باطل سے علیحدگی، نیک مؤمنین کی بدکار مجرموں سے علیحدگی، ماں باپ کی اولاد سے جدائی اور بھائی کی بھائی سے جدائی۔

"میقات" وقت کے مادہ سے "میعاد" اور "وعدہ" کی طرح متعین و مقرر وقت کے معنی میں ہے۔ اور یہ جو ان معین مقامات کو "میقات" کہا جاتا ہے جہاں سے خانۂ کعبہ کے زائرین احرام باندھتے ہیں اس وجہ سے ہے کہ وہ معین وقت میں وہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس عظیم دن کی بعض خصوصیات اور حوادث کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے:

"وہی دن جس میں صور پھونکا جائے گا اور تم فوج در فوج میدانِ محشر میں وارد ہو گے" (یوم ینفخ فی الصور فتأتون افواجًا)۔ آیاتِ قرآنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ نفخِ صور کے عنوان سے دو عظیم حادثے برپا ہوں گے، جن میں سے پہلے حادثہ سے عالم ہستی کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا اور دوسرے حادثہ کے نتیجہ میں عالم دوبارہ وجود میں آجائے گا اور مُردے نئی زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے اور بڑی قیامت برپا ہو گی۔

"نفخ" کے معنی ہیں پھونکنا اور "صور" کے معنی ہیں بگل، نفیری اور سائرن، جو عام طور پر لشکر کو لڑانے یا روانہ کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے اور اہلِ قافلہ اور لشکر والے اس کی صدا سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کو توقف کرنا چاہیئے یا روانہ ہو جانا چاہیئے۔ یہ تعبیر ان دو حادثوں کا ایک لطیف کنایہ ہے، جو مندرجہ بالا آیت میں بیان ہوئے ہیں، اور دوسرے "نفخ" صور کی طرف اشارہ ہے جو حیاتِ تازہ کا سبب ہے اور صورِ قیامت ہے۔ (نفخ صور اور اس سے متعلق نکات کے بارے میں ہم تفصیل کے ساتھ جلد ۱۹ سورہ زمر کی آیت ۶۸ کے ذیل میں صفحہ ۵۳۴ تا ۵۴۲ پر بحث کر چکے ہیں)۔

زیرِ بحث آیت کہتی ہے "تم فوج در فوج میدانِ محشر میں وارد ہو گے"۔ جبکہ سورہ مریم کی آیت ۹۵ کہتی ہے: "ہر شخص اس دن تنہا ہو گا" (وکلهم اٰتیه یوم القیامة فردًا) اور سورۂ اسراء کی آیت ۷۱ کہتی ہے: "عرصہ محشر میں ہر گروہ اپنے امام کے ہمراہ وارد ہو گا" (یوم ندعوا کل اناس بامامهم)

ان آیات کے مفہوم اس طرح جمع ہو سکتے ہیں کہ لوگوں کا فوج فوج ہونا اس سے تضاد نہیں رکھتا کہ ہر فوج اپنے امام کے ساتھ محشر میں وارد ہو گی۔ باقی رہا اکیلا ہونا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کے کئی مواقف ہیں، ہو سکتا ہے کہ پہلے موقف میں لوگ گروہ در گروہ ہدایت و ضلالت کے رہبروں کے ساتھ محشر میں وارد ہوں لیکن خدا کے محکمۂ عدالت میں آجانے کے بعد فرد فرد ہوں۔

سورہ ق کی آیت ۲۱ میں قرآن کی تعبیر کے مطابق ہر شخص ایک مامور اور ایک گواہ کے ساتھ وہاں حاضر ہو گا۔ (وجاءت کل نفس معها سائق وشهید) یہ احتمال بھی ہے کہ اکیلے ہونے سے مراد دوستوں ساتھیوں اور یار و انصار سے جدا ہونا ہے، اس لیے وہاں انسان خود ہو گا یا اس کا عمل۔ اس کے بعد

مزید کہتا ہے :

"آسمان کھول دیا جائے گا اور وہ متعدد دروازوں کی شکل میں ہو جائے گا" (و فتحت السماء فکانت ابوابا) ۔ ان دروازوں سے کیا مراد ہے اور ان کے کھلنے کا کیا مفہوم ہے ۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ عالم غیب کے دروازے عالم شہود میں کھل جائیں گے ، پردے ہٹ جائیں گے اور فرشتوں کا جہان دنیائے انسانیت میں اپنا راستہ نکال لے گا[1]

یہاں ایک جماعت نے اس آیت کو ایک ایسی چیز کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو دوسری آیت میں آئی ہے جس کے بارے میں فرماتا ہے : "جب آسمان پھٹ جائے گا" (اذا السماء انشقت) (انشقاق/۱) دوسری جگہ ان معنی کو ایک دوسری تعبیر کے ساتھ بیان کرتا ہے ۔ (اذا السماء انفطرت) (انفطار/۱) درحقیقت آسمانی کرّوں میں اتنے شگاف پڑ جائیں گے ، گویا وہ سب دروازوں کی طرح ہوں گے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ انسان دنیا میں موجودہ حالات میں آسمانوں کی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتا ۔ اگر اس کے لیے ممکن ہو بھی تو وہ بہت محدود حد تک ہے ۔ گویا موجودہ حالات نے اس پر آسمان کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں ۔ لیکن قیامت میں انسان کرۂ خاکی سے آزاد ہو جائے گا ، اور آسمانوں کی طرف سفر کرنے کے دروازے اس کے سامنے کھل جائیں گے اور اس چیز کے اسباب و حالات فراہم ہو جائیں گے ۔

دوسرے لفظوں میں پہلے تو آسمان ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے اور اس کے بعد سورہ ابراہیم کی آیت ۴۸ کے مطابق نئے آسمان اور نئی زمین ان کی جگہ لے لے گی (یوم تبدل الارض غیر الارض والسماوات) اور اس صورت میں اہل زمین کے لیے آسمانوں کے دروازے کھل جائیں گے اور آسمانوں کے راستے زمین والوں پر ظاہر ہو جائیں گے ۔

جنت والے جنت کی طرف چلے جائیں گے اور بہشت کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوں گے ۔ (حتّٰی اذا جاء وھا و فتحت ابوابھا و قال لھم خزنتھا سلام علیکم) "یہاں تک کہ جنت والے جنت کی طرف آئیں گے اور اس کے دروازے کھلے پائیں گے اور جنت کے خازن ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام ہو" (زمر/۷۳) ۔ اور یہی وہ مقام ہے کہ فرشتے دروازے سے ان کے پاس آئیں گے اور ان کی خدمت میں تبریک پیش کریں گے (و الملائکۃ یدخلون علیھم من کل باب) (رعد/۲۳) ۔

"اور کافروں کے سامنے دوزخ کے دروازے کھل جائیں گے" (و سیق الذین کفروا الی جھنم زمرًا حتّٰی اذا جاء وھا فتحت ابوابھا) (زمر/۷۱) ۔ اور اس طرح انسان ایک ایسے میدان میں قدم رکھے گا جس کی وسعت موجودہ زمین و آسمان جتنی ہو گی ۔ (و جنۃ عرضھا السماوات والارض) ۔ (آل عمران/۱۳۳)

---

[1] المیزان ، جلد ۲۰ صفحہ ۲۶۵ ۔

آخری زیر بحث آیت میں قیامت میں پہاڑوں کی کیفیت کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "پہاڑوں کو چلایا جائے گا اور وہ آخرکار سراب ہو جائیں گے" (وسیرت الجبال فکانت سرابًا)۔

قرآن کی مختلف آیتوں کے اجتماع سے قیامت میں پہاڑوں کی سرنوشت کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ پہاڑ کئی مرحلے طے کریں گے۔ "پہلے تو پہاڑ حرکت میں آجائیں گے" (چلنے لگیں گے)۔ (وتسیر الجبال سیرًا) (طور/۱۰)۔ "پھر وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے" (وحملت الارض والجبال فدکتا دکة واحدة) (حاقہ/۱۴)۔ "اور اس کے بعد ایک دوسرے پر پڑے ہوئے ریت کے تودوں کی طرح ہو جائیں گے" (وکانت الجبال کثیبًا مهیلًا) (مزمل/۱۴)۔ "اس کے بعد دھنکی ہوئی اُون کی شکل کے ہو جائیں گے جو تیز ہوا کے ساتھ اُڑ رہی ہو" (وتکون الجبال کالعهن المنفوش) (قارعہ/۵)۔ "پھر اس گرد و غبار کی طرح ہو جائیں گے جو فضا میں بکھر جاتا ہے" (وبست الجبال بسًّا فکانت هباء منبثًّا) (واقعہ/۵-۶)۔

آخر میں جیسا کہ زیر بحث آیت میں آیا ہے صرف ان کے اثرات باقی رہ جائیں گے اور وہ دُور سے سراب نظر آئیں گے اور اس طرح پہاڑ زمین پر سے ختم ہو جائیں گے اور زمین ہموار ہو جائے گی۔ (ویسئلونك عن الجبال فقل ینسفها ربی نسفًا فیذرها قاعًا صفصفًا)۔ "تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دے کہ میرا پروردگار انہیں تباہ و برباد کر دے گا اور زمین کو صاف و ہموار کر دے گا" (طٰہٰ/۱۰۵-۱۰۶)۔

"سراب" "سرب" (بروزن طرف) کے مادہ سے ڈھلان کی طرف چلنے کے معنی میں ہے اور چونکہ بیابانوں میں گرمی کے دنوں میں جس وقت انسان ڈھلان کی طرف چلے تو دور سے اسے ایک چمک سی نظر آتی ہے۔ وہ گمان کرتا ہے کہ یہ پانی ہے حالانکہ سوائے روشنی (نور کے ذرات) کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی اس کے بعد ہر اس چیز کو، جس کا ظاہر ہو لیکن اس کی کوئی حقیقت نہ ہو، سراب کہا جاتا ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا آیت اس حرکت کی ابتدا و انتہا کو بیان کرتی ہے۔ دوسرے مرحلے دوسری آیتوں میں آئے ہیں۔

حقیقت میں پہاڑ غبار کی شکل میں فضا میں سراب کی شکل میں ہو جائیں گے۔ وہ مقام جہاں پہاڑ اس قسم کی سختی کے ہوتے ہوئے ایسی صورت اختیار کر لیں گے تو ظاہر ہے کہ عالم میں اس کے سامنے کس قسم کے تغیرات رونما ہوں گے۔ لہٰذا وہ افراد اور قومیں جو اس دنیا میں پہاڑ جیسا مضبوط جسم رکھتی تھیں ان کی سراب سے زیادہ حیثیت نہیں ہوگی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حوادث نفخ اولیٰ میں صورت پذیر ہوں گے جو اس عالم کے اختتام سے تعلق رکھتے ہیں یا نفخ ثانیہ میں جس سے قیامت کی ابتدا ہے۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت (یوم ینفخ فی الصور فتأتون افواجًا) بتا رہی ہے کہ یہ حوادث نفخ ثانیہ سے تعلق رکھتے ہیں جس میں زندہ

ہو جانے والے انسان فوج در فوج عرصۂ محشر میں وارد ہوں گے۔ لہٰذا اس امر آیت کو بھی قاعدتاً اسی نفخ سے متعلق ہونا چاہیئے۔ البتہ ممکن ہے کہ پہاڑوں کی اس حرکت کا آغاز پہلے نفخ میں صورت پذیر ہو اور ان کا سراب میں تبدیل ہونا دوسرے نفخ میں ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے تمام مرحلے نفخِ اولیٰ سے تعلق رکھتے ہوں، البتہ چونکہ ان دونوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے لہٰذا ان کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے جیسا کہ قرآن کی کچھ اور آیات میں بھی نفخِ اولیٰ و ثانیہ کے حوادث کا ذکر ایک جگہ ہوا ہے (اس کا نمونہ سورہ تکویر و انفطار) میں نظر آتا ہے۔ (غور کیجئے)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں پہاڑوں کا میخوں کے عنوان سے اور زمین کا گہوارے کے عنوان سے تعارف ہوا ہے اور زیرِ بحث آیات میں آیا ہے کہ وہ دن جس میں عالم کے فنا ہونے کا فرمان صادر ہوگا تو یہ گہوارہ درہم برہم ہو جائے گا اور یہ عظیم میخیں اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گی۔ واضح ہے کہ جس وقت کسی چیز کی میخوں کو کھینچا جائے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

(۲۱) اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۙ
(۲۲) لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۙ
(۲۳) لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ
(۲۴) لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۙ
(۲۵) اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۙ
(۲۶) جَزَآءً وِّفَاقًا ؕ
(۲۷) اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۙ
(۲۸) وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ؕ
(۲۹) وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۙ
(۳۰) فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۧ

ترجمہ

(۲۱) جہنم ایک بہت بڑی کمین گاہ ہے۔
(۲۲) اور سرکشی کرنے والوں کے لیے بازگشت کی جگہ۔
(۲۳) وہ اس میں طویل مدت تک رہیں گے۔
(۲۴) وہاں نہ کوئی ٹھنڈی چیز چکھیں گے اور نہ کوئی خوشگوار مشروب۔
(۲۵) سوائے جلتے ہوئے پانی، پیپ اور لہو کے۔
(۲۶) یہ سزا ان کے اعمال کے موافق و مطابق ہے۔

۲۷ اس لیے کہ انہیں حساب کی اُمید نہیں تھی۔

۲۸ اور انہوں نے ہماری آیتوں کی مکمل طور پر تکذیب کی۔

۲۹ اور ہم نے ہر چیز کا احصا کیا ہے اور اسے ثبت کیا ہے۔

۳۰ پس چکھو، عذاب کے علاوہ ہم تم پر کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کریں گے۔

تفسیر

جہنم ایک عظیم کمین گاہ۔

معاد کے متعلق دلائل اور قیامت کے بعض حوادث کو بیان کرنے کے بعد قرآن دوزخیوں اور جہنمیوں کی سرنوشت کی طرف رُخ کرتا ہے۔ بات پہلے دوزخیوں سے شروع ہوتی ہے۔ فرماتا ہے: "جہنم کمین گاہ ہے" (ان جہنم کانت مرصادًا)۔ "اور سرکشوں کی بازگشت کا مقام ہے" (للطاغین مآبًا)[1] "وہ اس میں طویل مدت تک رہیں گے" (لابثین فیھا احقابًا)۔

"مرصاد" اسم مکان ہے۔ یہ اس جگہ کے معنی میں ہے جہاں کمین گاہ بناتے ہیں۔ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "مرصد" (بروزن مرقد) اور "مرصاد" دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے، اس فرق کے ساتھ کہ "مرصاد" اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو کمین گاہ کے لیے مخصوص ہو۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس شخص کے معنی میں ہے جو کمین گاہ سے زیادہ کام لیتا ہو، معمار کی طرح جو اس شخص کے معنی میں ہے جو بہت زیادہ تعمیر کا کام کرتا ہو۔ البتہ پہلے معنی زیادہ معروف ہیں اور مناسب بھی ہیں۔

اب یہ کہ دوزخ میں کون شخص دوزخیوں کی تاک میں ہے، بعض علماء نے کہا ہے کہ، اس سے مراد عذاب کے فرشتے ہیں، اس لیے کہ سورہ مریم کی آیت ۷۱ کے مطابق تمام انسان، عام اس سے کہ نیک ہوں یا بد، دوزخ کے قریب سے گزریں گے، یا اس کے اوپر سے عبور کریں گے (وان منکم الّا واردھا کان علیٰ ربک حتمًا مقضیًّا) اس عمومی گزرگاہ میں عذاب کے فرشتے کمین گاہ میں ہیں اور وہ دوزخیوں کو اُچک لیں گے۔

اگر ہم اس کی صیغۂ مبالغہ کے اعتبار سے تفسیر کریں تو پھر خود دوزخ ان کی تاک میں قرار پائے گا اور سرکشوں میں سے جو کوئی اس کے قریب ہوگا وہ اسے اپنی طرف کھینچ لے گا اور اسے نگل لے گا۔ بہرحال اس عمومی گزرگاہ پر سے سرکشوں میں سے کوئی نہیں گزر سکے گا مگر یہ کہ یا عذاب کے فرشتے اسے اُچک لیں گے، یا جہنم کی شدید

---

[1] آیت محذوف رکھتی ہے۔ تقدیر اس طرح ہے (کانت للطاغین مآبًا)

بخشش اسے کھینچ لے گی۔

"مآب" کے معنی مرجع یا محلِ بازگشت کے ہیں، لوٹنے کی جگہ۔ یہ کبھی منزل اور قرارگاہ کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں اسی معنی میں ہے۔ باقی رہا "احقاب" جو "حقب" (بروزن قفل) کی جمع ہے۔ یہ زمانے کی غیر محدود مدت کے معنی میں ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی اسّی سال، بعض نے ستر سال اور بعض نے چالیس سال تفسیر کی ہے۔ چونکہ اس تفسیر سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوزخی طویل مدت تک دوزخ میں رہیں گے، اور آخرکار ختم ہو جائیں گے۔ یہ چیز ہمیشہ رہنے والے عذاب سے متضاد ہے، اس لیے ہر ایک مفسر نے اس تفسیر میں کوئی نہ کوئی راہ اختیار کی ہے۔ مفسرین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ احقاب سے مراد یہاں یہ ہے کہ طولانی مدتیں اور سال ہائے دراز پے در پے آئیں گے اور گزر جائیں گے بغیر اس کے کہ وہ ختم ہوں۔ جو زمانہ گزرے گا دوسرا اس کا جانشین بن جائے گا۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ آیت ان گنہگاروں کے بارے میں ہے جو آخرکار پاک ہو جائیں گے اور دوزخ سے آزاد ہو جائیں گے، نہ کہ ان کافروں کے بارے میں جو جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔[1]

اس کے بعد جہنم کے شدید عذابوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ وہاں نہ کوئی ٹھنڈی چیز چکھیں گے جو جہنم کی وحشتناک گرمی کو کم کر سکے اور نہ انہیں کوئی خوشگوار مشروب ملے گا جو ان کی شدید پیاس کو تسکین بخشے۔ (لا یذوقون فیھا بردًا ولا شرابًا)۔ "سوائے جلتے ہوئے پانی، پیپ اور لہو کے" (الا حمیمًا و غساقًا)۔ "اور سوائے آگ کے گاڑھے، گرم، خفقان میں مبتلا کر دینے والے اور گھٹن پیدا کرنے والے دھوئیں کے سائے کے، جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیت ۴۳ میں آیا ہے: (وظل من یحموم)۔

"حمیم" نہایت گرم پانی کے معنی میں ہے اور غساق پیپ اور لہو کے معنی میں ہے جو زخم سے نکلتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر بدبودار بہنے والی چیزوں سے کی ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ جنت والے اپنے پروردگار کی طرف سے شراب طہور کے خوشگوار چشموں سے سیراب ہوں گے۔ (وسقاھم ربھم شرابًا طھورًا)۔ (دھر۔ ۲۱)[2] اور ایسے مشروبات سے سیراب ہوں گے جو جنت کے خوبصورت ظروف میں ہوں گے اور جن پر مُہر لگی ہوئی ہوگی۔ ایسی مُہر جو مشک سے ہوگی۔ (ختامہ مسک)۔ (مطففین / ۲۶)۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

چونکہ ممکن ہے کہ ان سخت اور شدید عذابوں کا وجود بعض افراد کو عجیب نظر آئے لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ صفحہ ۴۹۴ حدیث ۲۳۔ اور۔ حدیث ۲۶ صفحہ ۴۹۵۔

"یہ سزا ان کے اعمال کے موافق و مناسب ہے۔" (جزاء وفاقاً)[1] ایسا کیوں نہ ہو، اس لیے کہ انہوں نے اس دنیا میں مظلوموں کے دل جلائے ہیں اور ان کے قلب و جان میں آگ لگائی ہے اور اپنے ظلم و ستم اور سرکشی کی وجہ سے کسی پر رحم نہیں کھایا۔ لہٰذا یہی مناسب ہے کہ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے اور ان کے مشروبات ایسے ہی ہوں، اصولی طور پر جیسا کہ ہم نے بار بار تاکید بھی کی ہے۔

آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں گنہگاروں پر ہونے والے عذاب اور ان کو ملنے والی بہت سی سزائیں ان کے اعمال کی تجسیم ہیں جیسا کہ سورہ تحریم کی آیت ۷ میں ہم پڑھتے ہیں (یا ایھا الذین کفروا لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون)۔ "اے کافرو! آج معذرت نہ کرو اس لیے کہ تمہاری سزا صرف وہی اعمال ہیں جنہیں تم انجام دیتے تھے۔" (جو اب مجسم ہو گئے ہیں اور تمہارے سامنے آگئے ہیں)۔ اس کے بعد اس سزا کی علت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ اس بناء پر ہے کہ وہ حساب کتاب کی امید اور خدا کا خوف نہیں رکھتے تھے۔" (انھم کانوا لا یرجون حسابًا)۔ حساب اور روزِ جزاء سے یہی بے اعتنائی ان کی سرکشی اور ظلم و ستم کا باعث بنی تھی اور اسی ظلم و فساد نے ان کے لیے اس قسم کی دردناک سرنوشت فراہم کی۔ حقیقت میں حساب کے متعلق عدم اطمینان سرکشی کا سبب ہے اور وہ ان سخت قسم کے عذابوں کا عامل و سبب ہے۔

توجہ رہے کہ "لا یرجون" رجاء کے مادہ سے امید کے معنی میں بھی ہے اور عدمِ خوف و وحشت کے معنی میں بھی۔ اصولی طور پر جب کوئی انسان سزا و عذاب کا امکان محسوس کرتا ہو تو وہ فطرتاً خوف کھاتا ہے اور اگر یہ چیز محسوس نہ کرتا ہو تو پھر وہ نہیں ڈرتا۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے وہ لوگ جو حساب و کتاب پر یقین نہ رکھتے ہوں خوف و ہراس محسوس نہیں کر سکتے۔

"انّ" کی تعبیر جو تاکید کے لیے ہے اور "کانوا" کا لفظ جو ماضی میں استمرار کو بیان کرتا ہے اور "حسابًا" جو نفی کے بعد نکرہ کی شکل میں آیا ہے اور عمومیت کے معنی دیتا ہے، یہ سب اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ وہ مطلقاً کسی قسم کے حساب و کتاب کا خوف نہیں رکھتے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ قیامت میں ہونے والے حساب و کتاب کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور اسے اپنی زندگی کے لائحہ عمل میں سے مکمل طور پر حذف کر چکے تھے۔ اور یہ ایک فطری امر ہے کہ ایسے افراد اس طرح کے بڑے گناہوں میں آلودہ ہوں اور آخرکار دردناک عذاب میں گرفتار ہوں۔

اسی لیے بلا فاصلہ مزید کہتا ہے: "انہوں نے ہماری آیات کی مکمل طور پر تکذیب کی۔"

---

[1] جزاء منصوب ہے فعل محذوف کے مفعول مطلق کے عنوان سے جو کلام کے قرینہ سے واضح ہوتا ہے اور وفاق بھی مصدر کے معنی رکھتا ہے اور اس کی صفت ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے یجازیھم جزاء ذا وفاق۔

(وکذبوا بآیاتنا کذّابًا) [1]

ان پر ہوائے نفس اس طرح غالب آئی کہ انہوں نے خوابِ غفلت سے جگانے والی تمام الٰہی آیات کا شدت سے انکار کیا تاکہ وہ اپنی سرکشی کو اور ہَوا و ہوس کے مشغلہ کو جاری رکھ سکیں اور اپنی غیر شرعی خواہشات کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

ظاہر ہے کہ لفظِ آیات کے یہاں ایک وسیع معانی ہیں جس میں تمام آیاتِ توحید و نبوت و تشریع و تکوین و معجزاتِ انبیاء و احکام و سنن سب شامل ہیں اور ان سب آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جن سے عالمِ تکوین و تشریع چھلک رہا ہے، ہمیں تصدیق کرنی چاہیئے۔ وہ سزائیں ایسے ایسے منکر افراد کے لیے مناسب ہیں۔

اس کے بعد ان سرکشوں کو تنبیہ کرتے ہوئے اور جرم و حاکمیت و سزائے مناسب کے درمیان موازنہ کے موجود ہونے کے مسئلہ پر تاکید کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ہم نے ہر چیز کا قطعی اور یقینی طور پر احصا کیا ہے" (وکل شیء احصیناہ کتابًا) [2]

تاکہ تم یہ گمان نہ کرو کہ کوئی چیز تمہارے اعمال میں سے بے حساب اور بغیر سزا کے رہ جائے گی اور یہ خیال بھی تمہیں نہ ہو کہ یہ شدید قسم کی سزائیں غیر منصفانہ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے تمام اعمال، قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، پوشیدہ ہوں یا ظاہر، یہ سب ثبت ہوتے ہیں حتیٰ کہ نیتیں اور عقائد بھی لکھے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت بہت سی قرآنی آیات سے ثابت ہوتی ہے۔

ایک جگہ فرماتا ہے: (وکل شیء فعلوہ فی الزبر وکل صغیر وکبیر مستطر) "جس کام کو انہوں نے انجام دیا وہ ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے اور ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جاتا ہے" (قمر/۵۲، ۵۳)۔

دوسری جگہ فرماتا ہے: (ان رسلنا یکتبون ما تمکرون) "جو کچھ تم کرتے ہو ہمارے رسول اُسے لکھتے ہیں" (یونس/۲۱)۔

علاوہ ازیں ہم پڑھتے ہیں (ونکتب ما قدموا و آثارھم) "اور ہم ان تمام چیزوں کو جنہیں تم نے آگے بھیجا ہے اور اسی طرح ہم ان کے آثار کو لکھتے ہیں" (یٰسین/۱۲)۔

---

[1] "کذّاب" (کاف کے زیر کے ساتھ) باب تفعیل کے مصدر کا ایک صیغہ ہے جو تکذیب کے معنی میں ہے۔ بعض اربابِ لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ ثلاثی مجرد کا مصدر اور کذب کا معادل ہے بہرحال "کذبوا" کا مفعول مطلق ہے اور تاکید کے لیے ہے۔

[2] اس آیت میں "کل" فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے جس پر فعل مذکور یعنی "احصیناہ" دلالت کرتا ہے اور "کتابًا" مفعول مطلق کے عنوان سے منصوب ہے اس لیے کہ "احصینا" "کتبنا" کے معنی میں ہے اور بعض نے اسے حال سمجھا ہے۔

اسی لیے جب مجرموں کے نامۂ اعمال ان کے ہاتھوں میں دیں گے تو ان کی فریاد بلند ہوگی اور وہ کہیں گے: (یا ویلتنا مال ھٰذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الّا احصاھا) "وائے ہو ہم پر، اس کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں ہے جسے ثبت نہ کیا گیا ہو اور وہ شمار نہ ہوا ہو" (کہف/۴۹)۔

اس میں شک نہیں کہ جو شخص اس حقیقت کو اپنے دل سے باور کرے تو وہ اعمال کے انجام دینے میں بہت ہی باریک بیں اور حساب کرنے والا ہوگا، اور یہی اعتقاد انسان اور گناہ کے درمیان بہت بڑی رکاوٹ ڈال دے گا اور وہ تربیتِ ذات کے اہم عوامل میں شمار ہوگا۔

آخری زیرِ بحث آیت میں گفتگو کے لب و لہجہ کو تبدیل کرتے ہوئے انہیں غائب سے مخاطب بنا کر تہدید آمیز غصہ سے بھرے ہوئے اور دل ہلا دینے والے جملے فرماتا ہے: "پس چکھو، ہم تم پر سوائے عذاب کے اور کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتے" (فذوقوا فلن نزیدکم الّا عذابًا)۔ جس قدر فریاد کرو "یا ویلتنا" کہو، دنیا کی طرف بازگشت اور گناہوں کی تلافی کا مطالبہ کرو، تمہاری بات نہیں سنی جائیگی اور تم پر سوائے عذاب کے اور کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوگا۔ یہ سزا ہے ان لوگوں کی جو انبیائے خدا کی محبت آمیز دعوتِ فکر کے مقابلے میں یہ کہتے تھے: (سواء علینا اوعظت ام لم تکن من الواعظین)۔ "ہمارے لیے یکساں ہے کہ ہمیں تو نصیحت کرے یا نہ کرے" (شعراء/۱۳۶)۔ اور یہ اس شخص کی سزا ہے کہ جب اس کے سامنے خدائی آیات پڑھی جاتیں تو اس میں نفرت کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ (مایزیدھم الّا نفورًا)۔ (اسراء/۴۱) اور بالآخر ایسے سزا اس شخص کی جو کہ گناہ سے روگرداں نہیں تھا اور جو ہر کارِ خیر سے بے تعلق تھا۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ: (ھذہ الآیۃ اشد ما فی القرآن علی اھل النار)۔ یہ آیت قرآنِ کریم کی شدید ترین آیت ہے جو دوزخیوں کے بارے میں آئی ہے[1]

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ خداوندِ غفور و رحیم اُن پر غضبناک ہوا ہے اور انہیں ایسے جملے سے مخاطب کیا ہے جس نے ان کے سامنے امیدوں کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں اور سوائے اضافۂ عذاب کے وعدہ کے انہیں اور کوئی چیز نہیں دیتا۔

---

[1] "تفسیر کشاف" جلد ۴ صفحہ ۶۹۰۔ یہی حدیث تفسیر صافی میں بھی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں آئی ہے اور اسی طرح تفسیر روح البیان میں جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۷ پر۔

(۳۱) اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۙ
(۳۲) حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۙ
(۳۳) وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۙ
(۳۴) وَّكَاْسًا دِهَاقًا ؕ
(۳۵) لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۚ
(۳۶) جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۙ
(۳۷) رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۚ

ترجمہ

(۳۱) پرہیزگاروں کے لیے یقیناً عظیم کامیابی ہے۔
(۳۲) سرسبز باغات اور انواع و اقسام کے انگور ہیں۔
(۳۳) اور بھرپور اور جوان ہم سن حوریں ہیں۔
(۳۴) اور لبریز و لگاتار و مسلسل جام ہیں۔ (شرابِ طہور کے)۔
(۳۵) وہاں نہ کوئی لغو و بیہودہ بات سُنیں گے اور نہ جھوٹ۔
(۳۶) یہ جزاء ہے تیرے پروردگار کی طرف سے اور کافی عطیہ ہے۔
(۳۷) وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور ان کا رحمٰن و پروردگار ہے جو ان دونوں کے درمیان ہے اور کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ اس کی اجازت کے بغیر بات کرے۔ (یا شفاعت کرے)۔

تفسیر
پرہیز گاروں کی عظیم جزا کا ایک حصّہ

گزشتہ آیات میں گفتگو سرکشی کرنے والوں کی سرنوشت اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کے ایک حصّہ اور اس کی بدبختی کے سبب کے بارے میں تھی اور زیر بحث آیات میں اس کے نقطۂ مقابل کی تشریح ہو رہی ہے۔ سچے مومنین اور پرہیزگاروں کے لیے قیامت میں جو نعمتیں ہیں ان کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تاکہ تقابل کی وجہ سے حقائق زیادہ واضح ہوں۔

قرآن مجید کا یہی طریقہ دوسری صورتوں میں بھی ہے کہ وہ اضداد کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں لاکر ان کی حقیقت وکیفیت کو مقابلہ اور موازنہ کے ذریعہ واضح کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: "پرہیزگاروں کے لیے عظیم کامیابی اور نجات ہے" (ان للمتقین مفازًا)۔

"مفاز" اسم مکان یا مصدر میمی ہے۔ یہ فوز کے مادہ سے ہے اور خیر و خوبی تک سلامتی کے ساتھ پہنچنے کے معنی میں بھی آیا ہے جو اس معنی کا لازمی حصّہ ہے۔ اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مفاز نکرہ کی شکل میں بیان ہوا ہے عظیم کامیابی اور بہت بڑی سعادت تک پہنچنے کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد اس سعادت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"سرسبز و پُرمسرت ومحفوظ باغات انواع واقسام کے انگوروں اور پھلوں کے ساتھ" (حدائق واعنابًا)[1]

"حدائق" حدیقہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسا پُرمسرت، سرسبز اور پُر درخت باغ، جس کے گرد دیوار کھنچی ہوئی ہو اور وہ ہر لحاظ سے محفوظ ہو۔ راغب مفردات میں کہتا ہے حدقہ دراصل اس زمین کو کہتے ہیں جس میں آنکھ کے ڈھیلے کی طرح ہمیشہ پانی موجود رہے۔

قابل توجہ یہ امر ہے کہ یہاں تمام پھلوں میں سے انگور کا ذکر ہوا ہے، ان حد سے زیادہ خوبیوں اور مزے کی وجہ سے جو اس پھل میں ہے۔ اس لیے کہ بقول ماہرین غذا انگور، علاوہ اس کے کہ اپنے خواص کے اعتبار سے ایک مکمل غذا شمار ہوتا ہے اور اس کے اجزائے غذائی شیر مادر سے بہت مشابہ ہیں، یہ بدن میں گوشت سے دگنی حرارت پیدا کرتا ہے اس کے علاوہ اس میں اس قدر مفید اجزائے غذائی ہیں کہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک فطری دواخانہ ہے۔

اس کی زہر سے متضاد خاصیت ہے۔ یہ تصفیۂ خون کے لیے بہت مفید ہے۔ جوڑوں کے درد، ورم،

---

[1] "حدائق" "مفازًا" کا بدل ہے یا اس کا عطف بیان ہے۔

انگلیوں کے جوڑ بند خصوصاً انگوٹھے کے درد کے لیے فائدہ مند ہے اور خون کے اس بے رنگ مادہ کے اضافہ کو روکتا ہے جس کا ذائقہ شور و تلخ ہے۔ اس کے علاوہ انگور اعصاب کو تقویت دیتا ہے اور جسم میں احساس نشاط پیدا کرتا ہے اور انواع و اقسام کے وٹامن اپنے اندر رکھنے کی وجہ سے انسان کو قوت و طاقت بخشتا ہے یہ انگور کے آثار و خواص کا ایک گوشہ ہے۔

اسی لیے پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے (خیر فواکھکم العنب)۔ "تمہارے میووں اور پھلوں میں سے انگور سب سے بہتر ہے"۔

اس کے بعد جنت کی بیویوں کی طرف، جو پرہیزگاروں کو ملنے والی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں، اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ان کے لیے بہت ہی نوجوان حُوریں ہیں جن کے سینوں کا ابھار نیا نیا ظاہر ہُوا ہے اور جو ہم سن ہیں" (وکواعب اترابًا)۔

"کواعب"، "کاعب" کی جمع ہے۔ یہ اس دوشیزہ کے معنوں میں ہے جس کے سینے کا ابھار نیا نیا ظاہر ہُوا ہو جو جوانی کے آغاز کی طرف اشارہ ہے۔

"اتراب"، ترب (بروزن حزب) کی جمع ہے جس کے معنی ہم سن کے ہیں۔ یہ زیادہ تر مؤنث کی صفت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بعض مفسرین کے بقول اصل میں "ترائب" سے لیا گیا ہے جس کے معنی سینے کی پسلیاں ہیں جو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں اور ہم سن ہونا ممکن ہے جنت کی خواتین کے لیے ہو یعنی وہ سب نوجوان ہوں گی۔ وہ حُسن و جمال کی زیبائی اور قد و قامت کے اعتدال میں ایک جیسی ہوں گی۔ یا ہم سن ہونا ان کے اور ان کے شوہروں کے درمیان ہوگا اس لیے کہ شوہر اور زوجہ کے درمیان سن کا برابر ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو سمجھ سکیں۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد جنت کی چوتھی نعمت جو پرہیزگاروں کے انتظار میں ہے اس کی اس طرح تشریح کرتا ہے "اور لبریز و مسلسل شراب طہور کے جام" (وکأسًا دھاقًا)۔ یہ دنیاوی شراب کی طرح نجس شراب نہیں ہوگی جو عقل کو بیکار کر دیتی ہے اور انسان کو جانور کی حد تک گرا دیتی ہے، بلکہ ایسی شراب ہوگی جو عقل میں اضافہ کرے گی۔ وہ نشاط آفریں، جاں پرور اور روح افزا ہوگی۔

"کأس" (بروزن راس) مشروب سے لبریز جام کے معنوں میں ہے اور کبھی کبھی خود جام یا جو کچھ اس میں ہے اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

"دھاق" کی تفسیر بہت سے مفسرین نے لبریز کی ہے لیکن "ابن منظور" نے "لسان العرب" میں اس کے لیے دو اور معانی بھی تجویز کیے ہیں۔ ایک پے در پے اور دوسرے صاف و شفاف۔ اس بنا پر اگر ان معانی کے مجموعہ کو ہم ذہن میں رکھیں تو آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ جنتیوں کے لیے شفاف، لبریز اور پے در پے

شراب طہور کے جام ہوں گے۔

دنیا میں جام و شراب کی گفتگو اس کے غیر مطلوب معانی کا تقاضا کرتی ہے جبکہ جنت کی شراب دنیا کی شیطانی شرابوں سے بالکل متضاد ہے لہٰذا بلا فاصلہ مزید کہتا ہے: "جنت والے وہاں نہ لغو و بیہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ سنیں گے" (لا یسمعون فیھا لغوًا ولا کذّابا)۔

دنیا کی شراب عقل کو تباہ کر دیتی ہے اور ہوش و حواس کو ختم کر دیتی ہے اور انسان کو بیہودہ گوئی اور غیر مناسب باتوں کے کہنے پر آمادہ کرتی ہے لیکن جنت کی شراب طہور انسان کو روح و عقل اور نور و صفائے باطن بخشتی ہے۔

یہ کہ فیھا کی ضمیر کا مرجع کیا ہے اس میں علماء نے دو احتمال تجویز کیے ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ جنت کی طرف لوٹتی ہے اور دوسرا یہ کہ (کأس) جام کی طرف لوٹتی ہے۔

پہلی تفسیر کی بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا جنت میں لغو اور جھوٹی بات نہیں سنیں گے جیسا کہ سورہ غاشیہ کی آیت ۱۰ اور ۱۱ میں آیا ہے: (فی جنّة عالیة لا تسمع فیھا لاغیة) جن کی جنت عالی میں جگہ ہوگی جس میں تو لغو اور بیہودہ بات نہیں سنے گا"

دوسری تفسیر کی بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا "اس شراب کے جام کے پینے سے لغو اور جھوٹ حاصل نہیں ہوگا" جیسا کہ سورہ طور کی آیت ۲۳ میں آیا ہے: (یتنازعون فیھا کأسًا لا لغو فیھا ولا تأثیم) وہ جنت میں شراب طہور سے لبریز جام ایک دوسرے سے لیں گے جس میں نہ بے ہودہ گوئی ہے اور نہ گناہ۔

بہرحال اہل جنت کو ملنے والی عظیم معنوی نعمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں دروغ گوئی، بے ہودگی، تہمت، حق کی تکذیب، باطل کی توجیہ اور ان نامعقول باتوں کا نام و نشان تک نہ ہوگا جو پرہیزگاروں کے دلوں کو اس دنیا میں تکلیف پہنچاتی ہیں۔ اور واقعی کیا ہی خوبصورت اور اچھا ہوگا وہ ماحول جس میں ان غیر موزوں تکلیف دہ اور رنج پہنچانے والی باتوں کا نشان تک نہ ہوگا اور سورہ مریم کی آیت ۶۲ کے مطابق "وہ سوائے سلام اور صلح آمیز باتوں کے وہاں کوئی اور بات نہیں سنیں گے" (لا یسمعون فیھا لغوًا الّا سلامًا)

ان نعمتوں کے بیان کے آخر میں ایک اور معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ جزا ہے تیرے پروردگار کی جانب سے اور کافی عطیہ ہے" (جزاء من ربك عطاء حسابًا)[1]

اس سے کونسی نعمت اور بشارت بالا ہے کہ ضعیف و کمزور بندہ اپنے مولائے کریم کی نوازش، کرم اور

---

[1] جزاً اس آیت میں ان نعمتوں کا حال ہے جو گزشتہ آیات میں آئی ہیں اور معنوی طور پر اس طرح ہے (اعطاھم جمیع ذالك حالکونه جزاء من ربك) (یہ سب کچھ خدا نے انہیں دیا در آں حالیکہ یہ جزا ہے تیرے رب کی طرف سے) بعض نے یہ احتمال بھی بتایا ہے کہ یہ ایک فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور بعض نے اسے مفعول لاجلہ جانا ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

لطف وکرم کا مورد قرار پائے۔ وہ اس کا اکرام کرے، اسے بزرگی عطا کرے اور خلعت بخشے۔ یہ توجہ وعنایت اور یہ لطف ومحبت مومنین کو اس قسم کا لطف دے گی جس کا کوئی نعمت مقابلہ نہیں کرسکتی۔ بقول شاعر:

من کہ باشم کہ بر اں خاطر عاطر گزرم لطفہا می کنی اے خاک درت تاج سرم

مَیں کون ہوں جس کا اس کے پاک اور معطر دل میں گزر ہو۔ یہ تو اے وہ شخص، جس کے در کی خاک میرے سر کا تاج ہے، تیرا لطف وکرم ہے۔

"رب" کی تعبیر ضمیر مخاطب کے ساتھ اور عطا کے لفظ کو لیے ہوئے یہ سب حد سے زیادہ لطف وکرم کو بیان کرتے ہیں جو ان نعمتوں میں پوشیدہ ہے۔

لفظ "حساباً" بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق یہاں "کافیا" کے معنی میں ہے جیسا کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے "احسبت" یعنی مَیں نے اس پر اتنا لطف وکرم کیا کہ اس نے "حسبی" کافی ہے[1] کہا۔

ایک حدیث میں امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ قیامت میں خدا مومنین کی حسنات کا حساب کرے گا اور ہر نیکی کا دس گنا اور ستر گنا اجر عطا فرمائے گا، جیسا کہ خدا قرآن میں فرماتا ہے: (جزاء من ربك عطاء حساباً)[2]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے عطیات، باوجود اس کے تفضّل کا پہلو لیے ہوئے ہوتے ہیں، اعمال کے حساب کی بناء پر ہیں یعنی اس کے تفضّلات وعطیات انسانوں کے اعمالِ صالح کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور اس طرح مندرجہ بالا آیت میں "حساباً" کی مشہور معنی محاسبہ سے تفسیر کی جاسکتی ہے اور اس معنی اور گزشتہ معنی کا جمع ہونا بھی کوئی قباحت نہیں رکھتا۔ (غور کیجئے)۔

اس کے بعد آخری آیت میں مزید کہتا ہے "یہ عظیم عطیات وہی بخشتا ہے جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، ان کا پروردگار ہے۔ وہی خدا جو رحمٰن اور بخشنے والا ہے۔ (رب السماوات والارض وما بینهما الرحمٰن) جی ہاں! وہ جو اس باعظمت جہان کا مالک مدبر اور مربّی ہے اور اس کی رحمت نے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ وہی قیامت میں نیکو کاروں اور پاک لوگوں کو یہ سب عطیات بخشنے والا ہے۔ حقیقت میں مندرجہ بالا آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا اس قسم کا وعدہ کرتا ہے تو اُس نے اِس دنیا میں اُس کے ایک گوشہ کی اپنی رحمتِ عامہ کی شکل میں اہلِ آسمان وزمین کو نشاندہی کرائی ہے۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "کوئی اور شخص حق نہیں رکھتا کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں بات کرے یا شفاعت کرے" (لا یملکون منه خطاباً)۔

---

[1] تفسیر بیضاوی در ذیل آیہ زیر بحث۔

[2] نور الثقلین، جلد ۵ صفحہ ۴۹۵ حدیث ۲۹۔

"لا یملکون" میں جو ضمیر ہے، ہو سکتا ہے کہ تمام اہل آسمان اور زمین کی طرف لوٹے یا اُن تمام متقین اور سرکشوں کی طرف لوٹے جو حساب کتاب اور جزاء و سزا کی غرض سے عرصۂ محشر میں جمع ہوں گے۔ بہر حال یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس دن کسی شخص کو اعتراض اور چون و چرا کا حق نہیں ہوگا اس لیے کہ خدائی حساب اس قدر باریک بینی پر مبنی اور عادلانہ ہے کہ کسی قسم کے چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں کوئی شخص بھی شفاعت کا حق نہیں رکھتا مگر اس کے اذن سے (من ذاالذی یشفع عندہ الّا باذنہ) (بقرہ/ ۲۵۵)۔

چند نکات

۱۔ متقین کے لیے عطیات اور سرکشوں کے لیے عذاب

مندرجہ بالا آیات جو پرہیزگاروں کو ملنے والے عطیات کی بات کرتی ہیں، ان سے گزشتہ آیات کا موازنہ ہے جو سرکشوں کو ملنے والی سزاؤں کی بات کرتی ہیں۔ اس میں ایک پُرکشش مقابلہ نظر آتا ہے۔

یہاں گفتگو "مفاز" (محل نجات) سے ہے اور وہاں "مرصاد" (کمین گاہ) سے ہے۔ یہاں بات پھلوں سے بھرے ہوئے باغات کی ہے اور وہاں غیر محدود مدت تک آگ میں غرق ہونے کی "احقاب"۔ یہاں گفتگو پے بہ پے جاموں کی ہے جو شرابِ طہور سے لبریز ہوں گے، وہاں جلتے ہوئے اور ابلتے ہوئے پانی اور "حمیم و غساق" کی ہے۔ یہاں گفتگو خداوندِ رحمٰن کے وسیع و عریض عطیات کی ہے اور وہاں منصفانہ سزاؤں اور جزاء وفاق کی ہے۔ یہاں بات ہے نعمتِ الٰہی کی فراوانی کی اور وہاں عذاب کی فراوانی کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ ہر لحاظ سے دو مخالف قطب میں قرار پاتے ہیں کیونکہ وہ اس دنیا میں ایمان و عمل کے لحاظ سے دو مخالف قطب تھے۔

۲۔ جنت کے مشروب

قرآنِ مجید کی مختلف آیتوں میں جنت کی شرابوں کی بہت زیادہ تعریف و توصیف ہوئی ہے جن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کو پینے والے اس قسم کی روحانی لذت میں ڈوبے ہوئے ہوں گے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ ایک جگہ اس کی تعریف شرابِ طہور کے عنوان سے کرتا ہے (وسقاھم ربھم شرابًا طھورًا)۔ (سورہ دھر/ ۲۱)۔

دوسری جگہ تاکید کرتا ہے کہ صاف و شفاف خالص اور لذت بخش شراب، نہ تو دردِ سر پیدا کرتی ہے اور نہ سستی لاتی ہے، نہ فسادِ عقل پیدا کرتی ہے (یطاف علیھم بکأس من معین بیضاء لذۃ للشاربین لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون) (صافات/ ۴۵ تا ۴۷)۔

ایک جگہ فرماتا ہے: "ایسے جام (مشروب) پئیں گے جو کافور کی آمیزش رکھتے ہیں (ٹھنڈے اور سکون بخش ہیں) (یشربون من کأس کان مزاجھا کافورًا) (دھر/۵)۔

دوسری جگہ مزید فرماتا ہے: "ایسے جام انہیں پلائیں گے جس کے مشروب میں زنجبیل کی آمیزش ہے (گرم کرنے والا اور نشاط آفریں مشروب)۔ (ویسقون فیھا کأسًا کان مزاجھا زنجبیلًا) (دھر/۱۷)۔

زیر بحث آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے: "وہ لبالب زلال اور پے بہ پے جام رکھتے ہیں" (و کأسا دھاقًا) اور ان سب چیزوں سے اہم بات یہ ہے کہ اس بزم روحانی کا ساقی خدا ہے۔ وہ اس کے دستِ قدرت سے اور اس کی بساطِ رحمت سے جام حاصل کریں گے اور پئیں گے اور اس کے عشق و معرفت کے جذبہ سے سرشار ہوں گے" وسقاھم ربھم ... (دہر: ۲۱)

خداوندا! ہمیں بھی وہ شرابِ طہور عطا فرما۔

(۳۸) يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ○

(۳۹) ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ○

(۴۰) اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا ۜ ○

ترجمہ

(۳۸) یہ سب کچھ اس دن ہوگا جب روح اور ملائکہ ایک ہی صف میں قیام کریں گے اور کوئی بھی خدائے رحمٰن کے اذن کے بغیر بات نہیں کرے گا اور اس وقت سب درست بات کریں گے۔

(۳۹) وہ دن حق ہے جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف جانے والی راہ کا انتخاب کرسکتا ہے۔

(۴۰) اور ہم تمہیں قریبی عذاب سے ڈراتے ہیں۔ یہ عذاب اس دن نازل ہوگا جب انسان جو کچھ پہلے بھیج چکا ہے اُسے دیکھے گا اور کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا۔

تفسیر

کافر کہیں گے کاش ہم مٹی ہوتے

گزشتہ آیتوں میں قیامت کے دن سرکشوں پر نازل ہونے والے عذاب اور پرہیزگاروں کو حاصل ہونے والی نعمتوں کا قابلِ ملاحظہ بیان تھا۔ زیرِ بحث آیات میں اس عظیم دن کا تعارف کرانے کے لیے اس کے بعض اوصاف اور حوادث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ سب کچھ اس دن ہوگا جب روح

اور تمام ملائکہ ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے اور خداوند رحمٰن کے اذن کے بغیر کوئی بھی بات نہ کر سکے گا، اور جو بات کرے گا بھی تو حق کے علاوہ اور کچھ نہیں کہے گا۔ (یوم یقوم الروح والملائکۃ صفًّا لا یتکلمون الّا من اذن لہ الرحمٰن وقال صوابًا)[1]

اس میں شک نہیں کہ روح اور فرشتوں کا اس دن ایک ہی صف میں قیام اور خداوند رحمٰن کے اذن کے بغیر بات نہ کرسکنا صرف فرمانِ خدا کے اجراء کے لیے ہے۔ وہ اس جہان میں بھی "مدبرات امر" یعنی اس کے فرمان جاری کرنے والے ہیں اور عالم آخرت میں یہ امر زیادہ آشکار، زیادہ واضح اور وسیع صورت میں ہوگا۔

یہ کہ یہاں روح سے کیا مراد ہے، مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیریں کی ہیں۔ بعض تفاسیر میں تو آٹھ احتمال تک بیان کیے گئے ہیں[2] جن میں سے زیادہ اہم درج ذیل تفاسیر و احتمالات ہیں۔

۱۔ فرشتوں کے علاوہ ان سے افضل و برتر مخلوق مراد ہے۔

۲۔ حضرت جبرائیل امین مراد ہیں جو امینِ وحیٔ خدا ہیں اور خدا اور تمام انبیاء و رسل کے درمیان واسطہ ہیں۔ سارے فرشتوں کے سردار ہیں اور سب سے بڑے فرشتے ہیں۔

۳۔ انسانوں کی ارواح مراد ہیں جو فرشتوں کے ہمراہ قیام کریں گی۔

۴۔ ایک فرشتہ مراد ہے جو تمام فرشتوں سے برتر ہے جبرائیل امین سے بھی افضل و برتر ہے۔ یہ وہی ہے جو انبیاء و معصومین کے ہمراہ تھا اور ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ روح کا لفظ قرآن مجید میں کبھی مطلق صورت میں اور بغیر کسی قید و شرط کے بیان ہوا ہے اور اس حالت میں زیادہ تر مقابلہ کے لیے قرار پایا ہے مثلاً: (تعرج الملائکۃ والروح الیہ) فرشتے اور روح اس کی طرف اوپر جاتے ہیں۔ (معارج/۴)۔ (تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر) شب قدر میں ملائکہ اور روح اپنے پروردگار کے فرمان سے ہر چیز کے ساتھ نازل ہوں گے۔ (قدر/۴)۔

ان دو آیات میں ملائکہ کے بعد روح کا ذکر ہوا ہے اور زیرِ بحث آیت میں ملائکہ سے پہلے ہوا ہے۔ البتہ ممکن ہے کہ یہ اس کا الگ ہونا ایک بزرگ فرد کے عنوان کے ماتحت ہو اور اصطلاح کے مطابق خاص کے بعد عام کا ذکر یا عام کے بعد خاص کا ذکر ہو۔ لیکن بہت سی آیتوں میں روح ایک صفت کی طرف اضافہ کے

---

[1] بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ یوم اس آیت میں ظرف ہے اور گزشتہ آیات میں لا یملکون کے فعل سے متعلق ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام چیزوں سے متعلق ہو جو گزشتہ آیتوں میں آئی ہیں اور تقدیر عبارت اس طرح ہو (کل ذالک یکون یوم یقوم الروح) یہ سب کچھ اس دن ہوگا جب روح و ملائکہ ایک صف میں کھڑے ہوں گے۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۸ ص ۶۹۷۰۔

ساتھ آیا ہے مثلاً "روح القدس" (قل نزّله روح القدس من ربك بالحق) کہدے روح القدس نے اس قرآن کو تیرے پروردگار کی جانب سے حق کے ساتھ نازل کیا" (نحل/۱۰۲)۔ یا آیۂ (نزل به الروح الامین) قرآن کو روح الامین نے نازل کیا ہے" (شعراء/۱۹۳)۔

بعض آیات میں خدا نے روح کو اپنی طرف سے اضافت دی ہے۔ فرماتا ہے: (ونفخت فیه من روحی) "آدم میں میں نے اپنی روح پھونکی" ایک شریف روح جو اپنی شرافت کی وجہ سے اس کی ذات مقدس کی طرف مضاف ہوئی ہے۔ (حجر/۲۹)۔

دوسری جگہ فرماتا ہے: (فارسلنا الیها روحنا) "ہم نے مریم کی طرف اپنی روح بھیجی" (مریم/۱۷)۔ ایسا نظر آتا ہے کہ لفظِ روح ان آیات میں چونکہ مختلف شکلوں میں بیان ہوا ہے لہٰذا اس کے مختلف معانی ہیں جن کی تشریح انہی آیات کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔ لیکن، جو مختلف تفاسیر سے، زیر بحث آیات کے بارے میں زیادہ مناسب نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں روح سے مراد خدا کا ایک بہت بڑا فرشتہ ہے جو بعض روایات کے مطابق جبریلِ امین سے بھی افضل و برتر ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ (هو ملك اعظم من جبرائیل و میكائیل) وہ ایک فرشتہ ہے جو جبرائیل و میکائیل سے بھی بڑا ہے۔[1]

اور تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی آیا ہے (الروح ملك اعظم من جبرائیل و میكائیل وكان مع رسول الله وهو مع الائمة) روح ایک فرشتہ ہے جو جبریل و میکائیل سے افضل و برتر ہے۔ وہ رسول اللہؐ کے ساتھ تھا اور آئمہ کے ساتھ بھی ہے۔[2]

اگرچہ بعض روایات میں اہلِ سنت کی تفاسیر میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ: (الروح جند من جنود الله لیسوا بملائكة لهم رؤس وایدی وارجل ثم قرأ یوم یقوم الروح والملائكة صفًّا قال هؤلاء جند و هؤلاء جند) روح خدا کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جو ملائکہ نہیں ہیں۔ ان کے سر، ہاتھ اور پاؤں ہیں۔ اس کے بعد پیغمبر نے اس آیت کی تلاوت فرمائی (یوم یقوم الروح والملائكة صفًّا) پھر مزید فرمایا یہ ایک الگ لشکر ہے اور ملائکہ الگ لشکر ہیں۔[3]

انسان کی روح اور اس کے تجرد و استقلال کے بارے میں مشروح اور مفصل بحثیں ہم جلد ۱۲ صفحہ ۲۵۰ سے لے کر صفحہ ۲۵۵ تک (سورہ اسریٰ کی آیت ۸۵ کے ذیل میں) پیش کر چکے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۷۔

[2] تفسیر علی بن ابراہیم، جلد ۲ صفحہ ۴۰۲۔

[3] تفسیر درالمنثور، جلد ۶ صفحہ ۳۰۹۔

بہرحال جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے یہ عظیم خدائی مخلوق چاہے فرشتوں میں سے ہو یا اور کوئی خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہو، خدا کے فرمان کی اطاعت کے لیے ملائکہ کے ساتھ اطاعت کو آمادہ ہے اور اس طرح قیامت کی ہولناکی اور محشر کے اضطراب نے سب کو گھیر رکھا ہوگا کہ کسی کو بھی بات کرنے کی طاقت نہیں ہوگی اور جہاں کوئی بات کرے گا یا شفاعت کرے گا وہ صرف پروردگار کی اجازت سے ہوگا۔ وہ خدا کی حمد و ثنا کریں گے اور جو لائق شفاعت ہیں ان کی شفاعت کریں گے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: (نحن والله المأذون لهم يوم القيامة والقائلون) خدا کی قسم! قیامت کے دن ہمیں اجازت ہوگی اور ہم ہی گفتگو کریں گے۔

راوی سوال کرتا ہے اس روز آپ کون سی بات کریں گے۔ تو آپ نے فرمایا: (نمجد ربنا ونصلي على نبينا و نشفع لشيعتنا فلا يردنا ربنا) ہم اپنے پروردگار کی تمجید و تعریف کریں گے اور اپنے پیغمبرؐ پر درود و سلام بھیجیں گے اور اپنے پیروکاروں کی شفاعت کریں گے اور خدا ہماری شفاعت کو رد نہیں کرے گا[1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و ائمہ معصومین بھی ملائکہ اور روح کی صف میں قیام کریں گے اور انہیں بات کرنے، خدا کی حمد و ثنا کرنے اور شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی[2]

"صواباً" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ملائکہ و روح یا انبیاء و اولیاء کسی کے لیے شفاعت کریں تو بھی کسی حساب و کتاب کی بنیاد پر ہوگا اور بغیر وجہ و سبب کے نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس عظیم دن کی طرف جو انسانوں اور فرشتوں کے قیام کا دن بھی ہے، وہ یوم الفصل ہے، سرکشوں پر نزول عذاب کا دن ہے اور متقیوں کے اجر پانے کا دن۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ دن حق ہے" (ذالك اليوم الحق)۔

حق اس چیز کے معنی میں ہے جو ثابت ہے اور واقعیت رکھتی ہے اور تحقق پائے گی اور یہ معنی قیامت کے بارے میں مکمل طور پر ثابت ہیں۔ اس کے علاوہ ایسا دن ہے جس دن ہر شخص کا حق دیا جائے گا۔ مظلوموں کا حق ظالموں سے لیا جائے گا۔ اس دن اسرار ظاہر ہوں گے۔ اس لیے وہ ایسا دن ہے جو پورے طور پر حق ہے۔ چونکہ اس واقعیت کی طرف توجہ انسان کے خدا کی طرف رجوع اور اس کے فرمان کی اطاعت کے لیے

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۵ صفحہ ۴۲۷۔

[2] شفاعت اس کے شرائط و خصوصیات اور اس کے فلسفہ کے بارے میں اسی طرح اس کے مربوط اعتراضات و مشکلات کے سلسلہ میں تفصیلی بحثیں جلد ۱ سورہ بقرہ کی آیت ۴۸ کے ذیل میں ہم کر چکے ہیں۔

مؤثر ترین محرک اور سبب بن سکتی ہے، اس لیے بلا فاصلہ مزید کہتا ہے:

پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہے اور لوٹتا ہے (اس کی طرف) راستہ۔ (فمن شاء اتخذ الی ربہ مآبًا)۔

یعنی اس محرک کے تمام اسباب فراہم ہیں جو خدا کی طرف رجوع کے لیے ہے اور راستے اور کنویں دکھائے جا چکے ہیں۔ انبیاء نے کافی حد تک فرمانِ حق کی تبلیغ کی ہے اور عقلِ انسانی نے بھی جو اس کے اندر کا پیغمبر ہے۔ سرکشوں اور پرہیزگاروں کی سرنوشت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے۔ عدالت، مظلوم اور قاضی بھی معین ہو چکے ہیں۔ اکیلی چیز جو باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان دو ٹوک فیصلہ کرے اور اس اختیار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو خدا نے اسے دیا ہے راستے کا انتخاب کرے اور آگے بڑھے۔

"مآب" کے معنی محل بازگشت ہیں۔ یہ راستے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اس کے بعد مجرمین کی سزا کے مسئلہ پر تاکید کے عنوان سے اور اس عظیم دن کے ان لوگوں سے نزدیک ہونے کو بیان کرتے ہوئے جو اسے دور سمجھتے ہیں، یا اس کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔

مزید فرماتا ہے: "ہم تمہیں قریب کے عذاب سے ڈراتے ہیں (انا انذرناکم عذابًا قریبًا)۔ دنیا کی عمر جتنی بھی ہے آخرت کی عمر کے مقابلے میں ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہے نیز عربوں کی مشہور ضرب المثل کے مطابق "جو یقیناً" آئے گی وہ نزدیک ہے" (کل ما ھو آت قریب)

اسی لیے سورہ معارج کی آیت پانچ سے لے کر سات تک خدا اپنے پیغمبرؐ سے فرماتا ہے: (فاصبر صبرًا جمیلًا انھم یرونہ بعیدًا ونراہ قریبًا) صبر کر۔ صبر جمیل جو ہر قسم کے جزع و فزع سے خالی ہو۔ وہ اس دن کو دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے نزدیک دیکھتے ہیں۔

امیرالمومنین علیؑ بھی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: (کل آت قریب دان) ہر وہ چیز جو آنے والی ہے قریب ہے[1]

کیوں نزدیک نہ ہو جبکہ عذاب الٰہی کا اصل سبب خود انسانوں کے اعمال ہیں جو ہمیشہ ان کے ساتھ ہیں اور جہنم نے ابھی سے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے (وان جھنم لمحیطۃ بالکافرین) (عنکبوت/۵۴)۔ اور چونکہ اس دن ایک گروہ عظیم حسرت و اندوہ میں غرق ہوتے ہوئے نادم و پشیمان ہوگا اور جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

اس تنبیہ کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ عذاب اس دن واقع ہوگا جس دن انسان جو کچھ اپنے ہاتھ سے آگے بھیج چکا ہے وہ سب دیکھے گا اور کافر کہے گا (اے کاش میں مٹی ہوتا)۔ (یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۳۔

ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابًا)۔

مفسرین کی ایک جماعت "ینظر" کے لفظ کی اس آیت میں "ینتظر" کے معنی میں تفسیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ مراد یہ ہے کہ انسان اس دن اپنے اعمال کی جزاء کے انتظار میں ہے۔ بعض اسے نامہ اعمال کے مشاہدہ اور نیکیوں اور برائیوں کے دیکھنے کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اعمال کی جزاء وسزا کا مشاہدہ ہے۔

یہ سب تفسیریں یہاں سے پیدا ہوتی ہیں کہ انہوں نے مسئلہ حضور یعنی اعمالِ انسان کی اس دن تجسیم کی طرف بہت کم توجہ دی ہے ورنہ اس واقعیت کی طرف توجہ کی صورت میں آیت کا مفہوم واضح ہے اور کسی قسم کی تقدیر وتاویل کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ قرآن کی مختلف آیات اور اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال اس دن مناسب صورتوں میں مجسم ہوکر اس کے سامنے ظاہر ہوں گے۔ وہ حقیقتاً اپنے اعمال کو دیکھے گا اور اپنے بُرے اعمال کے منظر کے مشاہدہ سے وحشت وندامت محسوس کرے گا اور حسرت میں ڈوب جائے گا اور اپنے حسنات کو دیکھنے سے شاد ومسرور ہوگا اور اصولی طور پر نیکوکاروں کا بہترین اجر اور بدکاروں کی مناسب ترین سزا ان کے مجسم اعمال ہیں جو ان کے ساتھ ساتھ ہوں گے۔

سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہم پڑھتے ہیں: (ووجدوا ما عملوا حاضرًا) "جو کچھ وہ انجام دیتے تھے اسے حاضر پائیں گے"۔ اور سورہ زلزال کی آخری آیات میں آیا ہے (فمن یعمل مثقال ذرة خیرًا یرہ ومن یعمل مثقال ذرة شرًّا یرہ) جس شخص نے ذرہ برابر بھی نیک کام کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی بُرا کام کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا۔

اور روزِ قیامت کے عجائبات میں سے ہے کہ وہاں انسان کے اعمال مجسم ہوں گے اور قوتیں مادہ میں تبدیل ہوکر جاندار ہو جائیں گی (قدمت یداہ)۔ "اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے" کی تعبیر اس لیے ہے کہ انسان زیادہ تر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتا ہے۔ لیکن مسلّم ہے کہ صرف ہاتھ کے اعمال پر منحصر نہیں ہے بلکہ جو کچھ وہ زبان، آنکھ اور کان سے بھی انجام دیتا ہے وہ سب اس قانون کے ذیل میں ہے۔

قرآن اس دن کے آنے سے پہلے ہمیں خبردار کرتا ہے اور کہتا ہے ہر شخص کو دیکھنا چاہیئے کہ اس دن کے لیے اس نے آگے کیا بھیجا ہے (ولتنظر نفس ما قدمت لغد) (حشر/۱۸)۔

بہرحال بعد اس کے کہ کفار اپنی عمر کے تمام اعمال کو اپنے سامنے موجود پائیں گے اسی غم واندوہ وحسرت میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور کہیں گے کاش ہم خاک ہوتے۔ کاش ابتدا میں ہم خاک کے مرحلہ سے اوپر نہ جاتے۔ جماد سے نامی (نشوونما کرنے والے نباتات) اور نامی سے حیوان اور حیوان سے انسان نہ بنتے اور کاش بعد اس کے کہ ہم انسان ہوگئے اور مرگئے تو مرنے اور خاک ہونے کے بعد قیامت میں نئی زندگی حاصل نہ کرتے۔

البتہ وہ جانتے ہیں کہ مٹی بھی ان سے بہتر ہے کیونکہ مٹی ایک دانہ لیتی ہے اور کبھی کبھی سو دانے واپس کرتی ہے۔ انواع و اقسام کے غذائی مواد، معدنیات اور بہت سی برکتوں کا منبع و سرچشمہ ہے۔ مٹی انسان کا بستر اور اس کی زندگی کا گہوارہ ہے اور بغیر اس کے کہ اس میں کوئی ضرر ہو وہ یہ سب فوائد لیے ہوئے ہے لیکن وہ مٹی کے فوائد میں سے ایک بھی نہیں رکھتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بہت سی خرابیوں کی کان ہیں۔

جی ہاں! اس انسان کا کام جو اشرف المخلوقات ہے بعض اوقات کفر و گناہ کی بنیاد بنتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ آرزو کرتے ہیں کہ وہ کسی بے روح اور پست مخلوق کی صف میں کھڑے ہوتے۔ آیاتِ قرآنی میں ہم پڑھتے ہیں کہ کفار اور مجرم جب قیامت میں پروردگار کی دادرسی کا منظر اور اعمال کی جزا کا مشاہدہ کریں گے تو وہ کئی عکس العمل دکھائیں گے جو ان کی شدتِ تاثر و تاسف کی ترجمانی کریں گے۔

کبھی کہیں گے وائے ہو ہم پر اور ہماری اس حسرت پر کہ ہم نے فرمانِ خداوندی کی اطاعت میں کوتاہی کی (یاحسرتٰی علٰی ما فرطت فی جنب اللہ) (زمر/۵۶)۔ اور کہیں گے خداوندا! ہمیں دنیا کی طرف پلٹا تاکہ ہم عمل صالح کرسکیں۔ (فارجعنا نعمل صالحًا) (الم سجدہ/۱۲)۔ اور کبھی کہیں گے کاش ہم خاک ہوتے اور کبھی زندہ نہ ہوتے، جیسا کہ زیرِ بحث آیات میں آیا ہے۔

ایک نکتہ

مسئلہ جبر و اختیار کے حل ہونے کا واضح راستہ

یہ مسئلہ قدیم ترین مسائل میں سے ہے جو علماء کو درپیش ہے کہ ایک گروہ ارادۂ انسانی کا قائل ہے۔ دوسرا گروہ جبر کا طرفدار ہے اور ہر ایک گروہ نے اپنے مقصد کو ثابت کرنے کے لیے کچھ دلائل پیش کیے ہیں، لیکن جاذبِ توجہ یہ ہے کہ "جبریین" اور اختیار کے طرف دونوں ہی عمل میں اصل اختیار اور ارادہ کی آزادی کو قانونی طور پر قبول کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ساری بحثیں مباحثِ علمی کے دائرہ میں تھیں، نہ کہ مقامِ عمل میں، اور یہ چیز اچھی طرح سے بتاتی ہے کہ اصل ارادہ کی آزادی اور اختیار تمام انسانوں کا فطری ہے۔

اگر درمیان میں مختلف وسوسے نہ ہوں تو تمام لوگ آزادیٔ ارادہ کے معترف ہوں۔ یہ عمومی وجدان اور فطرت جو اختیار کے دلائل میں سب سے زیادہ واضح ہے انسان کی زندگی میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ اگر انسان خود کو اپنے اعمال کے بارے میں مجبور سمجھتا اور اپنے لیے اختیار کا قائل نہ ہوتا تو ایسا کیوں ہے کہ:

۱۔ ان اعمال کی بنا پر جنہیں انجام دیا یا ان اعمال کی بنا پر جنہیں انجام نہیں دیا، پشیمان ہوتا ہے اور پختہ ارادہ کرتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔ یہ حالتِ ندامت عقیدۂ جبر کے قائلوں میں زیادہ ہے اگر اختیار نہیں ہے تو ندامت کیوں؟

۲۔ بدکاروں کو سب لوگ ملامت و سرزنش کرتے ہیں اگر جبر ہے تو یہ سرزنش کیسی؟

۳۔ نیکوکاروں کی مدح و تعریف و ستائش کرتے ہیں۔ کیوں؟

۴۔ اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرتے ہیں کہ وہ سعادت مند ہوں۔ اگر سب مجبور ہیں تو پھر تعلیم کیا مفہوم رکھتی ہے؟

۵۔ معاشرہ کے اخلاق کو بلند کرنے کے لیے سب عملاً بغیر استثناء کوشش کرتے ہیں۔

۶۔ انسان اپنی خطاؤں اور غلطیوں سے توبہ کرتا ہے۔ اصل جبر کو قبول کر لینے کی صورت میں توبہ کیا معنی رکھتی ہے؟

۷۔ انسان اپنی کوتاہیوں پر حسرت کرتا ہے، آخر کیوں؟

۸۔ ساری دنیا بدکاروں اور مجرموں کا محاسبہ کرتی ہے اور ان سے شدید طور پر باز پرس ہوتی ہے وہ کام جو اختیار سے باہر ہے اس کی باز پرس اور محاکمہ کیسا؟

۹۔ ساری دنیا اور تمام اقوام عالم کے درمیان عام اس سے کہ وہ خدا پرست ہوں یا مادیئین یہ طے ہے کہ وہ مجرموں کے لیے سزا کے قائل ہیں۔ اس کام کی سزا کیسی جس پر وہ مجبور تھا۔

۱۰۔ یہاں تک کہ جبر کے حامی، جب کوئی شخص اُن کو گھٹائے اور ان کی برائی کرے اور حیثیت کو مجروح کرے تو فریاد کرتے ہیں اور اس کو قصور وار ٹھہراتے ہیں اور اسے عدالت میں لے جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر واقعی انسان کوئی اختیار نہیں رکھتا تو پھر پشیمانی کے کیا معنی ہیں اور ملامت و سرزنش کس لیے ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں رعشہ ہو اس کو ملامت کی جائے۔ نیکوکاروں کی تعریف کیوں کی جاتی ہے اور انہیں نیکی پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ کیا وہ اختیار رکھتے ہیں کہ شوق دلانے سے نیک کام کرنے لگیں گے؟ اصولی طور پر تعلیم و تربیت کی تاثیر کو قبول کر لینے کی صورت میں جبر اپنا مفہوم کھو بیٹھتا ہے؟

اس سے قطع نظر ارادہ کی آزادی کے بغیر اخلاقی مسائل کا بھی کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے کاموں میں مجبور ہیں تو توبہ کی کیا ضرورت ہے۔ حسرت و ندامت کس لیے ہے۔ شخص مجبور کا محاکمہ کرنا اور اسے عدالت میں لے جانا سب سے زیادہ ظالمانہ کام ہے اور اس کو سزا دینا اس سے محاکمہ زیادہ نامناسب ہے۔

یہ سب چیزیں بتاتی ہیں کہ ارادہ کی آزادی والی حقیقت سب انسانوں میں فطری ہے اور تمام نوع بشر کے وجدان کے موافق ہے۔ نہ صرف عوام بلکہ سارے خواص اور سب فلاسفہ عمل کی دنیا میں اسی طرح ہیں، یہاں تک کہ جبری بھی عمل میں اختیاری ہیں (الجبریون اختیاریون من حیث لا یعلمون)

قابل توجہ یہ کہ قرآن مجید نے بارہا اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ نہ صرف زیر بحث آیات میں فرماتا ہے: (فمن شاء اتخذ الی ربہ مآبا) جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستے کا انتخاب کر سکتا ہے۔ بلکہ دوسری آیات میں بھی انسان کے ارادہ پر بہت سے مقامات پر خصوصی روشنی ڈالی ہے جن سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

ہم صرف ذیل کی تین آیات پر اکتفا کرتے ہیں: (انّا ھدیناہ السبیل امّا شاکرًا و امّا کفورًا)۔ ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا ہے چاہے وہ قبول کرکے شکر گزار بنے یا مخالفت کرکے کفران کرے۔ (دہر/۳)۔ اور سورہ کہف کی آیت ۲۹ میں فرماتا ہے: (فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر)۔ "جو شخص چاہتا ہے ایمان لے آئے اور جو نہیں چاہتا وہ کفر کی راہ اختیار کرے"۔ نیز سورہ دہر کی آیت ۲۹ میں ہم پڑھتے ہیں (انّ ھٰذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلًا) یہ تذکرہ ہے جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستے کا انتخاب کرے۔

مسئلہ جبر و تفویض کے بارے میں گفتگو بہت طولانی ہے اور اس سلسلہ میں کئی کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں اور جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ صرف اس مسئلہ کی طرف قرآن و وجدان کے زاویہ سے نگاہ ڈالی ہے۔ اس گفتگو کو ہم ایک اہم نکتہ پیش کرکے ختم کرتے ہیں۔ ایک گروہ کا مسئلہ جبر کا قائل ہونا چند فلسفیانہ اور استدلال سے تعلق رکھنے والی مشکلات کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے نفسیاتی، اجتماعی اور معاشرتی اہم عوامل بھی بلاشک و شبہ اس عقیدہ کے پیدا ہونے اور باقی رہنے میں دخل رکھتے ہیں۔

بہت سے افراد نے جبر کے عقیدہ کو، یا جبری سرنوشت کو، یا اس قضا و قدر کو جس کے معنی میں جبر داخل ہے، اور جن سب کی ایک ہی بنیاد ہے، ذمہ داری اور جوابدہی سے بچنے کے لیے قبول کیا ہے، یا پھر اس عقیدہ کو اپنی ان ناکامیوں کے لیے ایک حجاب کے طور پر اپنایا ہے جو ذاتی کوتاہیوں اور سہل انگاری کی بنا پر سامنے آئی ہیں۔ یا پھر سرکش ہوا و ہوس پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے اختیار کیا ہے اور یہ نظریہ اپنا لیا ہے کہ ہمارے شراب پینے کو وہ ازل سے جانتا ہے اور ہم اسی لیے شراب پیتے ہیں تاکہ خدا کا علم جہالت میں نہ بدل جائے۔

بعض اوقات استعمار اور سامراج کی فضا میں پرورش پانے والے افراد کی قوت مقابلہ کو شکست دینے کے لیے اور مختلف اقوام و ملل کے قہر و غضب کی آگ کو بجھانے کے لیے بہت سے لوگ اس عقیدہ سے متوسل ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو دوسروں کی گردنوں پر نسوار کرتے ہیں کہ تمہاری تقدیر میں یہی تھا اور ظاہر ہے تسلیم و رضا کے علاوہ کوئی چارہ کار ہے ہی نہیں۔

اس طرز فکر کو قبول کر لینے سے تمام ظالموں کے اعمال کی توجیہ ہو جاتی ہے اور تمام گناہگاروں کے گناہ منطقی توجیہ پا لیتے ہیں اور مطیع و مجرم کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

خداوندا! ہمیں ان انحرافی عقائد اور ان کے نتائج سے محفوظ فرما۔ پروردگارا! ہمیں معلوم ہے کہ جہنم سرکشوں کے لیے مرصاد اور جنت متقیوں کے لیے کامیابی کی جگہ ہے۔ ہم سب کی چشم امید تیرے لطف و کرم پر لگی ہوئی ہے۔

بارالٰہا! وہ دن جس میں ہم اپنے تمام اعمال اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو ہمیں اس روز شرمندگی و شرمساری سے بچالیجو۔ آمین یارب العالمین۔

سورہ نبا کا اختتام

سورۂ نازعات

یہ سورہ مکی ہے

اس میں ۴۶ آیتیں ہیں۔

سورۂ نازعات کے مضامین اور اس کا دائرۂ فکر

یہ سورہ مثل سورہ نباء کے معاد کے مسائل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے اور مجموعۃً اس کا چھ حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے ایسی قسموں کے ساتھ تاکید جو مسئلہ معاد سے تعلق رکھتی ہیں، قیامت کے عظیم دن کے تحقّق پر تاکید کی گئی ہے۔

۲۔ اس سے بعد کے مرحلہ میں اس دن کے ہولناک اور وحشت ناک بعض مناظر کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ ایک اور حصّہ میں مختصر سا اشارہ حضرت موسیٰؑ کے قصّہ اور سرکش فرعون کی سرنوشت کی طرف ہے جو پیغمبر اور مومنین کی تسلّی کا باعث بھی ہے اور سرکش مشرکین کے لیے تنبیہ بھی اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ معاد و قیامت کا انکار انسان کو کن گناہوں میں گرفتار کرتا ہے۔

۴۔ بعد والے حصّہ میں آسمان و زمین قدرتِ خدا کے مظاہر کے کچھ نمونے ہیں جنہیں خود امکانِ معاد اور حیات بعد الممات کے لیے دلیل شمار کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ ایک مرتبہ پھر اس عظیم دن کے وحشت ناک حوادث اور سرکشوں کے انجام اور نیکوکاروں کے اجر کی تشریح کرتا ہے۔

۶۔ سورہ کے آخر میں اس حقیقت کی تاکید ہے کہ کوئی شخص بھی اس دن کی تاریخ سے باخبر نہیں ہے لیکن اس قدر مسلّم ہے کہ وہ نزدیک ہے۔

اس سورہ کے لیے نازعات کے نام کا انتخاب اس کی پہلی آیت کی وجہ سے ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے: (من قرأ سورة "والنازعات" لم یکن حبسه وحسابه یوم القیامة الّا کقدر صلوٰة مکتوبة حتّٰی یدخل الجنة)۔ "جو شخص سورہ نازعات کو پڑھے تو قیامت کے دن اس کا توقف و حساب روزانہ کی ایک نماز پڑھنے کی مقدار کے برابر ہوگا، اس کے بعد وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔"[1]

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۸۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :

(من قرأها لم يمت الاريان ولم يبعثه الله الا ريان ولم يدخله الجنة الا ريان)۔ "جو شخص اس سورہ کو پڑھے تو وہ اس دنیا سے سیراب ہو جائے گا اور خدا اسے سیراب ہی محشور کرے گا اور سیراب ہی جنت میں داخل کرے گا" (حق تعالیٰ کی رحمت بے پایاں سے سیراب) [1]

مسلّم ہے کہ جو شخص اس سورہ کے مضمون کو جس کی دل ہلا دینے والی آیتیں سوئی ہوئی ارواح کو بیدار کرتی ہیں اور انہیں ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں ، اپنے دل میں جگہ دے اور اس پر خلوص دل سے عمل کرے تو وہ مذکورہ اجر پائے گا۔ یقیناً وہ افراد اس اجر کو نہیں پا سکیں گے جو صرف الفاظ کے پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں ۔

---

[1] مجمع البیان ، جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۸ ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ
(۲) وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ
(۳) وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ
(۳) فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ
(۴) فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۘ

ترجمہ

خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

(۱) قسم ہے ان فرشتوں کی جو مُجرموں کی ارواح ان کے جسموں سے شدت کے ساتھ کھینچتے ہیں۔
(۲) اور وہ فرشتے جو مومنین کی ارواح نرمی و مدارات ونشاط کے ساتھ نکالتے ہیں۔
(۳) اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو حکمِ الٰہی کے اجراء میں تیزی سے چلتے ہیں۔
(۴) اور پھر ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔
(۵) اور وہ جو امور کی تدبیر کرتے ہیں۔

تفسیر

اُن انتھک فرشتوں کی قَسم

ان آیات میں پانچ موضوعات کی قسم کھائی گئی ہے اور ان قسموں کا مقصد مسئلہ معاد و قیامت کی حقانیت اور اس کے تحقق کو بیان کرنا ہے۔ فرماتا ہے: "ان کی قسم جو سختی سے کھینچتے اور اکھاڑتے ہیں"۔

(والنازعات غرقًا)۔
اور ان کی قسم جو راحت و آرام کے ساتھ جدا کرتے ہیں۔ (والناشطات نشطًا)۔
اور ان کی قسم جو سرعت و تیزی سے چلتے ہیں۔ (والسابحات سبحًا)۔
اور وہ جو اچھی طرح سبقت لے جاتے ہیں۔ (فالسابقات سبقًا)۔
اور وہ جو امور کی تدبیر کرتے ہیں۔ (فالمدبرات امرًا)۔

اس سے پہلے کہ ہم ان آیات کی تفسیر پیش کریں جو الفاظ ان میں استعمال ہوئے ہیں مناسب ہے کہ باریک بینی کے ساتھ ان کی وضاحت کی جائے۔

"نازعات"، "نزع" کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کو اس جگہ سے اکھاڑنا یا کھینچنا ہیں۔ مثلاً کمان کو تیر پھینکتے وقت کھینچنا۔ کبھی کبھی یہ لفظ معنوی امور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دل سے عداوت اور محبت کا نزع اس کے اکھاڑ پھینکنے کے معنی میں ہے[1]

"غرق" (ر کے زبر کے ساتھ) (بروزنِ شفق) بہت سے اربابِ لغت کے بقول پانی میں ڈوب جانے کے معنی دیتا ہے کبھی کبھی کسی شدید حادثہ میں مبتلا ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے اور غرق بروزن فرق بقول ابن منظور (در لسان العرب) ایک اسم ہے جو مصدر کا جانشین ہوا ہے اور اغراق کے معنی میں ہے اغراق کے معنی اصل میں آخری ممکن نقطہ تک کمان کو کھینچنے کے ہیں۔ اس کے بعد مبالغہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اوپر والی آیت میں آیا ہے وہ غرق ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ کسی کام کو اس کی ممکن حد تک انجام دینے کے معنوں میں ہے[2]

"ناشطات"، "نشط" (بروزن ہشت) کے مادہ سے اصل میں گرہ کھولنے کے معنی میں ہے جو آسانی سے کھل جاتی ہے۔ اور وہ کنویں جن کی گہرائی کم ہے اور ان میں سے ڈول آسانی سے ایک ہی دفعہ میں باہر آ جاتا ہے انہیں انشاط کہا جاتا ہے اور بطور کلی یہ لفظ ہر قسم کی اس حرکت کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سہولت کے ساتھ انجام پا جائے۔

"سابحات"، "سبح" (بروزن سطح) کے مادہ سے پانی یا ہوا میں سریع و تیز حرکت کے معنوں میں ہے۔ اس لیے پانی میں نہانے یا گھوڑے کے تیز چلنے یا تیزی سے کسی کام کے پیچھے جانے کو کہا جاتا ہے۔ تسبیح جو خدا کو ہر عیب و نقص سے پاک شمار کرنے کے معنی میں ہے، وہ بھی اسی سے لی گئی ہے۔ گویا جو شخص تسبیح کرتا ہے وہ پروردگار کی عبادت کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔

---

[1] مفردات راغب مادہ "نزع"۔
[2] کتاب لسان العرب، تفسیر مجمع البیان، تفسیر کشاف اور مجمع البحرین سے رجوع کیا جائے۔

"سابقات" سبقت کے مادہ سے، آگے نکل جانے کے معنی میں ہے۔ چونکہ گوئے سبقت لے جانا عام طور پر تیز چلنے کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لیے کبھی کبھی اس مادہ سے سرعت اور تیزی کے مفہوم کا فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔

"مدبرات" تدبیر کے مادہ سے کسی چیز کی عاقبت اور انجام کے بارے میں غور و فکر کرنا اور سوچنا ہے۔ چونکہ عاقبت اندیشی اور آئندہ کے بارے میں سوچنا کام کے احسن طریقہ پر انجام پانے کا سبب ہوتا ہے لہٰذا لفظ تدبیر اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اب اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو کچھ ان آیات کے الفاظ کے معنی کے بارے میں کہا گیا ہے ہم تفسیر کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ یہ پانچ قسمیں جو ابتدا میں ابہام کے ہالے میں گھری ہوئی ہیں اور ابہام بھی ایسا جو بہت زیادہ غور و فکر کا متقاضی ہے، ذہن و فکر کو نئی جولانی عطا کرتا ہے اور باریک بینی و مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے، وہ یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ یہ افراد یا چیزوں کی طرف اشارہ ہیں۔

مفسرین نے اس سلسلہ میں بہت کچھ گفتگو کی ہے اور بہت سی تفسیریں کی ہیں جن میں سے عمدہ تفسیریں تین محوروں کے گرد گھومتی ہیں۔

۱۔ ان قسموں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار و مجرمین کی ارواح کو قبض کرنے پر مامور ہیں جو ان روحوں کو بڑی شدت سے کفار و مجرمین کے جسموں سے نکالیں گے۔ وہ ارواح و نفوس جو حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھے اور وہ فرشتے جو مومنین کی روحیں قبض کرنے پر مامور تھے جو مدارات، نرمی اور نشاط کے ساتھ انہیں جدا کرتے ہیں۔ وہ فرشتے جو فرمانِ الٰہی کے اجرا میں سرعت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں اور پھر ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو امورِ عالم کی اس کے فرمان کے ماتحت تدبیر کرتے ہیں۔

۲۔ یہ قسمیں اشارہ ہیں آسمان کے ستاروں کی طرف جو ہمیشہ ایک افق سے اکھاڑے جاتے ہیں اور دوسرے افق کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ آہستہ آہستہ چلتا ہے اور دوسرا گروہ تیزی سے راستہ طے کرتا ہے۔ یہ سب عالمِ بالا کے سمندر میں تیر رہے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں اور آخر کار ان تاثیروں کی بنا پر جو ان ستاروں میں ہے (جیسے سورج اور چاند کے نور کی تاثیر کرہ زمین میں) وہ خدا کے فرمان سے امورِ جہان کی تدبیر کرتے ہیں۔

۳۔ مراد جنگجو، غازی یا مجاہدینِ راہ خدا کے گھوڑے ہیں جو اپنے گھروں اور وطنوں سے اکھڑ جاتے ہیں اور جدا ہو جاتے ہیں اس کے بعد نشاط، نرمی اور آرام کے ساتھ میدانِ جنگ کا رخ کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں اور جنگی امور کی تدبیر کرتے ہیں۔

بعض اوقات کچھ مفسرین نے ان تفاسیر کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔ پانچ قسموں میں سے کچھ کو ایک تفسیر سے اور دوسرے حصہ کو دوسری تفسیر سے لیا ہے لیکن کلام کی بنیاد وہی مذکورہ

بالاتین تفسیریں ہیں[1] جن کے درمیان کوئی تضاد موجود نہیں ہے۔

لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اوپر والی آیات سے ان سب کی طرف اشارہ ہو لیکن ان سب میں سے پہلی تفسیر ان نکات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو ذیل میں درج کیے جائیں گے، زیادہ مناسب ہے۔ پہلے یہ کہ یہ تفسیر روزِ قیامت سے مناسبت رکھتی ہے جیسا کہ سورہ کی تمام آیات اس مفہوم کو لیے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سورہ مرسلات کی ان ہی جیسی آیات سے مناسبت رکھتی ہیں جو آغاز میں ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ (فالمدبرات امرًا) کا جملہ زیادہ تر فرشتوں سے مناسبت رکھتا ہے جو امرِ خدا سے کاروبارِ جہاں کی تدبیر کرتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کے اوامر کی انجام دہی سے روگردانی نہیں کرتے (لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون) (انبیاء/۲۷)۔ خصوصاً یہ کہ تدبیرِ امور کا مسئلہ یہاں بصورتِ مطلق بیان ہوا ہے اور اس میں کوئی قید و شرط نہیں لگائی گئی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ائمہ معصومین سے کچھ روایات ان آیات کی تفسیر میں مروی ہیں جو انہی معانی سے مناسبت رکھتی ہیں۔ منجملہ دیگر روایات کے ایک روایت ہمیں حضرت علیؑ کی ملتی ہے کہ آپ نے (والنازعات غرقًا) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: "اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار کی روحیں نہایت شدت کے ساتھ ان کے جسموں سے نکالیں گے جس طرح تیر انداز کمان کو آخری مرحلہ تک کھینچتا ہے"[2]

ایسے ہی معانی انہی جناب سے والناشطات، والسابحات اور فالمدبرات کی تفسیر میں نقل ہوئے ہیں[3]

البتہ اسی تفسیر کو زیادہ کلّی اور زیادہ عمومی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مومنین اور کفار کی روحوں کا قبض ہونا ممکن ہے کہ اس کا ایک مصداق ہو لیکن اس کے تمام مضامین کو صرف اسی عنوان میں محدود کر دینا مناسب نہیں جیسا کہ اس طرح کہا جائے کہ ان قسموں سے مراد تمام تر وہ فرشتے ہیں جو خدا کے تمام اوامر کا اجرا

---

[1] بعض نے چوتھا احتمال پیش کیا ہے۔ موجودات کی طبیعی ارادی اور صنعتی حرکتوں کی قسم مراد لیا ہے، مثلاً ایک نطفہ اپنی اصلی جگہ جو باپ کا صلب ہے وہاں سے اکھڑ کر رحمِ مادر میں داخل ہو کر قرار پاتا ہے تو اپنی رفتار کو آہستہ آہستہ جاری رکھتا ہے پھر تیز ہو جاتا ہے اور نطفے کے موادِ حیاتی ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں اور آخر کار مکمل انسان بنا دیتے ہیں اور اس کی تدبیر کرتے ہیں۔ حرکاتِ ارادی میں بھی انسان پہلے ارادہ کرتا ہے پھر آہستہ سے چل پڑتا ہے پھر تیز ہو جاتا ہے پھر کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے سبقت حاصل کرے۔ آخر میں اپنے امر اور اجتماعی زندگی کی تدبیر کرتا ہے۔ اسی طرح صنعتی وسائل مثلاً ہوائی جہاز اپنی حرکت میں ان تمام مراحل کو طے کرتا ہے۔ (لیکن اس تفسیر کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔)

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۹۷ حدیث ۴۔

[3] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۹۷ حدیث ۷، ۸، ۱۲۔

کرتے ہیں اور یہ اجرا پانچ مرحلوں میں تحقق پاتا ہے۔

پہلا مرحلہ پہلی شدید حرکت اور دو ٹوک ارادہ اور فیصلہ اس کے بعد آہستہ آہستہ چل پڑنا، پھر اس میں سرعت اور تیزی اور ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنا اور آخر میں امور کی تدبیر اور کاموں کو ترتیب دینا۔ لیکن بہرحال فرشتوں کا پروگرام کفار و مومنین کی ارواح کو قبض کرنے کے سلسلہ میں اس مفہوم کلّی کا ایک مصداق ہے اور سورہ کے آئندہ مباحث کے لیے ایک تمہید شمار ہوتا ہے جو معاد کے بارے میں ہیں۔

دو سوالوں کا جواب

یہاں دو سوال باقی رہ جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ نازعات اور ناشطات جمع مؤنث ہیں تو کس مناسبت سے یہاں استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ پہلی قسم واوِ قسم کے ساتھ شروع ہوئی ہے لیکن چوتھی اور پانچویں قسم میں اس کی جگہ 'ف' ہے جو عطف یا تفریع کے لیے آتی ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں اس نکتہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کہ نازعات نازعۃ کی جمع ہے جس کے معنی فرشتوں کے ایک طائفہ کے ہیں جو اس پروگرام کو انجام دیتا ہے۔ اسی طرح "ناشطات" اور باقی جمع کے صیغے اور چونکہ طائفہ ایک مؤنث لفظی ہے لہٰذا اس کی جمع اسی شکل میں آئی ہے۔

دوسرے سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ سبقت لے جانا حرکتِ سریع کا نتیجہ ہے جو سابحات سے معلوم ہوتی ہے اور تدبیرِ امور بھی اسی مجموع حرکت کا نتیجہ ہے۔

آخری بات جو یہاں کہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ یہ تمام قسمیں ایک مطلب کو بیان کرنے کے لیے ہیں جو صراحت کے ساتھ آیت میں بیان نہیں ہوا لیکن قرینۂ کلام سے بعد والی آیات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ کہے "ان امور کی قسم تم سب آخرکار مبعوث و محشور ہو گے اور قیامت و معاد حق ہے"[1]

[1] تقدیر میں اس طرح ہے "لتبعثن یوم القیامۃ ولتحشرن ولتحاسبن"۔

(۶) يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ
(۷) تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۭ
(۸) قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ
(۹) اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ
(۱۰) يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۭ
(۱۱) ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۭ
(۱۲) قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ
(۱۳) فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ
(۱۴) فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۭ

ترجمہ

(۶) جس دن وحشتناک زلزلے ہر چیز کو لرزا دیں گے۔
(۷) اور اس کے پیچھے دوسرا حادثہ (صیحہ عظیم) رونما ہوگا۔
(۸) دل اس روز سخت مضطرب ہوں گے۔
(۹) اور ان کی آنکھیں خوف کی شدت کی وجہ سے دھنسی ہوئی ہوں گی۔
(۱۰) (لیکن آج) وہ کہتے ہیں کیا ہم نئی زندگی کی طرف پلٹ جائیں گے؟
(۱۱) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے (ممکن ہے کہ ہم زندہ ہوں؟)۔
(۱۲) وہ کہتے ہیں اگر قیامت ہے تو نقصان دہ بازگشت ہے۔

(۱۳) لیکن یہ بازگشت صرف ایک عظیم صیحہ سے واقع ہوگی۔

(۱۴) اچانک سب کے سب زمین پر ظاہر ہو جائیں گے۔

تفسیر

معاد صرف ایک عظیم صیحہ سے رونما ہوگا

بعد اس کے کہ قیامت کا وقوع گزشتہ آیات میں تاکیدی قسموں کے ساتھ ایک امر حتمی و یقینی کی صورت میں بیان ہوا، زیر بحث آیات میں اس عظیم دن کی بعض نشانیوں اور حوادث کی تشریح کر کے فرماتا ہے:

"یہ قبروں سے اٹھنا ایسے دن ہوگا جس میں وحشتناک زلزلے ہر چیز کو لرزہ براندام کر دیں گے" (یوم ترجف الراجفة)۔ پھر دوسرا عظیم حادثہ رونما ہوگا (تتبعها الرادفة)۔

"راجفہ" "رجف" (بروزن کشف) کے مادہ سے اضطراب اور شدید لرزے کے معنوں میں ہے اور چونکہ فتنہ انگیز خبریں معاشرہ کے اضطراب کا سبب ہوتی ہیں لہٰذا انہیں اراجیف کہتے ہیں۔

"رادفہ" "ردف" (بروزن حرف) کے مادہ سے ایسے شخص یا چیز کے معنوں میں ہے جو دوسری چیز یا شخص کے پیچھے ہو اسی لیے اس شخص کو جو مرکب پر دوسرے کے پیچھے بیٹھے اسے ردیف کہتے ہیں۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ راجفہ سے مراد وہی پہلا صیحہ ہے یا پہلے صور کا پھونکا جانا ہے جو عالم کو فنا کرنے والا ناقوس ہے اور ایسا زلزلہ ہے جو دنیا کو فنا کر کے رکھ دے گا اور رادفہ دوسرا صیحہ یا دوسرے صور کا پھونکا جانا ہے جس سے قیامت کا برپا ہونا اور نئی زندگی کی طرف بازگشت متعلق ہے[1]

اس بنا پر آیت اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں آئی ہے۔ (و نفخ فی الصور فصعق من فی السماوات و من فی الارض الا من شاء اللہ ثم نفخ فیہ اخری فاذا ھم قیام ینظرون) صور پھونکا جائے گا اور وہ تمام لوگ جو زمین اور آسمانوں میں ہیں مدہوش ہو جائیں گے اور مر جائیں گے سوائے اس کے جسے خدا چاہے گا۔

اس کے بعد دوبارہ صور پھونکا جائے گا اچانک سب کھڑے ہو کر حساب کے انتظار میں ہوں گے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ راجفہ اس زلزلے کی طرف اشارہ ہے جو زمین کو لرزہ براندام کر دے گا اور رادفہ وہ زلزلہ ہے

---

[1] توجہ کرنی چاہیئے کہ رجف کا مادہ فعل متعدی کی شکل میں بھی آتا ہے اور فعل لازم کی شکل میں بھی۔ پہلی شکل میں راجفہ اس عظیم زلزلے کے معنی میں ہے جس میں زمین اور تمام موجودات لرزنے لگیں گے۔ دوسری صورت میں راجفہ خود زمین کے معنوں میں ہے جو لرزنے لگے گی۔ (غور کیجئے)۔

جو آسمانوں کو درہم برہم کر دے گا لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس دن وہ دل سخت اور مضطرب ہوں گے" (قلوب یومئذ واجفة)۔ مجرموں، گنہگاروں اور سرکشی کرنے والوں کے دل شدید طور پر لرز رہے ہوں گے اور وہ حساب وکتاب اور جزا وسزا کے منتظر ہوں گے۔

"واجفه" "وجف" (بروزن حذف) کے مادہ سے اصل میں سرعتِ سیر کے معنی میں ہے اور "اوجفت البعیر" اس مقام پر کہا جاتا ہے جہاں انسان اونٹ کو بہت تیز چلانے لگے اور چونکہ تیز چلنا اضطراب کا باعث ہے اس لیے یہ لفظ شدتِ اضطراب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہ اندرونی اضطراب اس قدر شدید ہوگا کہ اس کے آثار گنہگاروں کے سارے وجود میں ظاہر ہوں گے۔ اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "ان کی آنکھیں شدتِ خوف و ہراس سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی" (ابصارها خاشعة)۔[1]

"اس دن آنکھیں دھنسی ہوئی ہوں گے اور حرکت نہیں کر سکیں گی اور خیرہ ہوں گی۔ گویا وہ لوگ شدتِ خوف سے اپنی نگاہ گم کر دیں گے۔ اب گفتگو کو قیامت سے دنیا کی طرف لے آیا ہے اور فرماتا ہے:

"ان سب چیزوں کے باوجود وہ اس دنیا میں کہتے ہیں کیا ہم دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے" (یقولون ءانّا لمردودون فی الحافرة)۔

"حافرہ" حفر کے مادہ سے زمین کے کھودنے کے معنی میں ہے اور جو اس کھودنے کا اثر باقی رہ جاتا ہے اسے حفر کہتے ہیں۔ گھوڑے کے سُم کو حافر کہتے ہیں اس لیے کہ وہ زمین کو کھودتا ہے۔ اس کے بعد حافرہ کنایہ کے طور پر پہلی حالت میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ انسان جس راستے سے جاتا ہے زمین کو اپنے پاؤں سے کھودتا ہوا جاتا ہے اور اس طرح اس کے پاؤں کے نشان باقی رہ جاتے ہیں، اور جب واپس لوٹتا ہے تو انہیں پہلے نشانات پر قدم رکھتا ہے اس لیے یہ لفظ پہلی حالت کے معنی میں آیا ہے۔[2]

بعد والی آیت ان کی باتوں کو نقل کرتے ہوئے کہتی ہے کیا جس وقت ہم بوسیدہ اور پراگندہ ہڈیوں کی شکل میں ہو گئے تو دوبارہ زندگی کی طرف لوٹیں گے؟ (ءاذا کنا عظاما نخرة)۔[3]

---

[1] ابصارھا کی ضمیر قلوب کی طرف لوٹتی ہے جو یہاں نفوس وارواح کے معنی میں ہیں اور یہ اضافت اس بنا پر ہے کہ انسانی حواس کے تاثرات سب اس کی روح اور جان سے متعلق ہیں اور اضطراب و وحشت کا منبع جو آنکھوں میں ہے وہی وحشت ہے جو روح پر سایہ فگن ہے۔

[2] توجہ کرنی چاہیئے کہ اسم فاعل یہاں اسم مفعول کے معنی میں ہے اور حافرہ محفور کے معنی میں ہے۔

[3] اس جملہ میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے "(ءاذا کنا عظاما نخرة نرد احیاء) یا (وانا لمبعوثون)۔

یہ وہی چیز ہے جس پر منکرین معاد و قیامت ہمیشہ انحصار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ ریزہ ریزہ ہو جانے والی بوسیدہ ہڈی دوبارہ بدن میں لباس حیات پہنے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ اس صورت حال اور ایک زندہ وجود کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ دیکھتے تھے۔ وہ گویا فراموش کر چکے تھے کہ ابتدا میں بھی اسی خاک سے پیدا ہوئے تھے۔

"نخرہ" صفت شبہ ہے (نخر بروزن نخل) کے مادہ سے اور اسی طرح (بروزن شجر) اصل میں بوسیدہ اور کھوکھلے درخت کے معنوں میں ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ آواز دیتا ہے۔ وہ آواز جو ناک میں گردش کرتی ہے اُسے نخیر کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر بوسیدہ اور ٹوٹے پھوٹے وجود کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

منکرین معاد صرف اسی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ معاد کا مذاق اڑاتے ہیں اور تمسخر کے انداز میں کہتے ہیں "اگر قیامت ہوئی ہے تو نقصان دہ بازگشت کا سبب ہے ہماری حالت اس روز سخت اور دردناک ہوگی۔" (قالوا تلك اذاً كرة خاسرة)

دوسرا احتمال جو اس آیت کی تفسیر میں ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات مذاق کے طور پر نہیں بلکہ سنجیدگی سے کہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر دوبارہ زندگی کی طرف واپس لوٹنا ہے تو ایک فضول اور بے ہودہ قسم کا لوٹنا ہے اور یہ نقصان دہ ہے۔ اگر زندگی اچھی چیز ہے تو کیا ہی بہتر ہو کہ خدا اس زندگی کو باقی رکھے اور اگر بُری ہے تو پھر بازگشت کس لیے ہے۔ (اذا لمردودون فی الحافرة)

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "حافرہ" گڑھے کے معنوں میں ہے وہ بھی تفسیر کے لیے قرینہ بن سکتا ہے لیکن مفسرین کے درمیان جو مشہور ہے وہ پہلی تفسیر ہے۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ گزشتہ آیات میں "یقولون" کی تعبیر آئی ہے جو ان کی جانب سے اس بات کی تکرار اور استمرار کی نشانی ہے لیکن "قالوا" (انہوں نے کہا) کی تعبیر زیر بحث آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ اس بات کی وہ ہمیشہ تکرار نہیں کرتے تھے۔ یہ بات ان سے کبھی کبھار سرزد ہوتی تھی اور یہ نکتہ ہے اس تعبیر کے مختلف ہونے کا۔

ان آیات کے آخر میں ایک مرتبہ پھر قیام قیامت اور حشر کے برپا ہونے کے مسئلہ کی طرف رُخ کرتے ہوئے دو ٹوک اور سرکوبی کرنے والے انداز میں فرماتا ہے:

"یہ بازگشت صرف ایک صیحہ اور عظیم فریاد سے واقع ہوگی" (فانما ھی زجرة واحدة)۔ اچانک سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے (فاذا ھم بالساھرة)۔ یہ کام پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے جب بھی بحکم خدا دوسرا نفخہ پھونکا جائے گا اور زندگی کی اذان دی جائے گی تو تمام مٹی اور بوسیدہ ہڈیاں ایک ہی مرتبہ جمع ہو جائیں گی اور ان میں جان پڑ جائے گی اور سب قبروں سے نکل کر باہر آجائیں گے۔

"زجرة" اصل میں اس فریاد اور بلند آواز کے معنی میں ہے جو کسی کے ہانکنے کے لیے نکالی جاتی ہے اور

یہاں دوسرے نفخے کے معنوں میں ہے۔

"زجرة واحدة" کی تعبیر کا انتخاب ان دونوں الفاظ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے قیامت کے تیزی سے اور ناگہانی طور پر برپا ہونے اور خدا کی قدرت کے سامنے اس کے نہایت آسان ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ قیامت کے فرشتے یا صور اسرافیل کی ایک تحکمانہ آواز مُردوں کے بدن کو زندگی کا لباس پہنائے گی اور وہ عرصۂ حشر میں حساب کتاب کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔

"ساهرة" "سهر" (بروزن سحر) کے مادہ سے شب بیداری کے معنوں میں ہے اور چونکہ وحشت ناک حوادث رات کی نیند اڑا دیتے ہیں، پھر قیامت کی زمین نہایت دہشت انگیز ہے اس لیے عرصۂ حشر کے لیے لفظ "ساهرہ" صرف کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "ساهرہ" ہر بیابان کو کہتے ہیں چونکہ عموماً طور پر تمام بیابان وحشت ناک ہوتے ہیں گویا وحشت کی بنا پر رات کی نیند اڑا دیتے ہیں[1]

---

[1] لسان العرب مادہ سھر اور مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۲۹، تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۶۹۹۔

(۱۵) هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ
(۱۶) اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۚ
(۱۷) اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۖ
(۱۸) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۙ
(۱۹) وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۚ
(۲۰) فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۖ
(۲۱) فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۖ
(۲۲) ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۖ
(۲۳) فَحَشَرَ فَنَادٰى ۖ
(۲۴) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۖ
(۲۵) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۗ
(۲۶) اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۗ

ترجمہ

(۱۵) کیا تجھ تک موسٰی کی داستان پہنچی ہے ؟
(۱۶) جس وقت اس کے پروردگار نے سرزمینِ مقدس طوی میں اس کو پکارا اور کہا ۔
(۱۷) فرعون کی طرف جا کہ وہ سرکش و طاغی ہو گیا ہے ۔

(۱۸) اور اس سے کہہ کیا تُو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے۔

(۱۹) اور مَیں تجھے تیرے پروردگار کی طرف ہدایت کروں۔

(۲۰) اس کے بعد موسٰی نے اسے عظیم معجزہ دکھایا۔

(۲۱) لیکن اس نے تکذیب اور نافرمانی کی۔

(۲۲) پھر پشت پھیری اور اس نے (دینِ موسٰی کے مٹانے کی) مسلسل کوشش کی۔

(۲۳) اور جادوگروں کو جمع کیا اور لوگوں کو دعوت دی۔

(۲۴) اور کہا مَیں تمہارا بہت بڑا پروردگار ہوں۔

(۲۵) اس لیے خدا نے اسے آخرت کے اور دنیا کے عذاب میں گرفتار کیا۔

(۲۶) اس میں عبرت ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔

تفسیر

فرعون کہتا تھا کہ مَیں تمہارا بہت بڑا خدا ہوں

نسبتاً تفصیلی بیانات کے بعد جو گزشتہ آیات میں مسئلہ معاد اور مشرکین کے انکار و مخالفت کے بارے میں آئے تھے زیرِ بحث آیات میں تاریخ کے ایک بہت بڑے سرکش یعنی فرعون اور اس کی دردناک سرنوشت کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ مشرکینِ عرب بھی جان لیں کہ ان سے زیادہ طاقتور افراد بھی خدا کے غضب اور عذاب کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہ لا سکے' اور وہ مومنین کو بھی جوش دلائے کہ وہ دشمن کی ظاہری طاقت کی برتری سے دل میں خائف نہ ہوں اس لیے کہ ان کو درہم برہم کرنا اور ان کی سرکوبی کرنا خدا کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ پہلے یہاں سے شروع کرتا ہے:

"کیا تجھ تک موسٰی کی داستان پہنچی ہے؟" (ھل اتاك حدیث موسٰی)۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے مقصدِ کلام کو استفہام کے ساتھ شروع کرتا ہے تاکہ سننے والے کے شوق کو بیدار کرے اور وہ اس عبرتناک داستان کو سننے کے لیے آمادہ ہو۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"جس وقت اس کے پروردگار نے اسے سرزمینِ مقدس طویٰ میں پکارا" (اذ نادٰہ ربہ

بالواد المقدس طوی)[1]

"طوی" ہوسکتا ہے کہ مقدس سرزمین کا نام ہو جو شام میں مدین ومصر کے درمیان واقع تھی اور وحی کا پہلا شعلہ اسی بیابان میں موسیٰؑ کے دل پر نازل ہوا۔ یہی تعبیر سورہ طٰہٰ میں بھی آئی ہے جہاں موسیٰؑ ایک ندا سنتے ہیں جو کہتی ہے: (انی انا ربك فاخلع نعلیك انك بالواد المقدس طوی) "میں تیرا پروردگار ہوں۔ اپنے جوتے اتار دے کہ تُو وادی مقدس طویٰ میں ہے" (طٰہٰ/۱۲)۔

یا طویٰ طی کے مادہ سے ہے اور وصفی معنی رکھتی ہے جو لپیٹنے کے معنی میں ہے گویا وہ زمین پاکیزگی و برکت میں لپٹی ہوئی ہے، یا راغب کے بقول ضروری تھا کہ حضرت موسیٰؑ ایک طولانی راستہ طے کریں یہاں تک کہ وحی کے لیے آمادہ ہوں لیکن خدا نے اس راستے کو ان کے لیے لپیٹ دیا تھا اور اس کو مقصد کے قریب کر دیا تھا۔

اس کے بعد وہ پیغام جو خدا نے موسیٰؑ کو اس سرزمین مقدس میں دیا تھا اس کی طرف دو مختصر اور پُرمعنی جملوں میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"فرعون کی طرف جا کہ اس نے سرکشی کی ہے" (اذھب الی فرعون انه طغٰی)۔ "اور اس سے کہہ کیا تُو چاہتا ہے کہ پاک و پاکیزہ ہو جائے" (فقل ھل لك الی ان تزکّٰی)۔ اور پاک ہونے اور محبوب کی ملاقات کے قابل ہونے کے بعد میں اپنے پروردگار کی طرف تجھے ہدایت کروں تاکہ تُو اس سے ڈرے اور غلط استعمال سے الگ ہو جائے۔ (واھدیك الی ربك فتخشٰی)۔

چونکہ ضروری ہے کہ ہر دعوتِ فکر دلیل کے ہمراہ لائے اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "موسیٰ نے اس گفتگو کے بعد اس کو عظیم معجزہ دکھایا" (فاراہ الاٰیة الکبرٰی)[2]

یہ معجزہ چاہے عصا کا عظیم اژدہے میں تبدیل ہونا ہو، یا ید بیضا ہو، یا دونوں ہوں (اس بنا پر الف لام (الاٰیة الکبرٰی) میں جنس کی طرف اشارہ ہو) جو کچھ جو بھی تھا موسیٰؑ کے عظیم معجزات میں سے تھا کہ جس پر آغاز تبلیغ میں انحصار کیا ہے۔ ان چار آیات میں جاذبِ نظر نکات یہ ہیں جن کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ فرعون کی طرف جانے کی علت فرعون کی سرکشی ہے اور یہ چیز بتاتی ہے کہ انبیاء کے مبعوث ہونے کا ایک عظیم مقصد سرکشی کرنے والوں کی ہدایت یا ان کے ساتھ دوٹوک مبارزہ تھا۔

---

[1] بہت سے مفسرین نے اذ کو حدیث کے لیے ظرف زمان سمجھا ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں صحیح ہے کہ جب حدیث خود حادثہ کے معنی میں ہو نہ کہ حادثہ کی حکایت کے معنی میں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اذ فعل محذوف کے لیے ظرف ہو اور تقدیر میں (اذکر اذ ناداہ ...) ہو۔ (غور کیجئے)۔

[2] مسلم ہے کہ اس وادی مقدس میں اس خطابِ الٰہی اور اس عظیم معجزے کے دکھانے کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا قرآن نے اختصار کے پیش نظر دوسرے مطالب یہاں حذف کر دیئے ہیں اور وہ سب تقدیر میں ہیں۔

۲۔ فرعون کو دعوتِ فکر دینے کے لیے نہایت نرم اور خیر خواہانہ تعبیر کے ساتھ حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے "اس سے کہہ کیا تو مَیل اور رغبت رکھتا ہے کہ تُو پاک و پاکیزہ ہو جائے (مطلق پاکیزگی جو شرک و کفر سے پاکیزگی بھی ہے اور ظلم و فساد کی ناپاکی سے بھی) اس تعبیر کے مشابہ جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۴۴ میں آئی ہے (فقولا قولًا لینًا) "اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرو"۔

۳۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ انبیاء کی رسالت کا مقصد انسانوں کا پاک کرنا ہے ان کی طرف پہلی فطری طہارت کو لوٹانا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ مَیں تجھے پاک کروں بلکہ کہتا ہے کہ تُو پاکیزگی کو قبول کر یہ جملہ بتاتا ہے کہ پاک ہونا اپنی خواہش کے نتیجے میں ہو نہ یہ کہ باہر سے اس پر یہ بات لادی جائے۔

۴۔ پاک ہونے کے بعد ہدایت کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے خود کو پاک و صاف کیا جائے کُوئے دوست میں قدم رکھا جائے۔

۵۔ ربك (تیرا پروردگار) کی تعبیر حقیقت میں اس نکتہ کی تاکید ہے کہ مَیں تجھے ایسی ذات کی طرف جاؤں گا جو تیرا مالک، مربی اور پرورش کرنے والا ہے تو پھر کیوں راہِ سعادت سے گریز کرتا ہے۔

۶۔ خدا ترسی خدا کی طرف سے ہدایت کا نتیجہ ہے۔ جی ہاں شجر توحید و ہدایت کا ثمر یہی ہے کہ انسان جانے کہ اسے خدا کے سامنے حاضر ہو کر جوابدہ ہونا ہے، اس لیے کہ خوفِ خدا بھی معرفتِ خدا کے بغیر حاصل نہیں ہو اسی لیے تو سورہ فاطر کی آیت ۲۸ میں ہم پڑھتے ہیں (انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء) صرف علماء اور صاحبانِ معرفت ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔

۷۔ حضرت موسیٰؑ سب سے پہلے اس کی شفقت آمیز ہدایت کی طرف جاتے ہیں اس کے بعد عقلی و منطقی ہدایت کرتے ہیں بذریعہ آیت کبریٰ یعنی بہت بڑا معجزہ دکھا کر اور یہ مؤثر ترین راہِ تبلیغ ہے۔ پہلے خیر خواہی اور محبت کے انداز سے مقابل کو متاثر کرے اور پھر استدلال و حجت کے ساتھ اسے قائل کرے۔

اب دیکھیں کہ فرعون نے اس لطف و محبت اور اس منطق و بیانِ زیبا اور آیتِ کبریٰ کے دکھانے کے مقابلہ میں کیا رویہ اختیار کیا۔ یہ سرکش خیرہ سر ہر کبِ غرور سے بالکل نیچے نہیں اترا۔ اور جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے اس نے موسیٰؑ کی دعوتِ فکر کی تکذیب کی اور پروردگار کی نافرمانی کی (فکذب و عصیٰ)۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ تکذیب عصیان و نافرمانی کی تمہید ہوتی ہے جس طرح تصدیق ایمان و اطاعت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس پر بھی قناعت نہیں کی اور موسیٰؑ کی دعوتِ فکر کے مقابلہ میں وہ صرف الگ ہی نہیں بلکہ اس نے پشت پھیری اور بلا تامل موسیٰؑ سے لڑنے اور ان کے دین کو برباد کرنے کی کوشش کرنے (ثم ادبر یسعیٰ)[1]۔

---

[1] ثم کی تعبیر جو عام طور پر دو حادثوں کے درمیان فاصلہ کے لیے آتی ہے ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ فرعون نے ایک مدت کا فاصلہ ہو تاکہ اس کے موسیٰؑ سے مبارزہ کرنے کا نقشہ مکمل طور پر مضبوط اور تیار ہو جائے۔

اور چونکہ موسیٰؑ کا معجزہ اس کی ساری سرکشی کی طاقت کو خطرہ میں ڈالتا تھا اس لیے اس نے اپنے مامورین ہر شہر میں بھیجے تاکہ وہ جادوگروں کو جمع کریں اور لوگوں میں منادی کریں کہ وہ موسیٰ اور جادوگروں کا مقابلہ دیکھیں (فحشر فنادیٰ)۔

اگرچہ قرآن نے یہاں لفظ حشر کو مطلق بیان کیا ہے لیکن سورہ اعراف کی آیت ۱۱۱، ۱۱۲ (وارسل فی المدائن حاشرین یأتوک بکل ساحر علیم) کے قرینہ سے اور نادیٰ کی تعبیر سے جو اگرچہ مطلق ہے ظاہراً فرعون کے لوگوں کو جمع کرنے اور اس مقابلے کے منظر کو دیکھنے کی دعوت دینے کی طرف اشارہ ہے اور سورہ شعراء کی آیت ۳۹ (وقیل للناس ھل انتم مجتمعون) "اور لوگوں سے کہا گیا تم جمع ہو گے" کے قرینے سے بھی۔

پھر بھی ان سازشوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بدترین تعبیروں کے ساتھ عظیم ترین دعویٰ کرتے ہوئے کہا: میں تمہارا بہت بڑا پروردگار ہوں (فقال انا ربکم الاعلیٰ)۔

واقعی عجیب سی بات ہے کہ یہ خیرہ سر طاغی و سرکش جب مرکبِ غرور و تکبر و خود پرستی پر سوار ہوتے ہیں تو پھر کسی مقام پر رُکنے کا نام نہیں لیتے حتیٰ کہ دعویٰ خدائی پر بھی قناعت نہیں کرتے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ خداؤں کے خدا ہو جائیں۔

یہ بات ضمنی طور پر اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم بتوں کی پوجا کرتے ہو تو وہ اپنی جگہ پر محترم سہی لیکن میں افضل ترین ہوں اور تمہارا معبود ہوں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ فرعون سورہ اعراف کی آیت ۱۲۷ کی شہادت سے (اتذر موسیٰ و قومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک و الھتک) کیا تُو موسیٰ اور اس کی قوم کو اجازت دیتا ہے کہ وہ زمین میں فساد کریں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں۔

فرعون جو ایک بت پرست تھا لیکن یہاں دعویٰ کرتا ہے میں تمہارا بہت بڑا پروردگار ہوں یعنی وہ اپنے آپ کو اپنے معبود سے بھی بالاتر خیال کرتا ہے۔ یہ ہیں سرکشوں کی بیہودہ گوئیاں۔

اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک جگہ صرف الوہیت کا دعویٰ کرتا ہے (ما علمت لکم من الٰہ غیری)۔ میں اپنے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں جانتا۔ (قصص/۳۸)۔

لیکن زیرِ بحث آیت میں ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے میں تمہارا پروردگار ہوں۔ یہ ہے لائحہ عمل ان ہلکے دماغ والے مغروروں کا۔

بہرحال فرعون نے اپنی سرکشی کو آخری مرحلہ تک پہنچایا اور بہت زیادہ دردناک عذاب کا مستحق ہوا۔ فرمانِ الٰہی آن پہنچا اور وہ اور اس کی ظلم و فساد کی قوت درہم برہم ہو گئی۔ اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

خدا نے اسے دنیا اور آخرت کے عذاب میں گرفتار کیا (فاخذہ اللہ نکال الاٰخرۃ والاولیٰ) [1]

"نکال" (بروزن ضلال) کے معنی اصل میں ضعف و ناتوانی اور عجز کے ہیں۔ اسی لیے اس شخص کے بارے میں جو رقم کی ادائیگی کا حکم نہ دے، کہتے ہیں کہ اس نے نکول کیا۔ "نکل" (بروزن فکر) اس بھاری زنجیر کو کہتے ہیں جو انسان کو کمزور کر دے اور چلنے سے روک دے۔ چونکہ عذاب الٰہی بھی ناتوانی کا باعث ہے اور دوسرے افراد کو ارتکاب گناہ سے روکتا ہے اسی لیے اسے "نکال" کہا گیا ہے۔

"نکال الاٰخرۃ" کی تعبیر سے قیامت کے اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو فرعون اور اس کے پیروکاروں پر نازل ہوگا اور چونکہ وہ اہم ترین ہے لہٰذا اُسے مقدم سمجھا گیا ہے۔ اولیٰ سے مراد دنیاوی عذاب ہے جو فرعون پر نازل ہوا اور اس نے فرعون کے سب یار و انصار کو دریائے نیل میں غرق کر دیا۔

یہاں اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان ہوئی ہے اور وہ یہ کہ الاولیٰ سے مراد وہ پہلا کلمہ اور لفظ ہے جو فرعون نے اپنی سرکشی کے راستے میں کہا اور الوہیت کا دعویٰ کیا۔ (قصص/۳۸) اور "الاٰخرۃ" آخری کلمہ اور لفظ کی طرف اشارہ ہے جو اس نے کہا اور ربوبیت اعلیٰ کا دعویٰ کیا۔ خدا نے اسے ان دونوں کفر آمیز دعووں کی سزا اس دنیا میں دی۔

یہ معنی ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہیں۔ امام نے مزید فرمایا ہے کہ ان دونوں جملوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ تھا (اور خدا نے انتہائی اتمام حجت کے لیے) اس مدت میں اس پر عذاب نازل نہیں کیا۔ یہ تفسیر اخذ کے لفظ کے ساتھ، جو فعل ماضی ہے اور بتاتا ہے کہ یہ سزا مکمل طور پر دنیا میں واقع ہوئی اور اس کے بعد کی آیت جو اس واقعہ کو درسِ عبرت شمار کرتی ہے زیادہ موافق ہے۔

انجام کار آخری زیرِ بحث آیت میں اس واقعہ کی تکمیل سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس موسیٰ اور فرعون کی داستان اور اس کے انجام کو پہنچنے میں، ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں ایک عظیم درسِ عبرت ہے۔ (ان فی ذالک لعبرۃ لمن یخشیٰ)۔

یہ آیت اچھی طرح بتاتی ہے کہ اس قسم کے واقعات سے عبرت حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو خوفِ خدا اور احساسِ ذمہ داری کو دل میں جگہ دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عبرت حاصل کرنے والی نظر رکھتے ہیں اور اچھائی اور برائی سے درسِ عبرت لینا جن کا اصول ہے۔

---

[1] نکال منصوب ہے "بنزع الخافض" اور تقدیر میں "فاخذہ اللہ بنکال الاٰخرۃ" تھا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اخذ کا مفعول مطلق ہو جو "نکّل" کے معنی میں ہے (باب تفعیل کا فعل ماضی ہے) اور معنی کے لحاظ سے "نکّل اللہ بہ نکال الاٰخرۃ" ہے۔

جی ہاں! یہ تھی فرعون جیسے سرکش کی سرنوشت تاکہ روسائے مشرکین عرب میں جو فرعون تھے اور وہ دوسرے لوگ جو ہر زمانے میں فرعون کا راستہ اختیار کرنے والے ہیں، اپنا حساب وکتاب دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ یہ تاریخ کا قطعی فرمان اور خدا کی نہ بدلنے والی سنت ہے۔

ایک نکتہ

قرآن کی فصاحت کا ایک گوشہ

مندرجہ بالا آیات میں غور وفکر کرنے سے قرآن کی انتہائی فصاحت و بلاغت نظر آتی ہے۔ ان چند مختصر سطروں میں موسیٰؑ و فرعون کے تمام واقعہ کا خلاصہ، محرک رسالت، مقصدِ رسالت، تزکیہ کا وسیلہ، دعوت فکر کی کیفیت، ردِ عمل کی کیفیت، فرعون کی سازش کی کیفیت، اس کے فضول اور بے بنیاد دعووں کا نمونہ اور آخر کار اس مستِ بادۂ غرور کو ملنے والی دردناک سزا اور آخر میں درسِ عبرت جس کا فائدہ تمام بیدار مغز انسانوں کو پہنچا ہے، یہ سب موجود ہے۔

(۲۷) ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۝
(۲۸) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۙ
(۲۹) وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ۖ
(۳۰) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ؕ
(۳۱) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۖ
(۳۲) وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۙ
(۳۳) مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ

ترجمہ

(۲۷) کیا موت کے بعد تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی تخلیق جس کی خدا نے بنیاد رکھی؟

(۲۸) اس کی چھت کو بلند کیا اور اسے منظم کیا۔

(۲۹) اور اس کی رات کو تاریک اور دن کو آشکار کیا۔

(۳۰) اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔

(۳۱) اُس میں سے اس کا پانی نکالا اور اس کی چراگاہ کو تیار کیا۔

(۳۲) اور پہاڑوں کو ثابت و محکم کیا۔

(۳۳) یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے لیے ہے۔

تفسیر

تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمانوں کی؟ (معاد پر ایک دوسری دلیل)

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت تمام سرکشوں اور تکذیب کرنے والوں کے لیے ایک درس عبرت کے طور پر پیش کرنے کے بعد دوبارہ معاد اور قیامت کے مسئلہ کی طرف لوٹتا ہے اور عالم ہستی میں اپنی غیر متناہی قدرت کے نمونے امکانِ معاد کے لیے ایک دلیل کے طور پر بیان کرتا ہے اور انسانوں کو جو لامحدود نعمتیں اس نے دی ہیں ان کے کچھ حصوں کی تشریح کرتا ہے تاکہ شکرگزاری کے اس احساس کو جو خدا کی معرفت کا سرچشمہ ہے انسانوں کے دل میں بیدار کرے۔

پہلے منکرینِ معاد کو مخاطب کرتے ہوئے ایک ایسے استفہام کے طور پر جو تنبیہ کا پہلو لیے ہوئے ہے فرماتا ہے:

"کیا تمہاری تخلیق (موت کے بعد زندگی کی طرف بازگشت) زیادہ مشکل ہے یا اُس باعظمت آسمان کی تخلیق جس کی خدا نے بنیاد رکھی ہے؟" (ءانتم اشد خلقًا ام السماء بناھا)[1]

یہ گفتگو حقیقت میں ان لوگوں کی بات کا جواب ہے جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔ وہ کہتے تھے: (ءَانا لمردودون فی الحافرة) "کیا ہم پہلی حالت کی طرف پلٹ جائیں گے؟"

یہ آیت کہتی ہے کہ ہر انسان ادراک و شعور کے کسی مرحلہ میں بھی ہو وہ جانتا ہے کہ اس بلند آسمان کی تخلیق، یہ تمام عظیم کُرّے اور لاتعداد کہکشائیں، ان کی تخلیق صاف طور پر بتاتی ہے کہ انسان کی تخلیق ان کے مقابلہ میں کوئی شے نہیں ہے۔ لہٰذا جو یہ قدرت رکھتا ہو وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے سے کس طرح عاجز ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اس عظیم آفرینش کے بارے میں تشریح کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "آسمان کی چھت کو اس نے بلند کیا اور اُسے منظم و مرتب و موزوں کیا" (رفع سمکھا فسواھا)۔

"سمک" (بروزن سقف) کے معنی اصل میں بلندی کے ہیں۔ یہ چھت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ فخر رازی کی تفسیر کبیر میں ہے کہ کسی چیز کی بلندی کا جب اوپر والی سمت سے نیچے کی طرف اندازہ لگائیں تو اُسے عمق کہتے ہیں اور اگر نیچے کی طرف سے اوپر کا اندازہ لگائیں تو اسے سمک کا نام دیا جاتا ہے۔[2]

---

[1] یہ آیت حقیقت میں محذوف رکھتی ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (ام السماء اشد خلقًا) اور "بناھا" ایک جملہ مستانفہ ہے اور بعد میں آنے والی آیت کا مقدمہ ہے۔

[2] تفسیر فخر رازی / جلد ۳۱ صفحہ ۴۶

"سواھا" تسویہ کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کی تنظیم اور اُسے موزوں بنانے کے ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس عظیم و دقیق نظم و ضبط کی طرف جو تمام آسمانی کرّات میں کارفرما ہے۔ اگر سمک سے مراد چھت ہو تو پھر ہوا کے عظیم خطہ کی طرف اشارہ ہے جس نے محفوظ و محکم چھت کی طرح اطرافِ زمین کو گھیر رکھا ہے اور اُسے آسمان کی طرف سے آنے والے منتشر پتھروں کے حملے سے، اور ایسی شعاؤں سے، جو موت کا سبب بن سکتی ہیں، محفوظ کر رکھا ہے۔

بعض مفسرین مندرجہ بالا تعبیر کو آسمان کے کروی ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے اس نے اطرافِ زمین کو گھیر رکھا ہے اور وہ اس لیے کہ تسویہ اس سقف کے مرکز اصلی یعنی اجزائے زمین کے مساوی فاصلہ کی طرف اشارہ ہے جو کرویت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت آسمان کے بلند ہونے اور ہم سے آسمانی کرّوں کے بہت زیادہ طویل اور آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والے فاصلہ کی طرف اشارہ ہے اور اطرافِ زمین کی محفوظ سقف کی طرف بھی اشارہ ہے۔

بہر حال یہ آیت اس چیز کے مشابہ ہے جو سورۂ مؤمن کی آیت ۵۷ میں آئی ہے (لخلق السماوات والارض اکبر من خلق الناس ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون) آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے زیادہ اہم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کے بعد اس عظیم عالم کے ایک اہم ترین نظام کی یعنی نور و ظلمت کے نظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس کی رات کو تاریک اور دن کو روشن بنایا" (و اغطش لیلھا و اخرج ضحاھا)۔ جن میں سے ہر ایک، انسان اور دوسرے زندہ موجودات کی زندگی میں، عام اس سے کہ وہ حیوان ہوں یا نباتات، بہت گہرا اثر رکھتا ہے۔ نہ تو انسان نور و روشنی کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے کیونکہ تمام برکتیں اور رزق کی نعمتیں اس کی حس و حرکت کے ساتھ وابستہ ہیں، نہ ظلمت کے بغیر اس کی زندگی ممکن ہے جو اس کے سکون و آرام کی رمز ہے[1]

"اغطش" "غطش" (بروزن عرش) کے مادہ سے تاریکی کے معنی دیتا ہے لیکن راغب مفردات میں کہتا ہے کہ اس کی اصل "اغطش" سے لی گئی ہے جو اس شخص کے معنی میں ہے جو اپنی آنکھ میں نور کم رکھتا ہو۔ اور ضحیٰ اس موقعہ کے معنوں میں ہے جب سورج کی روشنی آسمان و زمین میں پھیلتی ہے[2]

---

[1] زندہ موجودات کی زندگی میں نور و ظلمت کے اہم آثار کے سلسلہ میں جلد ۸ ص ۳۴۳ و جلد ۱۲ ص ۱۴۱ و جلد ۱۶ ص ۱۴۶ پر ہم تفصیلی بحثیں کر چکے ہیں۔

[2] قابلِ توجہ یہ ہے کہ "لیلھا" کی ضمیر اور "ضحاھا" کی ضمیر آسمان کی طرف لوٹتی ہے اور نور و ظلمت کی نسبت آسمان کی طرف اس بنا پر ہے کہ اس کا آسمانی ہے۔

اس کے بعد آسمان سے زمین کا رُخ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

" زمین کو اس کے بعد پھیلایا (اور بچھایا) ۔ (والارض بعد ذالك دحاها) ۔

" دحا " " دحو " (بروزن محو) کے مادہ سے ہے اس کے معنی ہیں پھیلانا ۔ بعض مفسرین نے اسے کسی چیز کو اس کی اصل سے ہلانے کے معنی میں لیا ہے اور چونکہ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں لہٰذا ایک ہی روحِ کلام رکھتے ہیں ۔

بہرحال " دحو الارض " سے مراد یہ ہے کہ ابتداء میں تمام سطح زمین کو اس پانی نے گھیر رکھا تھا جو پہلی سیلابی بارش سے حاصل ہوا تھا ۔ پانی آہستہ آہستہ زمین کے گڑھوں میں جگہ لیتا گیا ، خشکیوں نے پانی کے نیچے سے سر نکالا اور روز بروز ان میں وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ موجودہ حالت میں نمودار ہو گئی (یہ مسئلہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد پیدا ہوا) [1]

زمین کو بچھانے اور زندگی کے لیے اس کے آمادہ ہو جانے کے بعد پانی اور نباتات کی بات درمیان میں لایا ہے اور فرماتا ہے :

" خدا نے زمین سے اس کے پانی کو نکالا اور اسی طرح اس کی چراگاہوں کو " (اخرج منها ماءها و مرعاها) ۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ پانی زمین کی نفوذ پذیر کھال کے درمیان چھپا ہوا تھا ۔ اس کے بعد چشموں اور نہروں کی شکل میں جاری ہوا ۔ یہاں تک کہ دریاؤں اور سمندروں کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ۔ " مرعی " اسم مکان ہے اس کے معنی چراگاہ ہیں [2]

اصل میں " رعی " سے حیوان کی حفاظت و نگہبانی کے معنی لیے جاتے ہیں چاہے غذا کے لحاظ سے ہو یا دیگر جہات سے ۔ اسی لیے مراعات محافظت و نگہبانی اور تدبیر امور کے معنی میں آیا ہے اور مشہور حدیث (کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته) بھی یہی بتاتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی حفاظت کو خود پر لازم سمجھیں [3]

لیکن چونکہ مختلف عوامل زمین کے آرام و سکون کو درہم برہم کر سکتے تھے ، علاوہ دوسرے عوامل کے مثلاً بڑے بڑے مستقل طوفان اور مد و جزر جو زمین کی سطح پر چاند سورج کی کشش سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اسی طرح زلزلے جو زمین کے اندر پگھلنے والے مواد کے دباؤ سے معرضِ وجود میں آتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۔

---

[1] بعض مفسرین نے بعد ذالك کی تعبیر جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہے اس کی تفسیر " اس کے علاوہ " کی ہے ۔ اب آیت کے معنی یہ بنتے ہیں کہ جو گزشتہ آیات میں آیا ہے ، زمین کو بچھایا اور پھیلایا ۔

[2] بعض نے اسے مصدر میمی کے طور پر لیا ہے جس کے معنی چرنے کے ہیں لیکن مناسب وہی مذکورہ بالا معانی ہیں ۔

[3] مفردات راغب مادہ " رعی " ۔

ان سب کو خدا نے پہاڑوں کے اس طاقتور جال کے ذریعہ، جس نے تمام روئے زمین کو گھیر رکھا ہے، کنٹرول میں رکھا اور زمین کو سکون و آرام دیا۔ اسی لیے فرماتا ہے: "اور پہاڑوں کو زمین میں ثابت و محکم کیا" (والجبال ارساھا) [1]

انسانوں کی زندگی اور سکون و آرام میں پہاڑوں کے گہرے اثرات کے بارے میں تفصیلی بحث ہم سورہ رعد کی آیت ۳ کے ذیل میں (جلد ۱۰ ص ۱۱۴) کر چکے ہیں۔ آخر میں فرماتا ہے:

"ان سب چیزوں کو اس نے اس لیے انجام دیا تاکہ تمہارے فائدہ اٹھانے کا سبب ہو اور تمہارے چوپایوں کے لیے وسیلہ و ذریعہ ہو" (متاعًا لکم ولانعامکم)۔

جی ہاں! آسمان کو بلند کیا، نور و ظلمت کا نظام قائم کیا، زمین کو بچھایا اور پھیلایا اور اس سے پانی اور نباتات کو نکالا، پہاڑوں کو زمین کی حفاظت کا نگہبان قرار دیا اور انسان کی زندگی کے تمام وسائل فراہم کیے اور سب کو انسان کا فرمانبردار قرار دیا تاکہ انسان زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور غافل نہ رہے اور ان تمام فرمانبرداروں کا پاس کرتے ہوئے جو اللہ نے اس کے لیے پیدا کیے ہیں فرمانِ الٰہی کا فرمانبردار ہو۔ یہ سب ایک طرف مسئلہ معاد کے اثبات کے لیے اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں اور دوسری طرف معرفتِ توحید کی راہ میں اس کی عظمت کی دلیلیں ہیں۔

---

[1] "ارسی" از مادہ "رسو" (بروزن رسم) ثابت ہونے کے معنی میں ہے اور "ارسی" اس کے متعدد معانی کو بتاتا ہے یعنی پہاڑوں کو ثابت قدم رکھا۔

(۳۴) فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۚ
(۳۵) يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۙ
(۳۶) وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝
(۳۷) فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۙ
(۳۸) وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ
(۳۹) فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِىَ الْمَاْوٰى ؕ
(۴۰) وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ
(۴۱) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ؕ

ترجمہ

(۳۴) جس وقت وہ عظیم حادثہ رونما ہوگا۔
(۳۵) تو اس دن انسان اپنی کوششوں کو یاد کرنے لگے گا۔
(۳۶) اور جہنم ہر دیکھنے والے کے لیے آشکار ہو جائے گا۔
(۳۷) لیکن جس شخص نے سرکشی کی ہے۔
(۳۸) اور اس نے دنیا کی زندگی کو مقدم رکھا۔
(۳۹) یقیناً جہنم اس کا ٹھکانہ ہے۔
(۴۰) اور جو شخص اپنے پروردگار کے مرتبہ سے واقف تھا اور اس نے اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے روکا۔

(۴۱) جنت اس کی جگہ ہے۔

تفسیر

وہ جو اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے باز رکھیں

اس اشارہ کے بعد جو گزشتہ آیات میں معاد کے بعض دلائل کے بارے میں گزرا زیر بحث آیات میں قیامت، اس میں خدا سے ڈرنے والوں اور ہوائے نفس کے پرستاروں کی سرنوشت کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"جس وقت وہ عظیم حادثہ رونما ہوگا تو نیکوکاروں اور بدکاروں میں سے ہر ایک اپنے اعمال کی جزا کو پہنچے گا" (فاذا جاءت الطامة الکبریٰ)۔[1]

"طامة" "طم" (بروزن فن) کے مادہ سے پُر کرنے کے معنوں میں آتا ہے اور وہ چیز جو اعلیٰ ہو اسے "طامة" کہتے ہیں۔ اسی لیے سخت حوادث اور عظیم مصائب جو مشکلات سے پُر ہوں ان پر بھی طامة کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہاں قیامت کی طرف اشارہ ہے جو ہولناک حوادث سے پُر ہے اس کی انتہائی توصیف کے ساتھ اس بے مثال حادثہ کی اہمیت وعظمت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

یہ عظیم حادثہ جس وقت وقوع پذیر ہوگا سب کے سب خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں گے اور انسان اپنی کوشش اور اپنے اعمال کو خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے، یاد کرے گا "یوم یتذکر الانسان ما سعیٰ"۔ لیکن اعمال کا یہ یاد کرنا انہیں فائدہ نہ دے گا۔

اگر انسان دنیا کی طرف واپس لوٹنے اور گزشتہ اعمال کی تلافی کرنے کے لیے مہلت طلب کرے گا تو اسے اجازت نہیں ملے گی اور اس مطالبہ کے جواب میں کلّا کہیں گے۔ اگر توبہ کرے گا اور اپنے اعمالِ بد کی معافی مانگے گا تو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا، کیونکہ توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔ لہٰذا سوائے آہ بھرنے کے اور افسوس کرنے کے کوئی اور چارہ کار نہ ہوگا اور بقول قرآن اگر وہ دونوں ہاتھوں کو دانتوں سے بھی

---

[1] "اذا" شرطیہ ہے اور اس کی جزا بعض مفسرین کے بقول بعد والی آیات میں (فاما من طغیٰ .... واما من خاف مقام ربہ) آئی ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کی جزا کو اس طرح محذوف کیا جائے جو بعد والی آیات سے معلوم ہوتی ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "فاذا جاءت الطامة الکبری یجزی کل انسان بما عمل"۔ بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ اس کی جزا یوم یتذکر الانسان سے معلوم ہوتی ہے لیکن یہ احتمال بعید ہے۔

کاٹیں گے تو کوئی فائدہ نہ ہوگا "ویوم یعض الظالم علیٰ یدیہ" (فرقان - ۲۷)۔

توجہ کرنی چاہیئے کہ یتذکر فعل مضارع ہے اور عام طور پر استمرار پر دلالت کرتا ہے یعنی اس روز انسان اپنے اعمال کو مسلسل یاد کرے گا۔ یہ اس بنا پر کہ اس روز انسان کی روح اور اس کے قلب کے آگے سے پردے اٹھ جائیں گے اور تمام پوشیدہ حقائق اس پر آشکار ہو جائیں گے۔ اس کے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

"اس دن جہنم ہر دیکھنے والے کے لیے آشکار ہوگا" (وبرزت الجحیم لمن یریٰ)۔ جہنم اس وقت بھی موجود ہے، بلکہ سورہ عنکبوت کی آیت ۵۴ (وان جھنم لمحیطۃ بالکافرین)۔ کے مطابق کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے لیکن عالم دنیا کے پردے اس کی رویت سے مانع ہیں۔ وہ دن جو ہر چیز کے آشکار ہونے کا دن ہوگا، اس روز جہنم ہر چیز سے زیادہ آشکار ہوگا۔

"لمن یریٰ" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ جہنم اس دن اس قدر آشکار ہوگا کہ ہر شخص بلا استثناء اسے دیکھے گا۔ وہ کسی سے مخفی نہ ہوگا۔ نہ اچھے لوگوں سے، نہ بُرے لوگوں سے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ جملہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو اس دن چشم بینا رکھتے ہوں گے کیونکہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ کے مطابق بعض لوگ اس دن نابینا محشور ہوں گے (ونحشرہ یوم القیامۃ اعمیٰ) لیکن پہلے معنی جنہیں تمام مفسرین نے قبول کیا ہے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں، اس لیے کہ جہنم بدکاروں کے لیے خود عذاب ہے، کئی گنی سزا ہے اور ایک گروہ کا محشر میں نابینا ہونا ممکن ہے بعض مواقف میں ہو نہ کہ تمام مواقف میں [1]

باقی رہا وہ شخص جو سرکشی کرے (فاما من طغیٰ)۔ اور دنیاوی زندگی کو ہر چیز پر مقدم رکھے۔ (واٰثر الحیاۃ الدنیا)۔ تو یقیناً جہنم اس کی جگہ اور ملجا و ماویٰ ہے (فان الجحیم ھی المأویٰ) [2]

پہلے جملے میں ان کے عقیدہ کے خراب ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لیے کہ طغیانی و سرکشی اپنے آپ کو بڑا سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنا خدا کی معرفت نہ ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔ جو شخص خدا کو اس کی عظمت کے ساتھ پہچان لے تو وہ اپنے آپ کو بہت خفیف اور چھوٹا دیکھے گا اور کبھی بھی جادۂ عبودیت سے انحراف نہیں کرے گا۔

دوسرا جملہ ان کے عملی فساد کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ طغیان و سرکشی سبب بنتے ہیں کہ انسان دنیا کی جلد ختم ہو جانے والی لذتوں اور اس کی چمک دمک کو زیادہ قیمتی سمجھے اور ہر چیز پر انہیں ترجیح دے۔

---

[1] اس سلسلہ میں مزید وضاحت جلد ۱۳ ص ۳۳۰ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

[2] آیت میں محذوف ہے اور تقدیر میں ھی المأوی لہ یا ھی مأواہ ہے اور ضمیر وضاحت کی بنا پر حذف ہوئی ہے۔

یہ دونوں درحقیقت ایک دوسرے کے علت و معلول ہیں۔ طغیان اور عقیدہ کا خراب ہونا فسادِ عمل اور دنیا کی ناپائیدار زندگی کو ہر چیز پر ترجیح دینے کا سرچشمہ ہے۔ آخرکار یہ دونوں جہنم کی جلا دینے والی آگ ہیں۔

حضرت علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں (ومن طغیٰ ضل علیٰ عمل بلاحجة) جو شخص سرکشی کرے وہ گمراہ ہو جائے گا اور ایسے اعمال کرے گا جن کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی[1]

یہ چیز خود کو بڑا سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے کہ انسان اس طرح اپنی تمام خواہشات کو بغیر کسی منطقی دلیل کے قبول کر لیتا ہے اور اس کے لیے ادج کا قائل ہوتا ہے۔

اس کے بعد جنتیوں کے اوصاف کو مختصر اور بہت ہی پُرمعنی جملوں میں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور باقی رہا وہ شخص جو اپنے پروردگار کے مرتبہ سے ڈرے اور نفس کو ہوا و ہوس سے روکے..." (واما من خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوٰی)۔ "تو اس کا ٹھکانہ جنت ہے" (فان الجنة هی المأوٰی)۔ جی ہاں جنتی ہونے کی پہلی شرط خوف ہے جو معرفت سے پیدا ہو۔ پروردگار کے مقام کو پہچاننا اور اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرنا۔

دوسری شرط جو حقیقت میں پہلی شرط کا نتیجہ اور معرفت و خوف کے درخت کا ثمر ہے، وہ یہ ہے کہ ہوائے نفس کو زیرِ تسلط رکھا جائے اور اسے سرکشی نہ کرنے دی جائے، اس لیے کہ ہوائے نفس تمام گناہوں مفاسد اور بدبختیوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ بدترین اور قابلِ نفرت بُت ہے جسے معبود بنا لیا گیا ہے۔ (ابغض اله عبد علیٰ وجه الارض الهوٰی) یہاں تک کہ وجودِ انسان میں شیطان کے نفوذ کا ذریعہ بھی ہوائے نفس ہے۔ کو زیرِ تسلط رکھا جائے اور اسے سرکشی نہ کرنے دی جائے اس لیے کہ ہوائے نفس

اگر یہ اندرونی شیطان اور بیرونی شیطان ہم آہنگ نہ ہوں اور اندرونی شیطان اس پر دروازہ نہ کھولیں تو اس کا وارد ہونا ممکن نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن کہتا ہے (ان عبادی لیس لك علیهم سلطان الا من اتبعك من الغاوین) "تجھے کبھی بھی میرے بندوں پر تسلط حاصل نہ ہوگا مگر وہ گمراہ جو تیری پیروی کرتے ہیں" (حجر/۴۲)۔

چند نکات

۱۔ مقامِ رب کیا ہے

قابلِ توجہ یہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں فرماتا ہے: "جو شخص اپنے پروردگار کے مقام سے ڈرے" یہ نہیں فرماتا: "جو اپنے پروردگار سے ڈرے" یہ کہ مقام سے کیا مراد ہے اس سلسلہ میں متعدد تفاسیر ہیں۔

۱۔ پہلی تفسیر یہ ہے کہ اس مقام سے مراد مختلف مواقف قیامت ہیں جن میں انسان بارگاہ خداوندی

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۰۶ حدیث ۴۳۔

میں حساب کتاب کے لیے ٹھہرے گا۔ اس تفسیر کی بنا پر "مقام ربہ" کے معنی (مقامہ عند ربہ) انسان کا بارگاہِ خدا میں کھڑا ہونا ہیں۔

۲۔ مراد خدا کا علم اور تمام بندوں کے بارے میں اس کا مقامِ مراقبت و نگہبانی ہے جیسا کہ سورہ رعد کی آیت ۳۳ میں آیا ہے (افمن ھو قائم علیٰ کل نفس بما کسبت) کیا وہ جو سب کے سروں پر کھڑا ہے اور سب کے اعمال کا نگہبان ہے اس شخص کی طرح ہے جو یہ صفت نہیں رکھتا۔

اس تفسیر کی دوسری شاہد وہ حدیث ہے جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے (من علم ان اللہ یراہ و یسمع مالقول ویعلم ما یعلمہ من خیر اوشر فیجزہ ذالک عن القبیح من الاعمال فذالک الذی خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوٰی) جو شخص جانتا ہے کہ خدا اسے دیکھتا ہے اور جو کچھ یہ کہتا ہے اُسے وہ سنتا ہے اور جو خیر و شر یہ انجام دیتا ہے اس سے وہ آگاہ ہے اور یہ توجہ اسے قبیح اعمال سے روکتی ہے، وہ ایسا شخص ہے جو اپنے پروردگار کے مقام سے خائف ہے اور اس نے اپنے آپ کو ہوائے نفس سے باز رکھا ہے۔

۳۔ مراد اس کا مقامِ عدالت ہے، اس لیے کہ اس کی ذات مقدس خوف کا سبب نہیں ہے خوف اس کی عدالت کا ہے اور حقیقت میں یہ خوف اس کے عدل کے ساتھ اپنے اعمال کے موازنہ سے محسوس ہوتا ہے جیسا کہ مجرم لوگ ایک عادل قاضی کو دیکھ کر لرزنے لگتے ہیں اور محکمہ عدالت کا نام سن کر ان کو وحشت ہونے لگتی ہے جبکہ بے گناہ شخص نہ اس سے خوف کھاتا ہے اور نہ اسے وحشت ہوتی ہے۔

ان تینوں تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے کہ یہ سب معانی آیت میں موجود ہوں۔

۲۔ طغیان اور دنیا پرستی کے درمیان ربط

حقیقت میں مندرجہ بالا مختصر قسم کی آیات انسان کے اصولِ سعادت و شقاوت کی خوب صورت اور شائستہ طریقہ سے تصویر کشی کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ انسان کی شقاوت اس کی سرکشی اور دنیا پرستی میں ہے اور سعادت خوفِ خدا اور ترکِ ہوا و ہوس میں ہے۔ انبیاء و اولیاء کی تمام تعلیمات کا نچوڑ بھی یہی چیز ہے۔ ایک حدیث امیر المؤمنین علیؑ سے منقول ہے:

(ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان اتباع الھوٰی و طول الامل فاما اتباع الھوی فیصد عن الحق و اما طول الامل فینسی الاٰخرۃ)۔ زیادہ ہولناک چیزیں جن کا مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے وہ دو ہیں، ہوائے نفس کی پیروی اور طویل آرزوئیں۔ ہوا و ہوس کی پیروی تو تمہیں حق سے روک دے گی اور طویل آرزوئیں آخرت کو فراموشی کے سپرد کر دیں گی[1]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲۔

خواہش کی پرستش انسانی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے بُرے اعمال کو اس کی نظر میں مزین کر کے پیش کرتی ہے اور تمیز کی حس، جو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور انسان وحیوان میں وجہ امتیاز ہے، اس سے چھین لیتی ہے اور اس کو اپنی ذات میں مشغول رکھتی ہے۔

یہ وہی بات ہے جو حضرت یعقوبؑ جیسے روشن ضمیر پیغمبر نے اپنے نالائق بیٹوں سے کہی تھی (بل سولت لکم انفسکم امرًا) (یوسف/۱۸)۔

یہاں باتیں بہت سی ہیں بہتر ہے کہ اہلبیت علیہم السلام کی احادیث میں سے دو حدیثوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جن میں سب کہنے کی باتیں کہی گئی ہیں، ہم اس بحث کو ختم کریں۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: الجنة محفوفة بالمکاره والصبر فمن صبر علی المکاره فی الدنیا دخل الجنة، وجهنم محفوفة باللذات والشهوات فمن اعطی نفسها لذتها وشهوتها دخل النار: جنت پریشانیوں، صبر و شکیبائی اور استقامت میں گھری ہوئی ہے جو شخص پریشانیوں کے مقابلے میں (اور خواہشات کو ترک کرنے میں) دنیا میں صبر و شکیبائی سے کام لے، وہ جنت میں داخل ہوگا اور جہنم غیر شرعی لذتوں اور سرکش خواہشات میں گھری ہوئی ہے جو شخص اپنے نفس کو ان لذتوں اور خواہشوں کے مقابلہ میں آزاد چھوڑ دے، وہ جہنم میں داخل ہوگا[1]

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: لاتدع النفس وهواها فان هواها فی ردائها وترک النفس وما تهوی دائها وکف النفس عما تهوی دواءها: نفس کو ہوا و ہوس کے ساتھ نہ چھوڑ اس لیے کہ ہوائے نفس نفس کی موت کا سبب ہے اور نفس کو اس کی ہوا کے مقابلہ میں آزاد چھوڑ دینا اس کی بیماری ہے اور اس کو ہوا و ہوس سے روکنا اس کی دوا ہے[2]

نہ صرف جہنم خواہش کی پرستش کا نتیجہ ہے بلکہ دنیا کے جلانے والے جہنم مثلاً بدامنی، بدنظمی، جنگیں، خونریزیاں، لڑائیاں وغیرہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

۳۔ صرف دو گروہ

مندرجہ بالا آیات میں دو گروہوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ دنیا پرست طغیان و سرکشی کرنے والے اور صاحب تقویٰ خدا کا خوف کرنے والے۔ پہلے گروہ کی دائمی جگہ جہنم اور دوسرے گروہ کی جاودانی جائے سکونت جنت بتائی گئی ہے۔

البتہ یہاں ایک تیسرا گروہ بھی ہے۔ وہ مومنین جو عمل کے لحاظ سے کچھ کوتاہیوں کا شکار ہیں، اگر خدا انہیں معاف کردے تو وہ جنت والے گروہ سے ملحق ہو جائیں گے اور اگر معافی نہ ملے تو دوزخ میں جائیں گے لیکن ان کا ٹھکانہ وہاں نہیں ہوگا۔ مندرجہ بالا آیات میں ان کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہے۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۰۷ حدیث ۴۶۔

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۰۷ حدیث ۴۵۔

(۴۲) يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝
(۴۳) فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا ۝
(۴۴) اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ۝
(۴۵) اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ۝
(۴۶) كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ۝

ترجمہ

(۴۲) تجھ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ کس زمانہ میں واقع ہوگی؟
(۴۳) تجھے اس بات کی یاد آوری سے کیا کام؟
(۴۴) اس کی انتہا تیرے پروردگار کی طرف ہے۔
(۴۵) تیرا کام صرف ان لوگوں کو ڈرانا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔
(۴۶) وہ اس دن جب قیامت کو دیکھیں گے تو اس طرح محسوس کریں گے گویا ان کا توقف (دنیا اور برزخ میں) سوائے عصر کے وقت یا صبح کے وقت سے زیادہ نہیں تھا۔

تفسیر

قیامت کی تاریخ صرف خدا جانتا ہے

ان مطالب کے بعد جو قیامت کے بارے میں اور اس روز جو نیکوں اور بدکاروں کا حال ہوگا اس کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آئے، ان آیات میں معاد کے بارے میں مشرکین اور منکرین کے ہمیشہ سوال کرنے کو موضوع بناتے ہوئے فرماتا ہے:

"تجھ سے قیامت سے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کب برپا ہوگی" (یسئلونک عن الساعۃ ایان مرساھا)[1]

[1] "مرساہ" مصدری معنی میں ہے اور اسم زمان، اسم مکان اور اسم مفعول کے معنی میں آتا ہے۔ مادہ "ارساء" سے، البتہ یہاں مصدری معنی
(باقی اگلے صفحہ پر)

قرآن اس سوال کے جواب میں، انہیں سمجھانے کے لیے کہ کوئی شخص بھی قیامت کے وقوع سے واقف نہیں ہے اور نہ ہوگا، پیغمبر کی طرف رخِ سخن کرتے ہوئے کہتا ہے:

"تجھے اس بات کی یاد آوری سے کیا سروکار" (فیم انت من ذکراھا)۔ یعنی وقوعِ قیامت کی تاریخ تجھ سے بھی پنہاں ہے چہ جائیکہ دوسرے۔ یہ اس علمِ غیب میں سے ہے جو ذاتِ پروردگار کے مختصات میں سے ہے اور اس حقیقت کی اور کسی کو خبر نہیں ہے۔

بارہا ہم نے کہا ہے کہ منجملہ ان مطالب کے جو سب سے پوشیدہ ہیں قیامِ قیامت کا وقت بھی ہے، اس لیے کہ اس کا تربیتی اثر اس کے پوشیدہ ہوئے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر یہ بات معلوم ہو اور اس کا زمانہ دُور کا ہو، تو سب غفلت کا شکار ہو جائیں گے اور اگر نزدیک ہو تو برائیوں سے پرہیز، آزادی و اختیار کی گرفت سے باہر ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں تربیت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے اور احتمال بھی پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ تُو زمانہ قیامت بیان کرنے کے لیے مبعوث نہیں ہوا، تُو اس لیے مبعوث ہوا ہے کہ اصل وجود کی اطلاع دے نہ کہ لمحۂ وقوع کی۔ دوسرے یہ کہ تیرا کام قیامت کے نزدیک ہونے کو بیان کرنا ہے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے اپنی دو انگلیوں کو اکٹھا کر کے فرمایا: (بعثت انا والساعۃ کھاتین) "میرا قیام اور قیامت کا قیام ان دو کی طرح ہے"[1]

پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"قیامت کی انتہا تیرے پروردگار کی طرف ہے" (الی ربک منتھاھا)۔ صرف وہی جانتا ہے کہ قیامت کب برپا ہوگی۔ کوئی دوسرا فرد اس سے آگاہ نہیں ہے اور قیامِ قیامت کی آگاہی کے لیے ہر طرح کی سعی و کوشش بے فائدہ ہے۔

یہ وہی مفہوم ہے جو سورہ لقمان کی آیت ۳۴ میں بھی آیا ہے۔ (ان اللہ عندہ علم الساعۃ) "قیامت کے وقوع کے زمانے اور وقت کا علم صرف خدا کو ہے"

سورہ اعراف کی آیت ۱۸۷ میں فرماتا ہے: (قل انما علمھا عند ربی) "کہہ دے اس کا علم صرف میرے پروردگار کو ہے"۔ بعض نے کہا ہے کہ اوپر والے جملے سے یہ مراد ہے کہ قیامت کا تحقق اور انجام پانا

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) رکھتا ہے اور وقوع و ثبوت اور پابرجا ہونے کے معنوں میں ہے۔ یہ تعبیر کشتی کے لنگر انداز ہونے اور اسی طرح پہاڑوں کے روئے زمین پر حالت ثبات میں ہونے کے بارے میں بھی آئی ہے مثلاً (وقال ارکبوا فیھا بسم اللہ مجراھا ومرساھا) (ہود)۔

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۹۔ یہ بات تفسیر مجمع البیان، قرطبی، فی ظلال اور دوسری تفسیروں میں بھی سورہ محمدؐ کی آیت ۱۸ کے ذیل میں بھی مذکور ہے۔

خدا کے اختیار میں ہے۔

اور حقیقت میں اس چیز کے لیے جو گزشتہ آیت میں آئی ہے بیان علت کے برابر ہے۔ ان دونوں تفسیروں کے جمع کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لیے فرماتا ہے: "تیرا کام صرف ان لوگوں کو ڈرانا ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں" (انما انت منذر من یخشاھا)۔ تیری ذمہ داری ڈرانا اور خبردار کرنا ہے اور بس، باقی رہا وقت کا تعین کرنا تو وہ تیرے فرائض میں داخل نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ڈرانے کو کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ مخصوص کرتا ہے جو اس عظیم دن کا خوف و ہراس رکھتے ہیں۔ اور یہ اس مفہوم کے مشابہ ہے جو سورہ بقرہ کی دوسری آیت میں آیا ہے (ذالك الكتاب لا ریب فیه هدًی للمتقین) اس آسمانی کتاب میں کوئی شک و تردد نہیں ہے، یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت کا سبب ہے۔

اس قسم کی تعبیریں اس طرف اشارہ ہیں کہ جب تک حق جوئی، حق طلبی اور پیش خدا احساس ذمہ داری کی روح انسان میں موجود نہ ہو تو وہ نہ تو کتب آسمانی کی تحقیق کرتا ہے اور نہ معاد و قیامت کی اور نہ وہ انبیاء و اولیاء کی طرف سے کی جانے والی تخویف پر توجہ کرتا ہے۔

اس سورہ کی آخری آیت میں اس حقیقت کو پیش کرنے کے لیے کہ قیامت کے آنے میں زیادہ وقت باقی نہیں ہے ارشاد فرماتا ہے: "جب قیامت کا دن دیکھیں گے تو اس طرح محسوس کریں گے گویا ان کا توقف اس جہاں میں عصر کے وقت یا صبح کے وقت سے زیادہ نہیں تھا" (کانھم یوم یرونھا لم یلبثوا الا عشیة او ضحاھا)۔ دنیا کی مختصر سی عمر اس تیزی سے گزر جائے گی اور برزخ کا دور بھی اس تیزی سے گزر جائے گا کہ وہ قیامت میں خیال کریں گے کہ یہ سارا زمانہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں تھا۔

یہ امر بھی ذاتی طور پر صحیح ہے کہ عمر دنیا بہت ہی مختصر اور جلد گزر جانے والی ہے اور قیامت کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے بھی تمام جہان کی عمر اس کے مقابلہ میں ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہے۔

"عشیة" عصر کے معنوں میں اور ضحیٰ اس موقعہ پر بولا جاتا ہے جب سورج اوپر آجائے اور اس کی شعاعیں پھیل جائیں۔ بعض آیات قرآنی میں آیا ہے کہ قیامت میں جب مجرمین عالم برزخ یا دنیا میں توقف کی مقدار کے بارے میں گفتگو کریں گے تو بعض دوسروں سے کہیں گے کہ تم نے صرف دس دن رات عالم برزخ میں توقف کیا ہے (یتخافتون بینھم ان لبثتم الا عشرًا) (طٰہٰ/۱۰۳)۔ لیکن جو بہتر غور و فکر کریں گے وہ کہیں گے تم نے صرف ایک ہی دن کے برابر برزخ میں توقف کیا ہے (یقول امثلھم طریقة ان لبثتم الا یومًا)

ایک دوسری جگہ مجرمین سے نقل کرتا ہے کہ جب قیامت بپا ہوگی تو مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ ایک

ساعت سے زیادہ توقف نہیں کیا (و یوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون مالبثوا غیر ساعۃ) (روم ۵۵)

ان تعبیروں کا اختلاف اس بنا پر ہے کہ جو چاہتے ہیں اس مدت کے مختصر ہونے کو ایک خاص انداز کے ساتھ ظاہر کریں ان میں سے ہر ایک اپنے احساسات کو ایک الگ تعبیر کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ ان سب کا ایک بات میں اشتراک ہے اور وہ اس جہان کی عمر کا قیامت کی عمر کے مقابلہ میں مختصر ہونا ہے۔ یہ ایسا مفہوم ہے جو انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے۔

پروردگار! ہم سب کو عالم برزخ میں، اس دنیا میں اور اس عظیم دن امن و امان اور سکون و اطمینان عطا فرما۔

پروردگار! کوئی شخص بھی اس عظیم دن کی سختیوں سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا سوائے اس طرح کہ تیرا لطف و کرم ہو جائے۔ ہم پر اپنا خاص لطف و کرم فرما۔

بار الٰہا! ہمیں ایسے افراد میں سے قرار دے جو تیرے مقام سے خائف ہیں اور جو اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے روکتے ہیں اور بہشت بریں جن کا ملجا و ماویٰ ہے[1]

آمین یارب العالمین

(سورۂ نازعات کا اختتام)

---

[1] یہ سطور ان ساعات و لمحات میں ضبطِ تحریر میں آئیں جب ہر لمحے عراق کی بعثی حکومت کی طرف سے بمباری کا اور بے خانماں لوگوں کے دفن ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس تاریخ سے ایک یا دو دن پہلے ایک بمباری میں اس شہر مقدس قم میں تقریباً ایک سو پچاس مسلمان خصوصاً بے گناہ بچے شہید ہوتے تھے لیکن مسلّم ہے کہ ظلم و ظالم کی عمر کوتاہ ہوتی ہے۔

سورۂ عبس

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اس میں ۴۲ آیتیں ہیں

سورۂ عبس کے مضامین

سورہ عبس مختصر ہونے کے باوجود مختلف اور اہم مسائل پر بحث کرتی ہے اور مسئلہ معاد کو خاص اہمیت دیتی ہے۔ اس کے مضامین کا پانچ موضوعات کے ماتحت خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ خدا کا شدید عتاب اس شخص پر جس نے ایک حقیقت کے متلاشی نابینا سے مناسب رویہ اختیار نہیں کیا۔

۲۔ قرآن مجید کی قدر و قیمت اور اہمیت۔

۳۔ خدا کی نعمتوں کے سلسلہ میں انسان کی ناشکر گزاری۔

۴۔ انسان اور حیوانات کی غذا کے سلسلہ میں انسان کے احساسِ شکر گزاری کو بیدار کرنے کے لیے خدا کی نعمتوں کے ایک حصّہ کا بیان۔

۵۔ حوادثِ قیامت کے کچھ لرزہ بر اندام کر دینے والے حصوں کی طرف اشارہ۔ اور اس عظیم دن مومنین و کفار کا احوال۔

اس سورہ کا نام اس کی مناسبت سے
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے: من قرأ سورۃ "عبس" جاء یوم القیامۃ ووجھہ ضاحک مستبشر: جو شخص سورہ عبس کی تلاوت کرے وہ بروزِ محشر اس حالت میں وارد ہوگا کہ اس کا چہرہ خنداں اور وہ شخص ہشاش بشاش ہوگا۔[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۳۵۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی ۙ
۲ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ
۳ وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ
۴ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ؕ
۵ اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ
۶ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ؕ
۷ وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ
۸ وَاَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی ۙ
۹ وَہُوَ یَخۡشٰی ۙ
۱۰ فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی ۚ

ترجمہ اس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

۱ جبیں بہ جبیں ہوا اور منہ پھیر لیا۔
۲ اس وجہ سے کہ نابینا اس کے پاس آیا تھا۔
۳ تُو کیا جانتا ہے شاید وہ پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کرے؟
۴ یا متذکر ہو اور یہ تذکر اس کے لیے مفید ہو۔
۵ لیکن وہ شخص جو مستغنی ہے۔

(۶) تُو اس کی طرف رخ کرتا ہے۔

(۷) حالانکہ وہ اگر اپنے آپ کو یاد نہ کرے تو تیری کوئی ذمہ داری نہیں۔

(۸) لیکن جو تیرے پاس آیا ہے اور کوشش کرتا ہے۔

(۹) اور خدا سے ڈرتا ہے۔

(۱۰) تُو اس سے غافل ہوتا ہے۔

شانِ نزول

یہ آیات اجمالی طور پر بتاتی ہیں کہ ان میں خدا نے کسی کو سرزنش کی ہے اور اس پر عتاب کیا ہے اس لیے کہ اس نے ایک یا کئی غنی افراد کو حق طلب نابینا پر ترجیح دی ہے۔

باقی رہا یہ کہ موردِ عتاب و سرزنش کون شخص ہے اس میں اختلاف ہے۔ عام اور خاص دونوں طرح کے مفسرین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ قریش کے سرداروں کا ایک گروہ جن میں عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل، عباس ابن عبدالمطلب وغیرہ اور ان کے علاوہ کچھ اور لوگ خدمتِ پیغمبرؐ میں حاضر تھے اور پیغمبرؐ انہیں دعوتِ اسلام دینے میں مصروف تھے اور اس بات کی امید کر رہے تھے کہ یہ باتیں ان کے دلوں پر اثرانداز ہوں گی (یقینی بات تھی کہ اگر اس قسم کے افراد اسلام قبول کر لیتے تو دوسری قسم کے لوگوں کو بھی اسلام کی طرف کھینچ لاتے اور ان کی مخالفانہ کارروائیاں بھی ختم ہو جاتیں لہٰذا دونوں حیثیتوں سے یہ صورتِ حال اسلام کے لیے مفید تھی)۔

اس دوران میں عبداللہ ابن مکتوم، جو نابینا اور مفلس تھے مجلس میں وارد ہوئے اور انہوں نے پیغمبرؐ سے استدعا کی کہ وہ کچھ آیتیں قرآن کی انہیں سنائیں اور انہیں ان کی تعلیم دیں۔ وہ اس بات پر مسلسل اصرار کیے جا رہے تھے اور خاموش نہیں ہو رہے تھے اس لیے کہ انہیں صحیح طور پر معلوم ہی نہیں تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کن لوگوں سے مصروفِ گفتگو ہیں۔

انہوں نے کلام پیغمبرؐ کو اس قدر قطع کیا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے چہرہ اقدس پر ناگواری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ آپؐ نے اپنے دل میں کہا کہ یہ عرب کے سردار کیا سوچیں گے کہ محمدؐ کے پیروکار نابینا اور غلام ہیں لہٰذا آپؐ نے عبداللہ کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور گروہِ قریش کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی تو اس موقعہ پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔ (اور اس سلسلہ میں پیغمبرؐ کو موردِ عتاب قرار دیا)۔

رسولِ کریمؐ اس واقعہ کے بعد عبداللہ کا ہمیشہ احترام کرتے اور جس وقت ان کو دیکھتے تو فرماتے: (مرحبا

بمن عاتبنی فیہ (ربی) "مرحبا اے وہ شخص جس کی وجہ سے میرے پروردگار نے مجھے موردِ عتاب قرار دیا"۔ اس کے بعد ان سے کہتے "کیا تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے جسے میں بہم پہنچاؤں" اور پیغمبر اسلامؐ نے ان کو دو مرتبہ غزواتِ اسلامی کے سلسلہ میں مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیا۔[1]

دوسری شانِ نزول

جو کچھ مندرجہ آیات کے سلسلہ میں نقل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیات بنی امیہ میں سے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئیں جو پیغمبرؐ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ عبداللہ ابن مکتوم وارد ہوئے۔ جب اُس کی نگاہ عبداللہ پر پڑی تو اس نے اپنا دامن سمیٹا، اس خیال سے کہ وہ کہیں میلا نہ ہو اور اپنے چہرے پر ناگوار اثرات ظاہر کیے اور منہ پھیر لیا، تو خدا نے مندرجہ بالا آیات میں اس کے عمل کو نقل کر کے اسے موردِ عتاب قرار دیا۔ یہ شانِ نزول ایک حدیث میں امام جعفرؑ سے منقول ہے۔[2]

محقق بزرگ شیعہ مرحوم سید مرتضٰے نے اسی شانِ نزول کو قبول کیا ہے، البتہ آیت میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو صراحت کے ساتھ دلالت کرے کہ اس سے مراد خود پیغمبرؐ ہیں۔ جو چیز اس امر پر قرینہ بن سکتی ہے وہ صرف باتیں ہیں جو آیت ۸ سے لے کر آیت ۱۰ تک کہی گئی ہیں۔ مثلاً جو شخص خدا کی آیتوں کو سننے کے لیے تیزی سے تیرے پیچھے آتا ہے اور خدا سے ڈرتا ہے تو اس سے غافل ہوتا ہے"، یہ ایسی چیز ہے جو ہر شخص سے زیادہ پیغمبرؐ پر صادق آتی ہے لیکن مرحوم سید مرتضٰے کے بقول ان آیات میں کئی قرائن بتاتے ہیں کہ اس سے مراد پیغمبرؐ نہیں ہیں۔

پھر یہ کہ عبوس "ترشروئی اختیار کرنا" صفاتِ انبیاء میں سے نہیں ہے، خصوصاً پیغمبر اسلامؐ آپؐ تو اپنے دشمنوں سے بھی کشادہ روئی سے بات کرتے تھے چہ جائیکہ ایک ایسے مومن سے ترشروئی اختیار کریں جو حقیقت کی تلاش میں رہتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اغنیاء کی طرف متوجہ ہونا اور حق طلب مفلس سے غافل ہونا آنحضرتؐ کے ان اخلاق کے ساتھ جن کی طرف سورہ (قلم) کی آیت ۴ میں اشارہ ہوا ہے (وانک لعلی خلق عظیم) "تو عظیم اخلاق پر فائز ہے" ہرگز مطابقت نہیں رکھتا خصوصاً جبکہ مشہور یہ ہے کہ سورہ (قلم) سورہ عبس سے پہلے نازل ہوا۔[3]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۳۷۔
[2] ایضاً " " " " " "۔
[3] ایضاً " " " " " "۔

تفسیر

حق طلب نابینا سے بے اعتنائی برتنے پر شدید عتاب

جو کچھ شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب ہم اس کی تفسیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پہلے فرماتا ہے:

"اس نے ترشروئی اختیار کی اور منہ پھیرا" (عبس و تولّی)۔ "اس وجہ سے کہ نابینا اس کے پاس آیا تھا" (ان جاءہ الاعمیٰ)۔ "تُو کیا جانتا ہے شاید وہ ایمان، پاکیزگی اور تقویٰ کی جستجو میں ہو" (وما یدریک لعلہ یزکّی)۔ "یا حق کی باتیں سننے سے ذکر یافتہ ہو جائے اور یہ تذکر اس کے لیے مفید ہو" (او یذکر فتنفعہ الذکریٰ)۔ اور اگر سو فیصد پاک نہ بھی ہو اور تقویٰ اختیار نہ کرے تو اس ذکر سے کم از کم نصیحت حاصل کرے اور بیدار ہو اور یہ بیداری اجمالی طور پر اس پر اثر انداز ہو[1]

اس کے بعد اس عتاب کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "باقی رہا وہ جو اپنے آپ کو غنی اور بے نیاز سمجھتا ہے" (اما من استغنیٰ) "تُو اس کی طرف رُخ کرتا ہے اور توجہ کرتا ہے" (فانت لہ تصدّیٰ)۔ اور اس کی ہدایت پر اصرار کرتا ہے حالانکہ وہ غرور، ثروت و خود خواہی میں مبتلا ہے۔ وہ غرور جو طغیان و سرکشی کا منشا ہے جیسا کہ سورہ علق کی آیت ۶، ۷ میں آیا ہے (ان الانسان لیطغیٰ ان رآہ استغنیٰ) انسان طغیان و سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھتا ہے[2]

حالانکہ وہ تقویٰ کی راہ اختیار نہ کرے اور ایمان نہ لائے تو تیری کوئی ذمہ داری نہیں۔ (وما علیک الّا یزکّی)۔ تیری ذمہ داری صرف تبلیغ رسالت ہے (خواہ ازاں پندگیرند یا ملال) چاہے وہ نصیحت حاصل کریں چاہے انہیں ملال ہو۔ اس لیے ہر قسم کے افراد کے واسطے حق طلب نابینا سے لاپرواہی نہیں برتنی چاہیئے اور اسے آزردہ نہیں کرنا چاہیئے خواہ تیرا مقصد یہ بھی ہو کہ یہ اکڑنے والے لوگ ہدایت حاصل کرلیں۔ تاکید و

---

[1] اس وجہ سے اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں فرق یہ ہے کہ وہاں گفتگو کامل پاکیزگی اور تقویٰ کے بارے میں ہے اور یہاں تذکر کی اجمالی تاثیر کے بارے میں بات ہو رہی ہے چاہے کامل تقویٰ کے مقام تک نہ پہنچے۔ نتیجۃً وہ حق طلب نابینا تذکر سے فائدہ اٹھائے گا چاہے مکمل فائدہ ہو چاہے مختصر۔ بعض مفسرین سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی آیت گناہوں سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری کسب اطاعات و پیروی فرمانِ خدا کی طرف، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

[2] راغب مفردات میں کہتا ہے غنی، استغنی و تغنی اور تغافی کے ایک ہی معنی ہیں پھر اس کے بقول تصدی۔ صدی (بروزن فتی) اصل میں اس آواز کے معنی میں ہے جو پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آتی ہے۔ اس کے بعد لفظ تصدی کسی چیز کے روبرو قرار پانے کے معنی میں ہے اور مکمل طور پر اس کی طرف توجہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

عتاب کو نئے سرے سے شروع کرتا ہے اور خطاب کی صورت میں فرماتا ہے:

"باقی رہا وہ شخص جو تیرے پاس آتا ہے اور ہدایت و پاکیزگی کے لیے کوشش کرتا ہے" (واما من جاءك یسعٰی) "اور خدا سے ڈرتا ہے" (وھو یخشٰی) [1]

اسی خوفِ خدا نے اسے تیرے پیچھے بھیجا ہے تاکہ وہ زیادہ حقائق سنے اور ان پر کاربند ہو اور اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ کرے، "تُو اس سے غفلت کرتا ہے اور دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے" (فانت عنه تلهّٰی) [2]

"انت" تُو کی تعبیر حقیقت میں اس طرف اشارہ ہے کہ تجھ جیسے انسان کے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ اس قسم کے حق طلب انسان سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہو اور دوسرے کی طرف متوجہ ہو اور تیرے دوسروں کی طرف متوجہ ہونے کا مقصد بھی یہ ہو کہ ان کو ہدایت حاصل ہو۔ اس لیے ترجیح اس کمزور اور پاک دل گروہ ہی کو ہے۔

بہرحال یہ عتاب و خطاب اس اہم حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اسلام اور قرآن راہِ حق کو طے کرنے والے کمزور افراد کے لیے خاص قسم کی اہمیت و احترام کا قائل ہے اور اس کے برعکس حالت پر تیز اور سخت تنقید کرتا ہے، ان لوگوں کے مقابلہ میں جو نعمتِ الٰہی کی فراوانی کی وجہ سے مغرور ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ خدا راضی نہیں ہوتا کہ تُو ان کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اس حق طلب کمزور طبقہ میں کم سے کم رنجش بھی پیدا کرے۔

اس کی وجہ اس لیے بھی واضح ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اسلام کے مخلص سہارا بننے والے، مشکلات کے وقت دین کے عظیم پیشواؤں کی آواز پر لبیک کہنے والے، میدانِ جنگ میں قربانی پیش کرنے والے اور شہید ہونے والے تھے۔ جیسا کہ امیرالمومنین حضرت علیؑ اپنے مشہور مالک اشتر والے فرمان میں فرماتے ہیں: وانما عماد الدین و جماع المسلمین والعدة للاعداء العامة من الامة فلیکن صغوك لهم و میلك معهم ۔ دین کا ستون اور مسلمانوں کے اجتماع کا سرمایہ اور دشمنوں کے مقابلہ میں قوت و طاقت کا ذخیرہ امت کے صرف عامۃ الناس ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ان کی بات کان دھر کے سننا اور ان کی طرف اپنی خاص توجہ رکھنا چاہیئے [3]

---

[1] اس میں شک نہیں کہ یہاں خشیت سے مراد خوفِ خدا ہے، ایسا خوف جو انسان کو زیادہ سے زیادہ تحقیق پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کے مشابہ جو متکلمین نے دفع ضرر متحمل کا استثناء کرتے ہوئے وجوبِ معرفتِ خدا کے سلسلہ میں کہا ہے اور یہ جو فخر رازی نے احتمال پیش کیا ہے کہ مراد کفار کا خوف ہے، یا نابینا ہونے کی وجہ سے گر پڑنے کا خوف مقصود ہے، بہت بعید ہے۔

[2] "تلهّٰی" لهو کے مادہ سے سرگرم کر دینے والے کام کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے غفلت برتنے اور دوسرے کی طرف متوجہ ہونے کے معنی میں ہے اور حقیقت میں تصدی کا نقطہ مقابل ہے۔

[3] نہج البلاغہ جز خطوط خط ۵۳۔

(۱۱) كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ
(۱۲) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ ۝
(۱۳) فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ
(۱۴) مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ
(۱۵) بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ
(۱۶) كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝
(۱۷) قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝
(۱۸) مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝
(۱۹) مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ
(۲۰) ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۙ
(۲۱) ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ
(۲۲) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۝
(۲۳) كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝

ترجمہ

(۱۱) کبھی ایسا نہ کر یہ (قرآن) ایک یاد آوری ہے۔
(۱۲) جو شخص چاہے اس سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔
(۱۳) قیمتی الواح میں ثبت ہے۔

(۱۴) بیش قدر اور پاکیزہ الواح میں۔

(۱۵) ایسے سفیروں کے ہاتھ میں۔

(۱۶) جو والا مقام فرمانبردار اور نیکوکار ہیں۔

(۱۷) موت آجائے انسان کو یہ کس قدر کافر اور ناشکر گزار ہے؟

(۱۸) خدا نے اسے کس چیز سے پیدا کیا ہے؟

(۱۹) اسے ناچیز نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کا ہ لگایا اور اسے موزوں بنایا۔

(۲۰) پھر اس کے لیے راستہ آسان کیا۔

(۲۱) اس کے بعد اسے مار دیا اور قبر میں دفن کیا۔

(۲۲) پھر جس وقت چاہے گا اسے زندہ کرے گا۔

(۲۳) اس طرح نہیں ہے جیسے وہ خیال کرتا ہے اس نے ابھی تک حکم خدا کی اطاعت نہیں کی ہے۔

تفسیر

صرف پاک لوگوں کا ہاتھ قرآن کے دامن تک پہنچتا ہے

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں گفتگو اس شخص کی سرزنش کے بارے میں تھی جس نے ایک حق طلب نابینا کی طرف توجہ کم کی تھی، ان آیات میں قرآن مجید کی اہمیت، اس کے پاک مبداء اور اس کی نفوس میں تاثیر کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہرگز اس کام کی تکرار نہ کر اور اس کو ہمیشہ کے لیے بھول جا" (کلا)۔ "یہ آیات چونکہ خلق خدا کے تذکرہ یاد آوری کا وسیلہ ہیں" (انھا تذکرۃ) [1]

---

[1] "انھا" کی ضمیر جو مؤنث ہے آیات قرآن کی طرف لوٹتی ہے۔

اس چیز کی ضرورت نہیں کہ پاک دل مستضعفین سے تُو غافل ہو کر اثر و رسوخ رکھنے والے مغرور افراد پر توجہ دے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "کلّا انھا تذکرۃ" کا جملہ مشرکین اور دشمنانِ اسلام کی ان تمام تہمتوں کا جواب ہو جو قرآن کے بارے میں تھیں کبھی اسے شعر کہتے تھے، کبھی جادو، کبھی اس قسم کی کہانت۔ قرآن کہتا ہے ان تہمتوں میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے بلکہ یہ آیات بیداری، آگاہی، یاد آوری اور ایمان کا وسیلہ ہیں اور اس کی دلیل خود انہی میں پوشیدہ ہے اس لیے کہ جو شخص بھی اس کے نزدیک ہوتا ہے، سوائے معاندین، کج بحث اور ہٹ دھرم افراد کے، وہ یہ اثر اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

جو شخص چاہے اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے (فمن شاء ذکرہ)۔[1]

یہ تعبیر اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جبر و اکراہ درمیان میں نہیں ہے اور اس بات کی دلیل بھی ہے کہ انسان اپنے ارادے میں آزاد ہے۔ جب تک وہ نہ چاہے اور قبول ہدایت کا مصمم ارادہ نہ کرے آیاتِ قرآنی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "خدا کے یہ عظیم کلمات بیش قیمت صحائف میں ثبت ہیں (الواح و اوراق میں) (فی صحف مکرمۃ)۔

"صحف" صحیفہ کی جمع ہے جو لوح، تختی، ورقہ یا کوئی اور چیز ہے جس پر کسی مفہوم کو لکھتے ہیں۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ آیاتِ قرآن پیغمبر اکرمؐ پر نزول سے پہلے کچھ الواح پر لکھی ہوئی تھیں اور وحی کے فرشتے انہیں اپنے ساتھ لے کر آتے تھے۔ بہت ہی گراں قدر اور بیش قیمت الواح تھیں۔

یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ صحف سے مراد گزشتہ انبیاء کی کتب ہیں غالباً یہ قبل و بعد کی آیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح یہ جو کہا گیا ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے وہ بھی مناسب نظر نہیں آتا کیونکہ لفظ صحف صیغۂ جمع کی شکل میں لوح محفوظ کے بارے میں استعمال نہیں ہوا۔ اس کے بعد فرماتا ہے:

"یہ صحائف و الواح بیش قیمت اور پاکیزہ ہیں" (مرفوعۃ مطھرۃ)۔ یہ اس سے بالاتر ہیں کہ نااہلوں کے ہاتھ ان کی طرف بڑھیں یا ان میں تحریف کرنے کی ان میں طاقت ہو۔ اور یہ اس سے زیادہ پاک ہیں کہ ناپاک لوگوں کے ہاتھ انہیں آلودہ کریں۔ نیز ہر قسم کے تناقض، تضاد اور شک و شبہ سے پاک ہیں۔ اس سے قطع نظر یہ آیاتِ الٰہی سفیروں کے ہاتھ میں ہیں۔ (بایدی سفرۃ)۔ "بلند مقام مطیع و فرماں بردار اور نیکو کار سفیر" (کرام بررۃ)۔

"سفرۃ" (بروزن طلبہ) سفر کے مادہ سے سافر کی جمع ہے جس کے معنی اصل میں کسی چیز کے رُخ

---

[1] "ذکرہ" کی ضمیر اسی چیز کی طرف لوٹتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں مراد آیات ہیں لہٰذا ضمیر مؤنث ہے اور یہاں خود قرآن کی طرف اشارہ ہے جو مذکر لفظی ہے۔

سے پردہ اٹھانے کے ہیں۔ اسی لیے وہ مختلف اقوام کے درمیان آمد و رفت رکھتے ہیں اور ان کی مشکلات دیکھتے ہیں اور مبہم باتوں سے پردہ اٹھاتے ہیں انہیں سفیر کہا جاتا ہے۔ لکھنے والے شخص کو بھی مسافر کہتے ہیں اس لیے کہ وہ کسی مطلب کے رخ سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اس بنا پر یہاں سفرہ سے مراد الٰہی فرشتے ہیں جو وحی کے سفیر ہیں یا خدا کی آیات لکھتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ سفرہ سے مراد یہاں قرآن کے حافظ قاری اور کاتب ہیں اور علماء و دانشمند ہیں جو آیاتِ الٰہی کو ہر زمانے میں شیاطین کی دسترس سے محفوظ رکھتے ہیں لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے اس لیے کہ ان آیات میں گفتگو زمانۂ نزولِ وحی یعنی عصرِ پیغمبر سے ہے نہ کہ آئندہ سے۔

ایک حدیث ہمیں امام جعفر صادقؑ کی ملتی ہے آپ نے فرمایا: الحافظ للقرآن العامل بہ مع السفرة الکرام البررة :۔ جو شخص قرآن کا حافظ ہو اور اس پر عمل کرے تو وہ سفرہ کے عظیم فرمانبرداروں کے ساتھ ہوگا۔ یہ تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ قرآن کے حافظ، مفسر اور اس پر عمل کرنے والے ان سفرہ کے ہمراہ ہیں[1] نہ یہ کہ یہ خود وہ ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس وقت یہ علماء اور حافظین قرآن فرشتوں سے ملتا جلتا کوئی کام انجام دیں تو ان کے برابر قرار پائیں گے۔

بہر حال اس ساری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام وہ لوگ جو حفظِ قرآن اور احیائے مطالب قرآن کی کوشش کرتے ہیں وہ (کرام بررہ) کی طرح بلند منزلت کے حامل ہیں۔ "کرام" کریم کی جمع ہے جو عزیز و عظیم کے معنی میں ہے اور بارگاہِ خدا میں وحی کے فرشتوں کی عظمت اور ان کے مقام کی رفعت کی طرف اشارہ ہے۔ کبھی کہا گیا ہے کہ یہ تعبیر ان کی ہر قسم کے گناہوں سے پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیت ۲۶، ۲۷ میں فرشتوں کی تعریف میں آیا ہے (بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون) "وہ خدا کے باعزت گرامی قدر بندے ہیں جو بات کرنے میں کبھی اس سے سبقت نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کے اوامر کا اجراء کرتے ہیں"

"بررة" بار کی جمع ہے (مثل طالب وطلبہ) یہ "بر" کے مادہ سے ہے جس کے معنی وسعت کے ہیں۔ اسی لیے وسیع صحرا کو بَر کہتے ہیں اور چونکہ نیکوکار افراد کا وجود وسیع ہے اور اس کی برکتیں دوسروں تک پہنچتی ہیں لہٰذا انہیں "بار" کہا گیا ہے۔

البتہ زیرِ بحث آیت میں نیکوکاری سے مراد امرِ الٰہی کی اطاعت اور گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ اسی طرح خدا نے فرشتوں کی تین صفتوں کے حوالے سے توصیف کی ہے۔ پہلی یہ کہ وہ وحی کے سفیر اور حامل ہیں۔ دوسری یہ کہ ذاتی طور پر عزت دار اور گراں قدر ہیں۔ ان کی تیسری صفت اعمال کی پاکیزگی، عبادت گزاری،

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۳۸۔

تسلیم اور نیکوکاری ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے :

ہدایتِ الٰہی سے متعلق ان تمام اسباب کے باوجود جو صحف مکرمہ میں مقربِ خدا فرشتوں کے ذریعہ انواع و اقسام کے تذکروں کے ساتھ نازل ہوئے ہیں پھر بھی یہ سرکش اور ناشکر گزار انسان پروردگار کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ "قتل ہو جائے یہ انسان کس قدر کافر و ناشکرا ہے" (قتل الانسان ما اکفرہ)[1]

کفر یہاں ممکن ہے کہ عدم ایمان کے معنی میں، یا ناشکر گزاری اور کفرانِ نعمت کے معنوں میں، یا حق پر ہر قسم کا پردہ ڈالنے کے معنی میں ہو اور مناسب یہی جامع معنی ہیں کیونکہ گزشتہ آیات میں اسباب ایمان و ہدایت کی گفتگو تھی۔

بعد والی آیت میں پروردگار کی انواع و اقسام کی نعمتوں کی بات ہے بہرحال "ان افراد پر موت" کی تعبیر سے مراد اس کے وہ معنی ہیں جو بطور کنایہ حاصل ہوتے ہیں یعنی یہ شدت غضب و متنفر کا اظہار ہے ان افراد کے بارے میں جو کافر اور ناشکر گزار ہیں۔ چونکہ عام طور پر سرکشی کا سرچشمہ غرور ہوتا ہے لہٰذا اس غرور کو ختم کرنے کے لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے :

خدا نے اس انسان کو کس چیز سے پیدا کیا ہے (من ای شیء خلقہ)۔ "اسے ناچیز و حقیر و بے قیمت نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر اسے موزوں بنایا اور تمام مرحلوں میں اس کا حساب رکھا" (من نطفۃ خلقہ فقدرہ)۔ یہ انسان اپنی حقیقی خلقت کے بارے میں کیوں غور نہیں کرتا اور اپنے بنیادی سرچشمہ کی بے قیمتی کو فراموش کیوں کیے ہوئے ہے اور پھر اس نطفۂ ناچیز سے اس نادر وجود کی تخلیق کے سلسلہ میں خدا کی قدرت پر غور کیوں نہیں کرتا۔ اس لیے کہ نطفہ سے انسان کی تخلیق میں وقت اور اس کی تمام وجودی جہتوں کا حساب، اس کے پیکر کے اعضاء، اس کی استعدادیں اور اس کی ضرورتیں یہ سب معرفتِ خدا کے لیے بہترین دلیلیں ہیں۔

"قدرہ" کا جملہ تقدیر کے مادہ سے ناپ تول اور موزوں بنانے کے معنی میں ہے۔ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ وجودِ انسانی کی ساخت میں بیس سے زیادہ دھاتیں اور دھات سے ملتی جلتی چیزیں استعمال ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے معین و مقرر اندازہ رکھتی ہے۔ اگر اس میں کمی و بیشی واقع ہو تو انسانی وجود کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس سے قطع نظر اعضائے بدن کی ساخت کی کیفیت اور ان کا ایک دوسرے سے تناسب و ارتباط دقیق اندازہ پر مشتمل ہے۔

---

[1] "قتل الانسان" کی تعبیر ایک قسم کی بددعا ہے اور زمخشری کے بقول (کشاف میں) یہ بدترین قسم کی نفرین ہے اور "ما اکفرہ" میں لفظ ما تعجب کے اظہار کے لیے ہے۔ اس پر تعجب ہے کہ تمام اسبابِ ہدایت رکھتا ہے اور خدا کی نعمتیں بھی اسے حاصل ہیں پھر بھی کفر کی راہ اختیار کرتا ہے۔

نیز وہ استعدادیں اور میلانات جو انسان میں انفرادی طور پر ہیں اور مجموعۂ جہانِ بشریت میں چھپے ہوئے ہیں، ضروری ہے کہ خاص حساب کے مطابق ہوں تاکہ سعادت انسان کی تکمیل کریں۔

خدا وہ ہے جس نے یہ تمام حساب اس حقیر نطفہ میں انجام دیا۔ وہ نطفہ جو اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر تمام انسانی افراد کی تعداد کے مطابق زندگی کے اصلی سیل (CELL) جو نطفہ کے پانی میں تیر رہے ہیں ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو انگلی کی ایک پور کو پُر نہیں کر سکتے۔

جی ہاں! اس قسم کے چھوٹے سے وجود میں خدا نے ان سب بدائع اور نقوش کی تصویر کشی کی ہے اور انہیں اس میں ودیعت کیا ہے۔ بعض مفسرین نے تقدیر کے معنی آمادہ کرنا تجویز کیے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ تقدیر سے مراد اس ناچیز نطفہ میں ایجادِ قدرت ہے۔ وہ خدا کتنا عظیم ہے جس نے اس معمولی سے وجود کو یہ سب قدرت و توانائی بخشی ہے جو آسمان و زمین اور سمندروں کی گہرائیوں کو اپنی جولاں گاہ بنا سکتا ہے اور اپنے گرد و پیش کی تمام توانائیوں کو زیرِ تسلط لا سکتا ہے[1]

ان تینوں تفسیروں کے درمیان جمع ممکن ہے۔ اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"پھر راستے کو اس کے لیے آسان کر دیا" (ثم السبیل یسرہ)۔ شکم مادر میں جنین کی پرورش اس کے تکامل و ارتقاء اور اس کے بعد اس دنیا کی طرف اس کے منتقل ہونے کو سہل و آسان بنا دیا۔ انسان کی پیدائش کے عجائبات میں سے یہ ہے کہ پیدا ہونے کے لمحات سے پہلے وہ شکم مادر میں اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا سر اوپر کی طرف ہوتا ہے اور اس کا چہرہ ماں کی پشت کی جانب اور اس کے پاؤں رحم کے نچلے حصہ میں ہوتے ہیں لیکن جب تولد کا فرمان صادر ہوتا ہے تو وہ اچانک الٹا ہو جاتا ہے اس کا سر نیچے کی طرف ہو جاتا ہے اور یہی صورتِ حال اس کی پیدائش کو اس کے اور اس کی ماں کے لیے آسان بنا دیتی ہے۔ البتہ بعض اوقات ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو سر کی بجائے پاؤں کی طرف سے متولد ہوتے ہیں اور ماں کے لیے مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔

پیدائش کے بعد بھی بچپن کے دور میں جسم کی نشوونما پھر رشد و بلوغ و غرائز کی نشوونما کو اس کے لیے آسان بنا دیا ہے اس کے بعد ہدایتِ معنوی اور حصولِ ایمان کو عقل اور دعوتِ انبیاء کے ذریعہ سہل کر دیا۔ کیسا جامع اور جاذب توجہ جملہ ہے جو مختصر ہونے کے باوجود ان تمام معاملات کی طرف اشارہ کرتا ہے "ثم السبیل یسرہ" یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ فرماتا ہے:

"راہ کو انسان کے لیے آسان کیا" یہ نہیں فرماتا کہ اس کو اس راستے کے طے کرنے پر مجبور کیا۔ یہ انسان

---

[1] راغب نے مفردات میں کہا ہے "قدرہ بالتشدید: اعطاہ القدرۃ یقال قدرنی اللہ علی کذا وقوانی علیہ" اس بنا پر تقدیر کا مادہ عطائے قدرت و قوت کے معنی میں بھی آیا ہے۔

کے ارادہ کی آزادی اور اختیار کے بارے میں دوسری تاکید ہے۔ پھر اس طولانی راہ کو طے کرنے کے بعد انسان کی عمر کے اختتام کے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتا ہے:

"پھر اس کو مارتا ہے اور قبر میں پنہاں کرتا ہے" (ثم اماته فاقبره)۔ یقیناً (اماته) مارنا خدا کا کام ہے لیکن قبر میں پنہاں کرنے کا کام ظاہراً انسان سے متعلق ہے لیکن چونکہ اس کام کے لیے عقل و ہوش اور اسی طرح دوسرے وسائل کو خدا نے فراہم کیا ہے لہٰذا اس کام کی خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کام کے خدا کی طرف نسبت دینے سے مراد یہ ہے کہ اس نے انسان کے لیے قبر کو خلق کیا ہے اور وہ مٹی کے اندر کا حصّہ ہے اور بعض نے اس کو میّتوں کے دفن کرنے کے سلسلہ میں حکمِ تشریعی اور دستورِ الٰہی کے معنوں میں لیا ہے۔

بہرحال نوعِ بشر کے بارے میں الٰہی احترام میں سے ایک یہی چیز ہے یعنی ان کے اجسام کو دفن کرنا اس لیے کہ اگر دفن کرنے کا کوئی سلسلہ نہ ہوتا یا اس کے بارے میں کوئی حکم صادر نہ ہوا ہوتا اور بدنِ انسانی زمین پر رہ جاتا اور بدبودار ہو جاتا اور اس کے بعد درند و پرند کا لقمہ بنتا تو کیسی عجیب قسم کی ذلّت و خواری تھی۔

اس بنا پر نہ صرف اس دنیا میں انسان کے حال پر اللہ کا کرم ہے بلکہ موت کے بعد بھی اس کا کرم اس کے شاملِ حال ہے۔ اس سے قطع نظر مُردوں کے دفن کرنے کا حکم (غسل و کفن و نماز کے بعد) ایک الہام بخش دستور ہے اس کی رو سے انسان کے مُردوں کو ہر طرح سے پاک و محترم ہونا چاہیئے۔ زندہ تو بہرحال ان سے بہتر ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں موت کو اللہ کی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اگر دقّتِ نظر سے کام لیا جائے تو صورتِ حال اسی قسم کی ہے، اس لیے کہ اوّل تو موت اس دنیا کی تکالیف سے رہائی کی تمہید ہے۔ اس کے بعد انسان ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے جو بہت زیادہ وسیع ہے۔ دوسرے یہ کہ موجودہ نسل کی موت آنے والی نسلوں کے لیے جگہ کے وسیع ہونے کا سبب بنتی ہے اور نوعِ انسانی کے تکامل حاصل کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔

اگر یہ صورتِ حال نہ ہو تو دنیا انسانوں کے لیے اس قدر تنگ ہو جاتی کہ روئے زمین پر زندگی گزارنا غیر ممکن ہو جاتا۔ جاذبِ توجہ یہ بات ہے کہ ایک لطیف اشارہ کے ضمن میں سورہ رحمٰن کی آیت ۲۶ سے لے کر ۲۸ تک فرماتا ہے:

(کل من علیها فان ویبقیٰ وجه ربک ذوالجلام والاکرام فبای آلاءِ ربکما تکذبان) "تمام وہ لوگ جو روئے زمین پر زندگی بسر کرتے ہیں مر جائیں گے صرف تیرے پروردگار کی ذاتِ گرامی و پُر جلال باقی رہ جائے گی۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔

ان تینوں آیتوں کے مطابق موت خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ جی ہاں! دنیا اپنی تمام

نعمتوں کے باوجود مومن کے لیے ایک زندان ہے اور اس دنیا سے نکلنا اس زندان سے آزاد ہونا ہے۔ اس سے قطع نظر خدا کی عطا کی ہوئی بہت زیادہ نعمتیں بعض اوقات کسی گروہ کے لیے غفلت کا سبب بن جاتی ہیں اور موت کی یاد غفلت کے پردے ہٹا دیتی ہے۔ لہٰذا موت اس لحاظ سے بھی تنبیہ کرنے والی اور خبردار کرنے والی نعمت ہے۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر دنیاوی زندگی اگر جاری رہے تو وہ یقیناً انسان کو تھکا دینے والی ہے۔ برخلاف زندگی اخروی کے کہ وہ سراپا نشاط و خوشدل ہے۔[1]

اس کے بعد انسانوں کے قبر سے اٹھنے کے مرحلہ کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"اس کے بعد جب چاہے گا اسے زندہ کر کے حساب اور جزا و سزا کے لیے محشور کرے گا" (ثم اذا شاء انشرہ)۔

"انشرہ" انشار کے مادہ سے جمع کرنے کے بعد پھیلانے کے معنی میں ہے۔ یہ بڑی عمدہ تعبیر ہے جو یہ بتاتی ہے کہ موت کے بعد انسانوں کی زندگی کلی طور پر جمع ہو جائے گی اور قیامت میں زیادہ عظیم اور بہتر ماحول میں ہوگی۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ مرنے اور قبر میں پنہاں ہونے کے مسئلہ میں مشیتِ الٰہی کی تعبیر سے کام لیا گیا ہے لیکن یہاں کہتا ہے: "جس وقت خدا چاہے گا اُسے زندہ کرے گا" تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے کہ اس بنا پر ہو کہ کوئی فرد اس عظیم حادثہ (قیامت) کی تاریخ سے باخبر نہیں ہے۔ صرف خدا ہی جانتا ہے لیکن موت کے بارے میں اجمالی طور پر معلوم ہے کہ انسان عمرِ طبعی کا ایک حصہ طے کرنے کے بعد، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے، اسے ضرور موت آئے گی۔

آخری زیرِ بحث آیت میں فرماتا ہے انسان نے ان تمام نعمتوں کے باوجود اس دن سے لے کر جس دن یہ بے قیمت نطفہ کی شکل میں تھا اس دن تک جب اس دنیا میں قدم رکھا اور اپنی راہِ کمال طے کی پھر اس دنیا سے وہ چلا گیا اور قبر میں پنہاں ہو گیا اور اس نے اپنی صحیح راہ اختیار نہیں کی۔ "اس طرح نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتا ہے اس نے ابھی تک فرمانِ الٰہی کو انجام نہیں دیا" (کلا لما یقض ما امرہ)۔[2]

---

[1] شاعر کہتا ہے: من از دو روزۂ عمر آمدم بہ جاں اے خضر چہ می کنی تو کہ یک عمر جاوداں داری
اے خضر! میں دو دن کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں، آپ کا کیا حال ہوگا جنہیں عمر جاودانی ملی ہے۔

[2] بعض نے یہاں کلّا کی تفسیر حقا کی ہے لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ اپنے مشہور و معروف معنی لیے ہوئے ہے اور "لما یقض" کے معنی میں ہے اس لیے کہ بہت سے کوتاہ بیں افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا کے معاملہ میں انہوں نے اپنی ذمہ داریاں انجام دے دی ہیں۔ آیت کہتی ہے ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔

"لمّا" کی تعبیر جو عام طور پر انتظار اور نفی کے پہلو کو لیے ہوئے ہوتی ہے اُس سے اِس طرف اشارہ ہے کہ تمام الٰہی نعمتوں کی موجودگی سے اور بیداری کے اُن تمام وسائل کے ہوتے ہوئے جو انسان کے اختیار میں ہیں یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ امرِ الٰہی کی اطاعت میں بہت زیادہ کوشاں ہو لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس نے ابھی تک اس ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔

یہ بات کہ انسان سے مراد یہاں کون سے افراد ہیں اس کے بارے میں دو تفسیریں ہیں پہلی یہ کہ اس سے مراد وہ انسان ہیں جو کفر، نفاق، انکارِ حق اور ظلم و عصیاں کی راہ پر گامزن ہیں۔ سورہ ابراہیم کی آیت ۳۴ کے قرینہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے جس میں فرماتا ہے:

(ان الانسان لظلوم کفار) "انسان بہت ہی ظالم، کافر اور ناشکر گزار ہے"۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس میں بہت انسان شامل ہیں، اس لیے کہ کسی شخص نے بھی، عام اس سے کہ مومن ہو یا کافر، حقِ عبودیت و بندگی کو اس طرح ادا نہیں کیا جس کی عظمتِ خدا مستحق ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں:

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش — عذر بہ درگاہِ خدا آورد
ورنہ سزاوارِ خداوندیش — کس نتواند کہ بجا آورد

وہی بندہ اچھا ہے جو بارگاہ خداوندی میں اپنی کوتاہی کا عذر پیش کرے ورنہ اس کی بارگاہ کے لائق کوئی شخص بھی بندگی کا فرض ادا نہیں کر سکتا۔

(۲۴) فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۙ
(۲۵) اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ
(۲۶) ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ
(۲۷) فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ
(۲۸) وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ
(۲۹) وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ
(۳۰) وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ
(۳۱) وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ
(۳۲) مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ

ترجمہ

(۲۴) انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی غذا کو دیکھے۔
(۲۵) ہم نے آسمان سے وافر تعداد میں پانی برسایا۔
(۲۶) پھر زمین کو چیرا۔
(۲۷) اور اس میں بہت سے دانے اگائے۔
(۲۸) اور انگور اور بہت سی سبزیاں۔
(۲۹) اور زیتون اور بہت سے کھجور کے درخت۔
(۳۰) اور درختوں سے پُر باغات۔

(۳۱) اور پھل اور چراگاہیں۔

(۳۲) تاکہ تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنیں۔

تفسیر

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی غذا کی طرف دیکھے

چونکہ گزشتہ آیات کا موضوع مسئلہ معاد تھا اور یہ آیات بھی کافی زیادہ صراحت کے ساتھ اسی مسئلہ کی بات کرتی ہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ زیر بحث آیات نظریۂ معاد کی دلیل کے طور پر ہیں۔

پروردگارِ عالم ان آیتوں میں ہر چیز پر خدا کی قدرت کو بیان کر کے، اور اسی طرح مُردہ زمینوں کی بارش کے نزول کے ذریعہ زندگی سے جو عالمِ گیاہ و نباتات میں ایک قسم کا معاد ہے، اس کا ذکر کر کے امکانِ قیامت کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ یہ آیات انواع و اقسام کی ان غذاؤں کے بارے میں ہیں جو خدا نے انسانوں اور چوپاؤں کے اختیار میں دی ہیں اور ان کی گفتگو کر رہی ہیں لہٰذا پروردگارِ عالم انسان کی حسِ شکرگزاری کو انگیخت دیتا ہے اور اس کو اپنے منعم کی معرفت کی دعوت دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"انسان کو چاہیئے کہ اپنی غذا کی طرف دیکھے کس طرح خدا نے اُسے پیدا کیا ہے" (فلینظر الانسان الی طعامہ) [1]

خارجی اشیاء میں انسان کے سب سے زیادہ قریب اس کی غذا ہے جو کچھ تبدیلی کے بعد انسان کے بدن کا جزو بن جاتی ہے۔ اگر اس تک وہ غذا نہ پہنچے تو یہ بہت جلد فنا ہو جائے۔ اسی لیے قرآن نے تمام موجودات میں سے صرف ایسے غذائی مواد پر انحصار کیا ہے جو گیاہ و نباتات و اشجار سے حاصل ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ دیکھنے سے مراد محض ظاہری طور پر دیکھنا نہیں ہے بلکہ اس موادِ غذائی کی ساخت اور بناوٹ کے بارے میں اور اس کے حیات بخش اجزاء کے بارے میں اور عجیب و غریب اثرات پر جو وہ وجودِ انسانی پر مرتب کرتی ہیں، غور و فکر کرنا ہے۔

اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد ظاہری طور پر نگاہ کرنا ہی ہے، وہ نگاہ کرنا لعابِ دہن کے غدودوں کی تحریک کا باعث ہوتا ہے، وہ غلط ہے، اس لیے کہ قبل و بعد کی آیات کے قرینے سے اس قسم کا کوئی تصور نہیں ملتا۔

---

[1] ممکن ہے فلینظر کا جملہ شرط مقدر کی جزا ہو اور تقدیر میں اس طرح ہے ان کان الانسان فی شک من ربہ و من البعث فلینظر الی طعامہ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیہ شریفہ میں طعام کے معنی وسیع ہیں اور نگاہ کرنے اور دیکھنے کے معنی بھی وسیع ہیں۔اس بنا پر مندرجہ بالا تینوں تفسیریں اس میں جمع ہوسکتی ہیں۔ یہ کہ یہاں انسان سے مراد کون شخص ہے، کے بغیر واضح ہے کہ تمام انسان اس میں شامل ہیں۔عام اس سے کہ مومن ہوں یا کافر سب کو چاہیئے کہ اپنے موادِ غذائی ان کے عجائبات اور ان میں پوشیدہ اسرار و رموز پر غور کریں تاکہ بے ایمان افراد کو حق کا راستہ ملے اور مومن افراد کی ایمان کی قوت میں اضافہ ہو۔

واقعی موادِ غذائی، پھل، غذائی اجناس اور سبزیوں میں سے ہر ایک چشم بصیرت کے لیے ایک ایسی تعجب خیز دنیا رکھتے ہیں جس کا مدتوں مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور ان سے درس حاصل کیے جا سکتے ہیں جو تمام عمر ہمیں روشنیِ دانش دے سکتے ہیں۔

اس کے بعد اس غذائی مواد اور اس کے منابع کی تفصیلات بتاتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے آسمان سے بہت زیادہ پانی پھینکا" (انّا صببنا الماء صبّا)۔

"صب" اوپر سے پانی پھینکنے کے معنوں میں ہے یہاں اس سے مراد پانی کا بارش کی صورت میں برسنا ہے۔آیت کے آخر میں "صبا" کی تعبیر تاکید کے لیے ہے اور اس پانی کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے۔

جی ہاں! وہ پانی جو اہم ترین سببِ حیات ہے۔ہمیشہ بہت زیادہ مقدار میں پروردگار کے لطف و کرم سے آسمان سے نازل ہوتا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ تمام نہریں اور چشمے اور پانی کے کنویں اپنے پانی کے ذخائر بارش ہی سے حاصل کرتے ہیں اور سب کا اصل سبب بارش ہی ہے کہ:

اگر باراں بہ کوہستان نبارد — بہ سالے دجلہ گردد خشک رودے

اگر پہاڑوں پر بارش نہ ہو تو ایک ہی سال میں دجلہ خشک نالے میں تبدیل ہو جائے۔

اس لیے موادِ غذائی کے مطالعہ کے وقت ہر چیز سے پہلے انسان بارش کے نظام کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ کس طرح سورج ہمیشہ دریاؤں کی سطح پر چمکتا ہے اور وہاں سے بادل اٹھتے ہیں، ہوائیں انہیں چلاتی ہیں اور پھر سطح زمین سے دور ہونے کے باعث اور سرد فضا کے علاقہ میں پہنچ جانے کی وجہ سے دوبارہ پانی میں تبدیل ہو کر برستے ہیں۔آب مصفّٰی، جو ہر قسم کی مضر اور نمکین آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے قطروں کی شکل میں یا برف کے ان نرم گالوں کی صورت میں جو آہستہ سے زمین کی طرف آتے ہیں اور گھاس اور درختوں میں جذب ہو جاتے ہیں، زمین پر نازل ہوتا ہے۔

پانی کا ذکر کرنے کے بعد جو نبات کے روئیدہ ہونے کا ایک اہم سبب ہے، ایک اور رکن یعنی زمین کا رُخ کرتا ہے اور مزید فرماتا ہے: "پھر زمین کو ہم نے شگافتہ کیا" (ثم شققنا الارض شقّا)۔

بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ شگافتہ کرنا کونپلوں کے ذریعہ زمین کے چیرنے کی طرف اشارہ ہے۔واقعی یہ بہت ہی عجیب و غریب چیز ہے کہ کونپل اس نرمی اور لطافت کے

باوجود سخت قسم کی مٹی کو چیر کر اور کبھی پہاڑی پتھروں کے اندر سے اپنا سر باہر نکالتی ہیں۔ خالقِ عظیم نے اس لطیف کونپل میں کیا عظیم قدرت ودیعت کی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ انسانوں کے ہل چلانے کے ذریعہ زمین کو شگافتہ کرنا مراد ہے حتیٰ کہ ان کیڑوں کے ذریعہ جو دوسرے حیاتی عوامل کے ہمراہ ایک قسم کا ہل چلانے کا عمل انجام دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہل چلانا انسان کا کام ہے لیکن چونکہ اس کے تمام وسائل خدا نے اس کے اختیار میں رکھے ہیں لہٰذا اس کو خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

تیسری تفسیر جو اس تعبیر کے لیے نظر آتی ہے اور کئی پہلوؤں سے قابلِ ترجیح ہے، یہ ہے کہ زمین کے شگافتہ ہونے سے مراد اس کی سطح کے پرزوں کا ریزہ ریزہ ہونا ہے۔

اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ ابتدا میں سطح زمین کو قشرِ عظیم اور بہت بڑے طبقہ نے پوشیدہ کر رکھا تھا۔ پے در پے شدید بارشیں ہوئیں انہوں نے پتھروں کو شگافتہ کیا، اس کے ذروں کو جدا کیا اور زمین کے کچھ حصّوں میں اور اس کے کچھ گڑھوں میں وسعت پیدا ہوئی اور اس طرح مٹی کے قابلِ زراعت تودے تشکیل پائے اور اب بھی سیلاب اس کے کچھ حصّوں کو تحلیل کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں لیکن نئی مٹی جو برف اور بارش کی وجہ سے ازسرِ نو تشکیل پاتی ہے اس کی جگہ لے لیتی ہے ورنہ زراعتی مٹی کمیاب ہو جاتی۔

اس طرح یہ آیت قرآن کے ایک علمی معجزے کی طرف اشارہ کر کے بتاتی ہے کہ پہلے بارشیں ہوتی ہیں، پھر زمینیں شگافتہ ہوتی ہیں اور زراعت کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ابتدائی دنوں میں یہ عمل صورت پذیر ہوا تھا بلکہ آج بھی جاری ہے۔

یہ تفسیر، اس وجہ سے کہ بعد والی آیت میں گیاہ و نباتات کے اگنے کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے، زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ تینوں تفسیروں کا اجتماع بھی کوئی تضاد یا قباحت نہیں رکھتا۔ ان دو بنیادی ارکان یعنی پانی اور مٹی کے ذکر کے بعد آٹھ قسم کی اُگنے والی چیزوں کی طرف، جو انسان اور حیوان کی غذا کے بنیادی ارکان ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس کے بعد ہم نے زمین میں بہت سے اجناس اُگائے" (فانبتنا فیھا حبًّا)۔ غذائی اناج جو انسان اور مختلف حیوانات کی غذا کا اصلی ذریعہ و سبب ہیں وہ اگر خشک سالی کی بنا پر ایک سال نہ ملیں تو قحط پڑ جائے اور بھوک تمام جہان کو گھیر لے اور تمام انسانوں پر مصیبت پڑ جائے۔

"حبًّا" کی تعبیر نکرہ کی شکل میں بیان عظمت یا ان اجناس کے مختلف الاقسام ہونے کی دلیل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے اس کی تفسیر گندم اور جَو سے کی ہے، اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔ اس لیے کہ اس تفسیر میں تمام اناج شامل ہیں۔ بعد کے مرحلے میں مزید کہتا ہے:

"اسی طرح انگور اور بہت سی سبزیاں" (و عنبًا و قضبًا)۔

"عنب" تمام پھلوں میں سے انگور کا ذکر غذائی مواد کی فراوانی کی بنا پر ہے جو اس پھل میں پوشیدہ ہے اور اسے ایک مکمل غذا کی شکل میں لے آیا ہے (توجہ فرمائیں کہ عنب انگور کو بھی کہا جاتا ہے اور انگور کی بیل کو بھی اور آیاتِ قرآنی میں اس کا دونوں پر اطلاق ہوا ہے۔ لیکن یہاں مناسب انگور ہی ہے)۔

"قضب" (بروزن جذب) اصل میں ان سبزیوں کے معنی میں ہے جنہیں مختلف موقعوں پر توڑتے ہیں یہاں مختلف قسم کی کھائی جانے والی سبزیوں کے معنی میں ہے اور انگور کے بعد اس کا ذکر اس غذائی مواد کی اہمیت کی دلیل ہے جس پر موجودہ غذا شناسی کے علم میں حد سے زیادہ انحصار کیا جاتا ہے۔ کبھی لفظ قضب قطع کرنے اور توڑنے کے معنی میں آتا ہے اور لفظ قضیب درخت کی شاخ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور سیف قاضب شمشیر قاطع کے معنوں میں ہے۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ قضب سے یہاں مراد "رطب" تر و تازہ کھجوریں ہیں جنہیں درخت سے توڑتے ہیں لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے اس لیے کہ بعد والی آیت میں رطب کی طرف علیحدہ اشارہ ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ قضب بوئے جانے والے پھلوں کے معنی میں ہے (کھیرا تربوز وغیرہ) یا گیاہ و نبات کی جڑوں کے معنی میں ہے لیکن بعید نہیں ہے کہ یہاں قضب کے معنی وسیع ہوں جس میں کھائی جانے والی سبزیاں بھی شامل ہوں، بوئے جانے والے پھل بھی اور غذائی جڑیں بھی (جو جڑ کی صورت میں ہوتی ہیں (آلو پیاز وغیرہ) اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"اور زیتون اور بہت سے کھجوروں کے درخت"۔ (و زیتونًا و نخلًا)۔

ان دو پھلوں پر انحصار کی دلیل بھی واضح ہے اس لیے کہ موجودہ زمانے میں ثابت ہو چکا ہے کہ زیتون اور کھجوریں اہم ترین، طاقت بخش، مفید اور صحت آفریں مواد غذائی ہیں۔ اس کے بعد کے مرحلے میں کہتا ہے:

"اور پُر درخت باغات" (انواع و اقسام کے پھلوں کے ساتھ)۔ (و حدائق غلبًا)۔ "حدائق" حدیقہ کی جمع ہے ایسے باغ کے معنوں میں جس کے اطراف میں دیوار ہو اور وہ محفوظ ہو۔

یہ اصل میں زمین کے اس ٹکڑے کے معنی میں ہے جس میں پانی ہو۔ یہ لفظ حدقہ چشم (آنکھ کے ڈھیلے) سے لیا گیا ہے جس میں ہمیشہ پانی رہتا ہے۔ چونکہ اس قسم کے باغات عام طور پر پھلدار ہوتے ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ جنت کے انواع و اقسام کے پھلوں کی طرف اشارہ ہو۔

"غلب" (بروزن قفل) اغلب اور غلبا کی جمع ہے جس کے معنی موٹی گردن والے کے ہیں۔ یہ اصل میں غلبہ کے مادہ سے لیا گیا ہے اور یہاں بلند اور گھنے درختوں کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"اور پھل اور چراگاہ" (و فاکھة و ابًّا)۔ "اب" (ب کی تشدید کے ساتھ) خود رو گھاس اور اس چراگاہ کے معنوں میں ہے جو جانوروں کے چرانے کے لیے ہو۔ یہ اصل میں آمادگی کے معنی دیتا ہے اور چونکہ

اس قسم کی چراگاہیں استفادہ کی غرض سے تیار ہوتی ہیں لہٰذا انہیں اب کہا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اب سے مراد ایسا خشک میوہ ہے جو سردی کے موسم کے لیے خشک کیا جاسکے اور اس کا ذخیرہ کیا جاسکے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ فائدہ پہنچانے کے لیے مستعد ہوتا ہے۔

بہت سے اہلِ سنت اور شیعہ مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ ایک دن حضرت عمر منبر پر تھے انہوں نے ان آیتوں کی تلاوت کی۔ اس کے بعد کہا ان سب کو تو میں جانتا ہوں لیکن اب کیا چیز ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد وہ عصا جو ان کے ہاتھ میں تھا اس کو ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا خدا کی قسم! یہ ایک طرح کا تکلف ہے کیسی مشکل ہے کہ تو اب کے معنی نہیں جانتا۔ (لوگوں کو مخاطب کر کے کہا) تم ان چیزوں کی پیروی کرو جو تمہارے لیے بیان کی گئی ہے اور ان ہی عمل کرو۔ جس بات کو تم نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے اسے اپنے پروردگار کے سپرد کر دو۔[1]

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وہ لفظ اب کے مفہوم کو پیچیدہ سمجھتے تھے حالانکہ لغتوں کے متن کی طرف توجہ کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کا کوئی پیچیدہ مفہوم نہیں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ در المنثور میں آیا ہے کہ یہی سوال حضرت ابوبکر سے بھی کیا گیا انہوں نے کہا کہ میں اگر کتابِ خدا کے بارے میں ایسی بات کہوں جسے میں نہیں جانتا تو کونسا آسمان مجھ پر سایہ ڈالے اور کونسی زمین ہوگی جو مجھے قبول کرے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ بہت سے اہلِ سنت علماء نے ان دو روایتوں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کوئی شخص ایسے مسائل کے بارے میں جنہیں وہ نہ جانتا ہو خصوصاً کتاب اللہ کے بارے میں اگر نہ جانتا ہو تو کوئی بات نہ کرے۔ پھر بھی اس سوال کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ وہ شخص جو خلیفۃ الرسول اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے حکومت کرنا چاہتا ہو وہ اس لفظ کے معنی سے آگاہ نہ ہو جو متن قرآن مجید میں ہے اور جو معانی کے اعتبار سے کوئی خاص پیچیدگی نہیں رکھتا۔

یہ اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ہر زمانہ میں ایک خدائی رہبر لوگوں کے درمیان ہو جو شریعت کے تمام مسائل سے آگاہ ہو اور ہر خطا و اشتباہ سے مصون و معصوم ہو۔ اسی لیے اس حدیث کے ذیل میں جو مرحوم مفید نے ارشاد میں نقل کی ہے ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت یہ ماجرا امیر المومنین حضرت علیؑ سے بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

(سبحان اللہ اما علم ان الاب ھو الکلاء والمرعی و ان قولہ تعالیٰ "وفاکھۃ و ابّاً" اعتداد من اللہ بانعامہ علیٰ خلقہ فیما غذاھم بہ و خلقہ لھم والانعامھم مما یحیٰ بہ

---

[1] تفسیر روح المعانی، قرطبی، فی ظلال القرآن، در المنثور اور المیزان زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

انفسھم و تقوم بہ اجسادھم) "عجیب بات ہے کیا وہ نہیں جانتا کہ اب خود رو گھاس اور چراگاہ کے معنی میں ہے اور یہ کہ "وفاکھۃ و ابا" کا جملہ خدا کی اپنے بندوں پر عنایت ہے اس اعتبار سے کہ اُس نے انہیں غذائی مواد دیئے ہیں اور انہیں ان کے لیے اور ان کے چوپایوں کے لیے ایسی چیزوں میں سے پیدا کیا ہے جو ان کی زندگی کا سبب اور ان کے جسم کی بنیادی ضرورت ہیں[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ گزشتہ آیات میں بعض پھل خصوصیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اور یہاں بطور کلی پھل پیش کیا گیا ہے اور اس سے قطع نظر گزشتہ آیت میں جس میں باغوں کی بات تھی بظاہر باغوں کے پھل پیش نظر تھے، تو پھر یہاں میوے اور پھل کو کس لیے پیش کیا گیا ہے۔ ہم جواب میں کہتے ہیں کہ بعض پھلوں کا خصوصیت کے ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً انگور، زیتون اور خرما وغیرہ کا (درخت نخل کے قرینہ کے پیش نظر) تو یہ ذکر ان پھلوں کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر ہوا ہے[2]

اب رہی یہ بات کہ "فاکھۃ" (پھل) ان کا "حدائق" (باغات) سے الگ کیوں ذکر ہوا ہے تو یہ ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ باغات پھلوں کے علاوہ دوسرے منافع بھی رکھتے ہیں اور ان کے خوبصورت منظر ہوتے ہیں خوشگوار ہوا ان میں ہوتی ہے اور اس قسم کی دوسری چیزیں۔

اس سے بھی قطع نظر بعض خود رو درخت کچھ بجائے، خود اور کچھ کی جڑیں اور چھلکے غذا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں (مثلاً چائے، زنجبیل، دارچینی وغیرہ) اس کے علاوہ بہت سے درختوں کے پتے حیوانوں کے لیے مناسب خوراک کا کام دیتے ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ گزشتہ آیات میں آیا ہے اس میں انسان کی خوراک بھی شامل ہے اور حیوانات کی بھی۔ اسی لیے بعد والی آیت میں جو آخری زیر بحث آیت ہے مزید کہتا ہے:

"تاکہ تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ ہوں" (متاعاً لکم ولانعامکم)۔ متاع ہر وہ چیز ہے جس سے انسان متمتع ہو اور فائدہ اٹھائے۔

ایک نکتہ
صحیح و سالم موادِ غذائی

جو کچھ گزشتہ آیات میں انسانوں اور چوپایوں کے لیے آیا تھا وہ آٹھ قسم کے موادِ غذائی تھے اور جاذب توجہ یہ ہے کہ وہ سب نباتات سے تعلق رکھنے والی غذائیں ہیں۔ یہ اس اہمیت کی بنا پر ہے جو انسانی غذا کے سلسلے میں ان اجناس، میووں اور پھلوں سے وابستہ ہیں۔

---

[1] و [2] ارشاد مفید مطابق نقل المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۱۹۔

غور سے دیکھا جائے تو انسان کی حقیقی غذا یہی چیزیں ہیں۔ حیوانی غذائیں تو دوسرے درجہ پر ہیں اور بہت کم مقدار میں ہیں۔

یہاں جو کچھ اس قابل ہے کہ اس پر توجہ کی جائے وہ یہ ہے کہ اس زمانے کا غذا شناسی کا علم جو ایک وسیع اور اہم علم ہے، وہ حقیقت میں جس چیز کی تفصیل و تشریح کرتا ہے وہ وہی چیز ہے جو ان آیات میں آئی ہے۔ اس طرح وہ علم عظمتِ قرآن کو پیش کرتا ہے خصوصاً وہ موادِ غذائی جس کا اوپر والی آیات میں ذکر ہوا ہے۔

خصوصاً وہ غذائی مواد جن کا اوپر والی آیات میں تذکرہ ہوا ہے، ان میں سے ہر ایک غذا شناسی کی رُو سے بہت ہی اہم اور قیمتی ہے۔ بہرحال ان امور پر غور و خوض انسان کو اس کے خالق کی عظمت اور نوعِ بشر پر اس کی مہربانیوں سے بہت زیادہ آشنا کرتی ہے۔ جی ہاں! غذائے جسمانی کے بارے میں غور و فکر اور اسی طرح روح کی غذا کے بارے میں دائرۂ علم کے لحاظ سے بھی اور اکتساب کے طریقوں کے اعتبار سے بھی جو غور و فکر ہے وہ انسان کو معرفتِ خدا، تعمیرِ ذات اور تہذیبِ نفس کی راہ میں بہت آگے لے جاتا ہے۔

جی ہاں! آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنی غذا کے بارے میں بہت زیادہ غور و فکر کرے۔ یہ مختصر سا جملہ کس قدر پُرمعنی ہے۔

(۳۳) فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝
(۳۴) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝
(۳۵) وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝
(۳۶) وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝
(۳۷) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝
(۳۸) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝
(۳۹) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝
(۴۰) وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝
(۴۱) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝
(۴۲) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝

ترجمہ

(۳۳) جب وہ مہیب صدا آئی (صیحہ قیامت) (تو کافر گھبرے رنج وغم میں ڈوب جائیں گے)۔
(۳۴) وہ دن جب انسان اپنے بھائی سے دُور بھاگے گا۔
(۳۵) اور اپنی ماں اور باپ سے۔
(۳۶) اور اپنی بیوی اور اولاد سے۔
(۳۷) اس دن ان میں سے ہر ایک کی ایک خاص وضع وکیفیت ہو گی جو

اسے مکمل طور پر اپنے آپ میں مشغول رکھے گی۔

(۳۸) کچھ چہرے اس دن خوش گوار اور نورانی ہوں گے۔

(۳۹) خنداں و مسرور۔

(۴۰) اور کچھ چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے۔

(۴۱) تاریک دھوئیں نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا۔

(۴۲) وہی کافر و فاجر ہیں۔

تفسیر

صیحہ قیامت

الٰہی برکتوں اور دنیاوی نعمتوں کے تذکرے کے بعد یہاں قرآن قیامت اور اس کے حوادث کے ایک گوشہ اور مومنین و کفار کی حالت کو بیان کرتا ہے تاکہ، ایک طرف تو یہ اعلان کرے کہ یہ نعمتیں اور مال و متاع جو کچھ بھی ہے جلد گزر جانے والا ہے اور اس کا ایک خاتمہ ہے اور دوسری طرف یہ بتائے کہ ان سب کا وجود خدا کے وجود اور قیامت پر بجائے خود ایک دلیل ہے۔ فرماتا ہے:

"جس وقت وہ مہیب اور کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز آئے گی تو کفار و مجرمین گہرے غم و اندوہ اور ندامت میں غرق ہو جائیں گے" (فاذا جاءت الصاخة) [1]

"صاخة" "صخ" کے مادہ سے اصل میں صوت شدید و سخت اور مہیب آواز کے معنی میں ہے یعنی بہت ممکن ہے کہ اس سے کان بہرے ہو جائیں یا جو سچ مچ کانوں کو بہرہ کر دیتی ہے۔ یہاں اس سے صور کے دوسرے نفخے کی طرف اشارہ ہے۔ وہی صیحہ عظیم جو بیداری اور زندگی کا صیحہ ہے۔ جو سب کو زندہ کر کے عرصۂ

---

[1] یہ کہ اس جملہ شرطیہ میں جزا کیا ہے کئی احتمال ہیں پہلا یہ کہ جزا محذوف ہے اور بعد والی آیتوں سے اس کا پتہ چلتا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (فاذا جاءت الصاخة فما اعظم اسف الکافرین)۔ جب وہ مہیب صدا آئی تو کفار کو کس قدر افسوس اور ندامت ہوگی (تفسیر مراغی) بعض مفسرین نے کہا ہے (لکل امرئ منهم یومئذ شأن یغنیه) کا جملہ جزا ہے (مجمع البیان)۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ جزا کا استفادہ (یوم یفر المرء) سے ہوتا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (فاذا جاءت الصاخة یوم یفر المرء من اخیه) (روح المعانی)۔ جب مہیب صدا آئی تو انسان اپنے بھائی سے فرار کر گیا۔

محشر کی طرف بلائے گا۔

جی ہاں! یہ اتنا عظیم اور دل ہلا دینے والا ہے جو انسان کو سوائے اس کی ذات، اس کے اعمال اور اس کی سرنوشت کے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے گا۔ اسی لیے اس کے بعد بلا فاصلہ مزید فرماتا ہے:

"وہ دن جس دن انسان اپنے بھائی سے دور بھاگے گا" (یوم یفر المرء من اخیہ)۔ وہی بھائی جو جان کے برابر تھا اور جسے ہر جگہ یاد کرتا تھا اور اس کے بارے میں متفکر رہتا تھا آج کلی طور پر اس سے گریزاں ہوگا، اور اسی طرح اپنے ماں باپ سے" (و امہ و ابیہ)۔ اور اپنی بیوی اور اولاد سے" (و صاحبتہ و بنیہ)۔

اسی طرح انسان اپنے نزدیک ترین عزیزوں کو یعنی بھائی، ماں باپ اور اولاد کو نہ صرف فراموش کر دے گا بلکہ ان سے فرار کرے گا۔ یہ بات بتاتی ہے کہ قیامت کا ہول اس قدر زیادہ ہوگا کہ انسان کو تمام تعلقات سے بیگانہ کر دے گا۔ وہ ماں جو اس سے بے حد محبت کرتی تھی، وہ ماں باپ جن کا وہ بہت زیادہ احترام کرتا تھا، وہ بیوی جس سے اُسے شدید محبت تھی، وہ اولاد جو اس کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور شمار ہوتی تھی، وہ اس وقت ان سب سے بے تعلق ہو جائے گا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انسان اپنے ان بھائیوں، ماں باپ، بیوی اور اولاد سے فرار کرے گا جنہوں نے ایمان و تقویٰ اور اطاعت خدا کی راہ نہیں طے کی۔ وہ ان سے اس لیے فرار کرے گا کہ کہیں ان کا حال اس کو اپنے نرغہ میں نہ لے لے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ فرار اس بنا پر ہے کہ مبادا ان کے کچھ حقوق اس کی گردن پر ہوں اور وہ اس سے ان کا مطالبہ کریں اور وہ خود ان کے ادا کرنے سے اس وقت عاجز ہو۔

ان تینوں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ نیز ان تینوں کے جمع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ بات کہ پہلے بھائی، اس کے بعد ماں باپ، اس کے بعد بیوی اور آخری مرحلہ میں اولاد کے بارے میں کیوں گفتگو ہوئی ہے، اس بارے میں بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ان تمام میں، سب سے نیچے کے مرحلہ سے بالاتر مرحلہ کی طرف بات ہوئی ہے کہ پہلے وہ اپنے بھائی سے گریز کرے گا، پھر اپنے ماں باپ سے اور اس کے بعد بیوی اور اولاد سے، لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سب لوگ ان پانچ افراد سے تعلق کے بارے میں یکساں نہیں ہوتے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں بھائی زیادہ اہم ہوتا ہے لہٰذا اس سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے اور کبھی بیوی اور کبھی اولاد۔ لہٰذا یہاں کوئی قاعدہ کلیہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ ان پانچ افراد میں سے ہر ایک کے ساتھ انسان کے رشتہ کی اہمیت سے متعلق بہت سے مطالب بیان کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح نہیں ہے کہ مطلق طور پر ایک کو دوسرے پر تمام جہتوں سے ترجیح دی جائے

خصوصاً اس شکل میں جس شکل میں آیت میں آیا ہے۔ اس بنا پر مندرجہ بالا ترتیب اہمیت کی بنا پر نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں اس فرار کی دلیل بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: "اس دن ان میں سے ہر ایک ایسی حالت میں ہوگا کہ جو اسے مکمل طور پر اپنی ذات سے متعلق مصروف رکھے گی (لکل امرئ منھم یومئذ شأن یغنیہ)۔

"یغنیہ" (اس کو بے نیاز کر دے گی) اس حقیقت کی طرف ایک معنی خیز کنایہ ہے کہ اس دن انسان اپنی ذات سے متعلق اس قدر مصروف ہوگا کہ دوسرے کی طرف توجہ نہیں کرے گا اور حادثات اس قدر شدید ہوں گے کہ اس کی ساری فکر کو مشغول رکھنے کے لیے کافی ہوں گے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرتؐ سے آپ کے خاندان کے کسی فرد نے سوال کیا کہ قیامت میں انسان کیا اپنے عزیز و اقارب کو یاد کرے گا؟ تو آپؐ نے فرمایا:

ثلاثة مواطن لا یذکر فیھا احد احدًا عند المیزان حتّٰی ینظر ایثقل میزانہ ام یخف؟ وعند الصراط حتّٰی ینظر ایجوزہ ام لا؟ وعند الصحف حتّٰی ینظر بیمینہ یأخذ الصحف ام بشمالہ؟ فھذہ ثلاثة مواطن لا یذکر فیھا احد حمیمہ ولا حبیبہ ولا قریبہ ولا صدیقہ ولا بنیہ ولا والدیہ وذالک قول اللہ تعالٰی: لکل امرئ منھم یومئذٍ شأن یغنیہ۔

"تین موقف ایسے ہیں جن میں کوئی شخص کسی کو یاد نہیں کرے گا۔ پہلا میزان جہاں اعمال تولے جائیں گے، وہاں جب تک یہ نہ دیکھے کہ اس کا پلڑا بھاری ہے یا نہیں۔ پھر پُل صراط، جب تک نہ دیکھ لے کہ وہ اس پر سے گزر سکے گا یا نہیں۔ پھر اس وقت جب نامہ اعمال انسانوں کے ہاتھ میں دیں گے جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ اس کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیتے ہیں یا بائیں ہاتھ میں۔ یہ تین موقف ہیں جہاں کوئی انسان کسی دوسرے کو یاد نہیں کرے گا۔ نہ قریبی دوست، نہ یارِ مہربان، نہ اعزہ، نہ مخلص ساتھی، نہ اولاد اور نہ ماں باپ۔ یہ وہی چیز ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

"اس دن انسان اپنے آپ میں بہت زیادہ مشغول ہوگا"[1] اس کے بعد اس دن جو مومنین و کفار کی حالت ہوگی اس کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس دن کچھ چہرے خوشگوار اور نورانی ہوں گے" (وجوہ یومئذ مسفرة)۔ "خندان و مسرور" (ضاحکة مستبشرة) "اور کچھ چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے" (ووجوہ یومئذ علیھا غبرة)۔ "تاریک دھوئیں نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا" (ترھقھا قترة)۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۲۹۔

"وہی کافر و فاجر ہیں" (اولٰئك هم الكفرة الفجرة)۔

"صفرة" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے "اسفار" کے مادہ سے آشکار ہونے اور چمکنے کے معنی میں ہے شب تاریک کی طرح جس کے آخر میں سپیدہ سحری ہوتا ہے۔

"غبرة" (بروزن غلبہ) "غبار" کے مادہ سے اس باقی ماندہ خاک کے معنی میں ہے جو زمین سے اٹھے اور کسی چیز پر پڑ جائے۔

"قترة" اصل میں "قتار" (بروزن غبار) کے مادہ سے اس دھوئیں کے معنی میں ہے جو جلتی ہوئی لکڑی یا کسی دوسری چیز سے اٹھتا ہے۔ بعض ارباب لغت نے اس کی غبار کے معنی میں تفسیر کی ہے لیکن اوپر والی آیت میں ان دونوں تفسیروں کو جمع کرنا یہ بتاتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ دو مختلف معانی رکھتے ہیں۔

"کفرة" اور "فجرة" اسی وزن پر کافر و فاجر کی جمع ہیں جن میں سے پہلا فاسد العقیدہ افراد کی طرف اور دوسرا فاسد العمل لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ صیحۂ قیامت کے وقت انسانوں کے بُرے عقائد اور اعمال کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوں گے۔ "وجوہ" چہرہ کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ چہرہ کا رنگ ہر چیز سے زیادہ انسان کی اندرونی حالت کو بیان کرتا ہے فکری و روحانی پریشانیوں کو بھی اور جسم سے متعلق دکھ درد کو بھی۔

بہر حال ایک گروہ وہاں مسرور ہوگا ان کے چہرے شگفتہ اور نورانی ہوں گے۔ ایمان کی روشنی اور عمل کی پاکیزگی ان کے چہروں پر موجزن ہوگی۔

رنگ رخسارہ انھا خبراز سرّ دروں می دھد

ان کے رخسارے کا رنگ ان کے اندر کے راز کی خبر دیتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرا گروہ وہ ہے کہ کفر کی تاریکی اور ان کے اعمال کی برائی ان کے چہروں سے نمایاں ہوگی۔ گویا سیاہ گرد و غبار ان کے چہرہ پر پڑا ہوا ہے اور دھوئیں کا ہالہ اس کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ آثارِ غم و رنج و اندوہ و تکلیف و درد ان کے چہروں سے ہویدا ہیں اور، اصولی طور پر، جیسا کہ سورہ رحمٰن کی آیت ۴۱ میں آیا ہے: (یعرف المجرمون بسیماهم) گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔ اس دن چہروں کا رنگ انسانوں کی پہچان کے لیے کافی ہوگا۔

ایک نکتہ

تعمیرِ ذات کی راہ

جو تعبیریں اس سورہ کی مختصر اور پُر جلال آیات میں آئی ہیں وہ تعمیرِ ذات کے لیے ایک جامع پروگرام کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱- ایک طرف انسانوں کو حکم دیتا ہے کہ کبر و غرور کو توڑنے کے لیے وہ اپنی خلقت کی ابتدا پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ کس طرح انسان ایک بے قیمت نطفہ سے پیدا ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تعمیر ذات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی تکبر و غرور ہے۔

۲- دوسری طرف قرآن الٰہی ہدایات کا تعارف یہ کہہ کر کراتا ہے کہ یہ اس سلسلہ میں بہترین زادِ راہ ہے۔ عام اس سے کہ وہ ہدایات جن کا سرچشمہ وحی ہو اور انبیاء و اولیاء کی طرف سے کی گئی رہنمائی ہو یا وہ ہدایات جو عالم تکوین کے مطالعہ سے اور اس کے قوانین و نظام پر غور و فکر کرنے سے حاصل ہوں۔

۳- اس کے بعد انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی جسمانی غذا پر گہری نظر ڈالے اور سوچے کہ خالقِ رحیم و مہربان نے کس طرح انواع و اقسام کے غذائی مواد، دانے، میوے اس سیاہ مٹی سے اس کے لیے پیدا کیے ہیں۔ پھر اس ربوبیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور نہ صرف اس موادِ غذائی کی تکوینی ساخت کی طرف دیکھے بلکہ اس کے حاصل کرنے کی کیفیت کو بھی مرکزِ توجہ قرار دے، اس لیے کہ پاک و حلال غذا تعمیر ذات کی ایک اہم بنیاد ہے۔

۴- پھر اپنی روحانی غذا کی طرف زیادہ گہری نظر سے دیکھے اور غور و فکر سے کام لے کہ وہ غذا کون سے سرچشمے سے حاصل ہو رہی ہے۔ پاک سرچشمے سے یا آلودہ سے۔ اس لیے کہ ناقص تعلیمات اور گمراہ کن تبلیغات مسموم اور زہریلی غذا کی طرح ہیں جو انسان کی معنوی زندگی کو خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ کچھ لوگ جسم کی غذا کے بارے میں بڑے محتاط ہوتے ہیں لیکن اپنی روحانی غذا کے بارے میں بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ ہر فاسد و مفسد کتاب پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر قسم کی گمراہ کن تعلیمات پر کان دھرتے ہیں اور اپنی روح کی غذا کے لیے کسی قسم کی قید و شرط کے قائل نہیں ہیں۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ (مالی اری الناس اذا قرب الیھم الطعام لیلا تکلفوا انارۃ المصابیح لیبصروا ما یدخلوا بطونھم ولا یھتمون بغذاء النفس بان ینیروا مصابیح البابھم بالعلم لیسلموا من لواحق الجھالۃ والذنوب فی اعتقاداتھم واعمالھم)

کیا وجہ ہے کہ میں کچھ لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ جب رات کو کھانا ان کے پاس لاتے ہیں تو چراغ روشن کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ کونسی غذا اپنے شکم میں داخل کر رہے ہیں لیکن وہ اپنی روح کی غذا کو اہمیت نہیں دیتے اور علم کے ذریعہ چراغِ عقل کو روشن نہیں کرتے تاکہ عوارضِ جہالت و گناہ سے بچیں اور عقیدے اور اعمال صحت مند رہیں [1]

---

[1] "سفینۃ البحار" جلد ۲ ص ۸۴ مادہ طعم۔

اسی قسم کی حدیث آپ کے فرزند ارجمند امام حسن مجتبیٰؑ سے بھی منقول ہے: (عجبت لمن یتفکر فی مأکولہ کیف لا یتفکر فی معقولہ فیجنب بطنہ مایؤذیہ ویودع صدرہ مایردیہ) مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو جسم کی غذا کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے لیکن روح کی غذا کے سلسلہ میں بالکل نہیں سوچتا۔ نقصان دہ غذا کو تو اپنے شکم سے دور رکھتا ہے لیکن دل کو مہلک مطالب سے بھرتا رہتا ہے[1]

۵۔ اس کے بعد سوچ لے کہ محشر کے لیے دلخراش صیحہ سب کو موت کی نیند سے بیدار کر دے گا اور انسان کے اعمال اس کے روبرو کرے گا اور اوضاعِ محشر اتنے ہولناک ہیں کہ انسان اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو بھی فراموش کر دے گا۔ اس لیے اسے غور و فکر کرنا چاہیئے کہ کیا وہ آج ایسا کام کر رہا ہے جس سے اس دن اس کا چہرہ خنداں اور نورانی ہوگا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ اس روز اس کا چہرہ ترش و تاریک ہو۔ اس کو چاہیئے کہ وہ ابھی سے اپنے آپ کو اس دن کے لیے تیار کرے۔

خداوندا! ہمیں اصلاحِ نفس کی توفیق عطا فرما۔

پروردگارا! ہمیں روحانی جاں پرور غذا سے محروم نہ فرما۔

بارالٰہا! صیحۂ محشر سے پہلے ہمیں خوابِ گراں سے بیدار کر دے۔

آمین یارب العالمین!

سورۂ عبس کا اختتام



---

[1] "سفینۃ البحار"، جلد ۲ ص ۸۴ مادہ طعم۔

سورۃ

تکویر

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اس کی ۲۹ آیتیں ہیں

سورۂ تکویر کے مضامین

یہ مکی سورتوں میں سے ہے اور مختلف قرائن اس کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ سورہ اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ کج فہم اور ہٹ دھرم دشمن پیغمبرِ اسلامؐ پر جنون کی تہمت لگاتے تھے اور یہ صورتِ حال زیادہ تر پیغمبرِ اسلامؐ کے قیامِ مکّہ کے زمانے میں تھی، اور ابتدائے تبلیغ میں یہ کیفیت تھی۔ دشمنوں کی کوشش تھی کہ آپؐ کی باتوں کو سنجیدہ نہ سمجھیں اور ان پر زیادہ توجہ نہ دیں۔ بہرحال یہ سورہ دو محوروں کے گرد گھومتا ہے۔

پہلا محور اس سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں جو قیامت کی نشانیوں، اس جہان کے آخر میں عظیم تبدیلیوں اور قیامت کے آغاز کو بیان کرتی ہیں۔ دوسرے محور میں قرآن کے لانے والے کی عظمت اور قرآن کی نفوسِ انسانی میں تاثیر کی گفتگو ہے۔ اس حصّہ میں دل ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی قسمیں ہیں۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی اہمیت اور تلاوت کے بارے میں کئی حدیثیں منقول ہیں منجملہ اُن دیگر احادیث کے ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ:

من قرأ سورة اذا الشمس كورت اعاذه الله تعالىٰ ان يفضحه حين تنشر صحيفته۔ "جو شخص "اذا الشمس كورت" کو پڑھے تو خدا اسے اس وقت ہر رسوائی سے محفوظ رکھے گا جب اعمال نامے کھولے جائیں گے[1]

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ ہی سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من احب ان ينظر الىٰ يوم القيامة فليقرأ اذا الشمس كورت۔ "جو شخص چاہتا ہے کہ قیامت میں میرا دیدار کرے تو وہ سورہ "اذا الشمس كورت" کی تلاوت کرے[2]

یہ حدیث ایک اور طرح سے بھی نقل ہوئی ہے:

من سره ان ينظر الىٰ يوم القيامة (كانه رأى عين) فليقرأ "اذا الشمس كورت" و"اذا السماء انفطرت" و"اذا السماء انشقت"۔ "جو شخص دوست رکھتا

---

[1] و [2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۴۱۔

ہے کہ قیامت میں مجھے دیکھے (گویا آنکھ سے دیکھے) تو وہ سورہ "اذا الشمس کورت" اور "اذا السماء انفطرت" اور "اذا السماء انشقت" کی تلاوت کرے، اس لیے کہ ان سورتوں میں قیامت کی نشانیاں اس طرح بیان ہوئی ہیں کہ تلاوت کرنے والے کو گویا صیحۂ قیامت سے دوچار کر دیتی ہیں [1]

ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ سے لوگوں نے عرض کیا کہ آپؐ پر اس قدر جلد کیوں بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

شیبتنی ھود والواقعۃ والمرسلات وعم یتساءلون و اذا الشمس کورت۔

"سورہ ہود، واقعہ، مرسلات، عم اور اذا الشمس کورت نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ اس لیے کہ قرآن کے ہولناک حوادث کی ان میں اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے کہ ہر بیدار انسان کو جلد بوڑھا کر دیتی ہے [2]

امام جعفر صادقؑ سے بھی ایک حدیث مروی ہے کہ جو شخص سورہ "عبس و تولی" اور "اذا الشمس کورت" کو پڑھے تو پروردگار کے لطف و کرم کے زیر سایہ وہ جنت جاوداں میں ہوگا اور خدا کے نزدیک یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے کہ وہ ارادہ کرے [3]

جو تعبیریں مندرجہ بالا آیتوں میں آئی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ مراد ایسی تلاوت ہے جو آگاہی اور ایمان و عمل کا سرچشمہ قرار پائے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۷۰۱۔ اس حدیث کے معنی کا سابقہ حدیث میں بھی احتمال ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۱۳۔

[3] ثواب الاعمال مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۱۲۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۙ
۲ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۙ
۳ وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۙ
۴ وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۙ
۵ وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۙ
۶ وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۙ
۷ وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۙ
۸ وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۙ
۹ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ

ترجمہ

اس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

۱ جس وقت سورج کو لپیٹا جائے گا۔
۲ اور جس وقت ستارے بے نور ہو جائیں گے۔
۳ جس وقت پہاڑ چلنے لگیں گے۔
۴ جس وقت زیادہ قیمتی مال فراموش کر دیا جائے گا۔
۵ جس وقت وحوش کو جمع کیا جائے گا۔

۶ جس وقت دریا جوش مارنے لگیں گے۔

۷ جس وقت ہر شخص اپنے جیسے کا قرین قرار دیا جائے گا۔

۸ جس وقت زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا۔

۹ کہ ان کو کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا؟

تفسیر

جس دن کائنات کے دفتر کو لپیٹ دیا جائے گا

اس سورہ کے آغاز میں جیسا کہ ہم نے کہا ہے، مختصر، ہیجان انگیز اور دل ہلا دینے والے اشاروں کے ساتھ اس جہان کے اختتام اور قیامت کی ابتدا کے ہولناک حوادث سے ہمارا آمنا سامنا ہے۔

یہ حوادث ہمیں عجیب وغریب جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔ پروردگارِ عالم ان نشانیوں میں سے آٹھ نشانیوں کو بیان کرتا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے:

"اس وقت جب سورج کا دفتر لپیٹ دیا جائے گا" (اذا الشمس کورت)۔

"کورت"، "تکویر" کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کے لپیٹنے اور جمع کرنے کے معنی میں ہے (مثلاً سر پر عمامہ لپیٹنا) یہ ایسا مفہوم ہے جو لغت وتفسیر کی بہت سی کتب سے معلوم ہوتا ہے کبھی کسی چیز کے پھینک دینے اور تاریک ہونے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں معانی اسی اصلی مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

بہرحال یہاں مراد سورج کی روشنی کا بجھ جانا ہے۔ اس کا تاریک ہونا ہے یعنی اس کے وجود کا ختم ہو جانا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ فی الحال سورج ایک کُرّہ ہے، حد سے زیادہ گرم اور جلتا ہُوا، اس قدر کہ اس کا تمام مواد تہہ بہ تہہ گیس کی شکل میں نکل آیا ہے اور اس کے اردگرد جلانے والے شعلے موجود ہیں جن کی بلندی لاکھوں میٹر ہے۔ اگر کرۂ زمین ان میں سے کسی شعلے کے درمیان الجھ جائے تو ایک ہی لمحے میں خاک ہو کر تھوڑی سی گیس میں تبدیل ہو جائے لیکن اس جہان کے آخر میں قیامت کی ابتدا پر یہ حرارت ختم ہو جائے گی اور شعلے بجھ جائیں گے، اس کی روشنی ختم ہو جائے گی اور اس کے حجم میں کمی ہو جائے گی۔

تکویر کے یہ معنی ہیں۔ اسی لیے لسان العرب میں آیا ہے:

(کورت الشمس جمع ضوءھا ولف کما تلف العمامہ) سورج کی تکویر کے یہ معنی ہیں کہ اس کی روشنی سمٹ جائے گی اور لپیٹ دی جائے گی جس طرح عمامے کو لپیٹتے ہیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی موجودہ علم بھی تائید کرتا ہے۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ تاریکی کی طرف جارہی ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"اور جس وقت ستارے بے نور ہو کر غائب ہو جائیں گے" (واذا النجوم انکدرت)۔

"انکدرت" "انکدار" کے مادہ سے گرنے اور پراگندہ ہونے کے معنی میں ہے اور کدورت کی اصل کے پیش نظر تیرگی و تاریکی کے معنی میں ہے۔ زیر بحث آیت میں ان دونوں کا جمع ہونا بھی ممکن ہے اس لیے کہ آغاز قیامت میں ستارے اپنی روشنی کھو بیٹھیں گے، منتشر ہو جائیں گے اور گر پڑیں گے اور عالم بالا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا جیسا کہ سورہ انفطار کی آیت ۲ میں آیا ہے:

(واذا الکواکب انتثرت) "اور جب ستارے گر کر منتشر ہو جائیں گے" اور جیسا کہ سورہ مرسلات کی آیت ۸ میں آیا ہے (فاذا النجوم طمست) اور جب ستارے مٹ جائیں گے اور تاریک ہو جائیں گے" قیامت کی تیسری نشانی کے سلسلہ میں فرماتا ہے:

"اور جب پہاڑ چلنے لگیں گے" (واذا الجبال سیرت)۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ قرآن کی مختلف آیتوں سے نہیں معلوم ہوتا ہے کہ آغاز قیامت میں پہاڑ مختلف مراحل طے کریں گے۔

پہلا مرحلہ یہ کہ وہ چلنے لگیں گے اور آخری مرحلے میں غبار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ (اس سلسلہ میں مزید تشریح اسی جلد میں سورہ نبا کی آیت ۲۰ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"جس وقت نہایت قیمتی اموال فراموشی کے حوالے ہو جائیں گے" (واذا العشار عطلت)۔

"عشار" جمع ہے "عشراء" کی جو دراصل حاملہ اونٹنی کے معنی میں ہے جس کے حمل کو دس ماہ گزر چکے ہوں اور وہ بچہ جننے کے قریب ہو یعنی زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ وہ ایک اور اونٹ کو جنم دے گی اور بہت زیادہ دودھ اس کے پستانوں میں ظاہر ہوگا۔

جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں تو عرب میں اس قسم کی اونٹنی بہت قیمتی شمار ہوتی تھی۔

"عطلت" تعطیل کے مادہ سے سرپرست اور چرواہے کے بغیر چھوڑ دینے کے معنی میں ہے مراد یہ ہے کہ اس دن ہولناکی اس قدر شدید ہوگی کہ ہر انسان اپنے نفیس ترین مال کو فراموش کر دے گا۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں نقل کرتے ہیں کہ بعض مفسرین نے عشار کو بادل کے معنی میں لیا ہے اور "عطلت" بارش کے معطل ہو جانے کے معنی میں ہے یعنی اس دن آسمان پر بادل تو ظاہر ہوں گے لیکن برسیں گے نہیں۔ (ہو سکتا ہے یہ بادل مختلف گیسوں سے پیدا ہوں یا ایٹمی بادل ہوں یا گرد و غبار کے تودے جو پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے سے آغاز قیامت میں ظاہر ہوں گے)۔

لیکن طبرسی مزید کہتے ہیں کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عشار کی تفسیر بادلوں سے کرنا ایسی چیز ہے جو لغت عرب میں معروف نہیں ہے لیکن اس مطلب کی طرف توجہ سے جو "طریحی" نے مجمع البحرین میں نقل

کیا ہے کہ "عشار" اصل میں حاملہ اونٹنیوں کے معنی میں ہے اور اس کے بعد ہر بار بردار کو کہا گیا ہے۔ ممکن ہے بادلوں پر بھی اس کا اطلاق عام طور پر پانی کا بوجھ اٹھانے کی وجہ سے ہو اگرچہ وہ بادل جو آغاز قیامت میں نمودار ہوں گے بار بردار نہیں ہوں گے (غور کیجئے)۔

بعض مفسرین نے "عشار" کی تفسیر گھروں اور زرعی زمینوں سے کی ہے جو عرصۂ محشر میں بیکار ہو جائیں گی اور ساکنوں اور زراعت کرنے والوں سے محروم ہوں گی۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بعد کی آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

"اور جس وقت وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے" (واذا الوحوش حشرت)۔ وہی جانور جو عام حالات میں ایک دوسرے سے دور تھے اور ڈرتے تھے عرصۂ قیامت کے ہولناک حوادث کی وحشت کی شدت ایسی ہوگی کہ ان کو ایک دوسرے کے گرد جمع کر دے گی اور وہ ہر چیز کو بھول جائیں گے۔ گویا وہ چاہیں گے کہ اپنے اس اجتماع سے اپنے خوف و وحشت میں کمی کریں۔

دوسرے لفظوں میں جس وقت وہ ہولناک مناظر وحشی جانوروں سے ان کے مخصوص خواص چھین لیں گے تو انسانوں سے کیا سلوک کریں گے۔ لیکن بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت قیامت کی عدالت میں وحشی جانوروں کے جمع ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی اپنے عالم میں اور اپنی آگاہی اور شعور کے حدود میں رہتے ہوئے جوابدہی کے پابند ہیں اور اگر انہوں نے ایک دوسرے پر ظلم و ستم کیا ہوگا تو وہاں ان سے بدلہ لیا جائے گا۔

اس آیت کی سورہ انعام کی آیت ۳۸ کے ساتھ مشابہت ہے جو یہ کہتی ہے کہ (وما من دآبۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ما فرطنا فی الکتاب من شیء ثم الی ربھم یحشرون) کوئی زمین میں چلنے والا اور کوئی پرندہ جو اپنے دونوں پروں سے پرواز کرتا ہے موجود نہیں مگر یہ کہ وہ تمہاری طرح کی امتیں ہیں۔ ہم نے کسی چیز کو اس کتاب میں چھوڑا نہیں ہے اس کے بعد تم اپنے پروردگار کی طرف محشور ہو گے۔

(جانوروں کے حشر و نشر اور حساب و کتاب کے سلسلہ میں تفصیلی بحث سورہ انعام کی اسی آیت کے ذیل میں جلد ۵ ص ۲۲۴ تا ۲۲۷ ہم کر چکے ہیں)۔

جو کچھ یہاں کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیر بحث آیات دنیا کے اختتام اور آخرت کے آغاز کی ہولناک نشانیوں کے سلسلہ میں بحث کر رہی ہیں لہٰذا پہلی تفسیر مناسب ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"جس وقت دریاؤں میں آگ لگ جائے گی" (واذا البحار سجرت)۔

"سجرت" "تسجیر" کے مادہ سے جلانے اور آگ کے ہیجان میں آنے کے معنی میں ہے۔ اور

اگر قرآن کی یہ تعبیر گزشتہ زمانے میں مفسرین کے لیے عجیب و غریب تھی تو اس وقت ہمارے لیے باعث تعجب نہیں ہے اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ پانی دو عناصر ، ہائیڈروجن اور آکسیجن ، سے مرکب ہے جو دونوں شدید طور پر قابلِ اشتعال ہیں ۔

بعید نہیں کہ عرصۂ قیامت میں دریاؤں اور سمندروں کا پانی اس طرح دباؤ اور فشار میں آجائے کہ ان کا تجزیہ ہو جائے اور یہ آگ پکڑ جائیں ۔

بعض نے اس لفظ کی پُر ہونے کے معنی میں تفسیر کی ہے جیسا کہ آگ سے پُر تنور کو مسجّر کہا جاتا ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ عرصہ محشر کے زلزلے اور پہاڑوں کا انتشار دریاؤں اور سمندروں کے پُر ہونے کا سبب بنے یا آسمانی پتھروں کے گرنے سے وہ پُر ہو جائیں اور ان کا متلاطم پانی خشکیوں کی سطح پر جاری ہو اور ہر چیز کو غرق کر دے ۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

" اور جس وقت ہر شخص اپنے جیسے کا قرین ہو جائے گا (و اذا النفوس زوّجت) ۔ صالحین صالحین کے ساتھ ' اور بدکار بدکار لوگوں کے ساتھ ، اصحاب الیمین اصحاب الیمین کے ساتھ اور اصحابِ شمال اصحابِ شمال کے ساتھ ' اس دنیا کے برعکس جہاں سب ملے جلے ہیں ۔ کہیں مومن کا ہمسایہ مشرک ہے اور کہیں صالح اور نیک کا ہمسایہ غیر صالح ہے ۔ لیکن قیامت جو یوم الفصل یعنی جدائی کا دن ہے ، اس میں یہ صفیں مکمل طور پر الگ الگ اور ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گی ۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمالات بھی پیش ہوئے ہیں منجملہ ایک یہ ہے کہ ارواح ابدان میں پلٹ آئیں گی یا جنتی نفوس حوروں کے ساتھ اور جہنمی نفوس شیاطین کے پاس ہو جائیں گے ۔ یا یہ کہ ہر انسان اپنے دوست اور رفیق کے قریب ہوگا بعد اس کے کہ موت ان کے درمیان جدائی ڈال دے گی یا ہر انسان اپنے اعمال کا قرین ہوگا ۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے ۔ سورہ واقعہ کی آیات ، سے ۱۱ تک اس کی گواہ ہیں :

(وکنتم ازواجًا ثلاثة فاصحاب الميمنة ما اصحاب الميمنة واصحاب المشئمة ما اصحاب المشئمة والسابقون السابقون اولئك المقربون)

اس دن تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے پہلا گروہ اصحاب میمنہ کا ہے کیا کہنا اصحابِ میمنہ کا ۔ دوسرا گروہ اصحابِ شمال کا ہے وہ کیا ہی منحوس گروہ ہے اور تیسرا گروہ سبقت کرنے والوں کا ہے اور سبقت کرنے والے ہی مقربین ہیں ۔

حقیقت میں یہ آیت ، ایسی تبدیلیاں جو قیامت کی تمہید ہیں ، ان کے ذکر کے بعد اس عظیم دن کے ہراول دستے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ ایسا دن ہے جس میں ہر شخص اپنے قرین کے ہمراہ ہو جائے گا ۔

اس کے بعد قیامت کے ایک اور حادثہ کو موضوع بناتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

"جس دن زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا" (و اذا الموء ودة سئلت) "کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی ہیں" (بای ذنب قتلت)۔

"موء ودة" "وأد" (بروزن رعد) اس لڑکی کے معنی میں ہے جسے زندہ دفن کر دیا گیا ہو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی ثقل بوجھ اور سنگینی کے ہیں اور چونکہ ان لڑکیوں کو قبر میں دفن کرتے تھے اور ان پر مٹی ڈال دیتے تھے اس لیے یہ تعبیر ان کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

بعض روایات کے نتیجے میں اس آیت کی تفسیر کو وسعت دی گئی ہے یہاں تک کہ ہر قسم کے قطع رحم یا مودۃ اہل بیت کو قطع کرنا اس میں شامل ہے۔

ایک حدیث امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ جس وقت اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا (من قتل فی مودتنا) اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہماری محبت کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہیں[1]۔

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ اس بات کی گواہ آیت قربیٰ ہے (قل لا اسئلکم علیه اجرًا الّا المودة فی القربیٰ) "کہہ دے میں تبلیغ نبوت کے سلسلہ میں تم سے کسی قسم کا اجر نہیں چاہتا سوائے اپنے اہل بیت کی مودۃ کے"[2] (شوریٰ - ۲۳)۔

البتہ آیت کا ظاہری مفہوم وہی پہلی تفسیر ہے لیکن اس میں اس قسم کے مفہوم کی صلاحیت ہے۔

چند نکات

۱۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا

عربوں کے زمانۂ جاہلیت کے دردناک ترین اور نہایت وحشیانہ مظاہر میں سے ایک مظہر لڑکی کا زندہ درگور کر دینا ہے جس کی طرف قرآن مجید میں بارہا اشارہ ہوا ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ قبیح رسم عربوں میں عام نہیں تھی۔ صرف قبیلہ کندہ یا بعض دوسرے قبائل میں تھی لیکن ظاہر ہے کہ یہ اقدام کچھ عجیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ قرآن اس بارے میں اتنی تاکید کے ساتھ بار بار گفتگو نہ کرتا۔

بہرحال یہ کام اس قدر وحشت ناک تھا کہ اس کا کبھی کبھی ہونا بھی نہایت قبیح امر ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ عربوں کے زمانہ جاہلیت میں جس وقت عورت کے وضع حمل کا وقت قریب آتا تو زمین میں ایک گڑھا کھود دیتے اور اس کے اوپر بیٹھ جاتے اگر نوزائیدہ بچہ لڑکی ہوتا تو اس کو اس گڑھے میں پھینک دیتے

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۳۲، حدیث ۷ و ۱۱۔

[2] ایضاً " " " " " " "

اور اگر لڑکا ہوتا تو اسے زندہ رہنے دیتے۔ اسی لیے ان کے شعراء میں سے ایک شاعر اس سلسلہ میں فخریہ لب و لہجے میں کہتا ہے :

سمیتھا اذا ولدت تموت والقبر صھر ضامن ذمیت

میں نے اس نوزائیدہ لڑکی کا نام اس کی پیدائش کے وقت تموت رکھا (جس کے معنی ہیں مرجائے گی) اور قبر میرا داماد ہے جس نے اسے اپنی بغل میں لے لیا اور اسے خاموش کر دیا۔[1]

اس جرم کے مختلف اسباب و عوامل تھے

زمانہ جاہلیت میں عورت کا ایک انسان کے لحاظ سے بے قدر و قیمت ہونا اس شدید فقر و فاقہ کی کیفیت کا نتیجہ تھا جو اس معاشرہ پر مسلط تھا۔ لڑکیاں نہ تو کچھ کما کر دے سکتی تھی نہ ڈاکہ ڈالنے میں شرکت کر سکتی تھیں۔ ایک سبب اور بھی تھا اور وہ یہ کہ اس بات کا امکان تھا کہ مختلف جنگوں میں گرفتار ہو کر لڑکیاں قید ہو جائیں اور ان کی عزت و ناموس دوسروں کے قبضہ میں چلی جائے جس کے نتیجے میں بے غیرتی کا دھبہ متعلقین کے دامن پر لگ جائے۔

یہ چند عوامل لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کا سبب بنے۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زمانۂ موجود میں بھی یہ رسم کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اور کچھ نہیں تو اسقاطِ حمل کی آزادی کی صورت میں بہت سے متمدن ممالک میں رواج پائے ہوئے ہے۔ اگر زمانۂ جاہلیت کے عرب نوزائیدہ بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے تو ہمارے زمانے کے متمدن انسان انہیں شکم مادر میں قتل کر دیتے ہیں اس کی مزید تشریح جلد ۱۱ ص ۲۷۰ تا ۲۷۴ پر سورہ نحل کی آیت ۵۹ کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔

۲۔ قابل توجہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس اقدام کو اس قدر قبیح اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے کہ روزِ قیامت دوسرے اعمال کی پرسش سے پہلے اس دادخواہی کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قانونِ اسلام کی رو سے عام انسانوں خصوصاً بے گناہ انسانوں کے خون کی بہت شدید گرفت کی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عورت کی کتنی قدر و منزلت ہے۔

۳۔ ایک اور نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ قاتلوں سے سوال کریں گے بلکہ کہتا ہے کہ ان معصوم بچیوں سے سوال ہوگا کہ تمہارا کیا گناہ تھا کہ اس بے رحمانہ طریقہ پر تم کو قتل کیا گیا۔ گویا قاتل اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اُن سے اُن کے جرم کے بارے میں پرسش بھی کی جائے بلکہ تنہا ان مقتولین کی گواہی کافی ہے۔



---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۴۴۔

۱۰ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝
۱۱ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝
۱۲ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝
۱۳ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝
۱۴ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝

ترجمہ

۱۰ جس وقت اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے۔
۱۱ اور جس وقت آسمان سے پردہ ہٹا دیا جائے گا۔
۱۲ اور جس وقت دوزخ دہک اٹھے گا۔
۱۳ اور جس وقت جنت قریب کر دی جائے گی۔
۱۴ اس وقت ہر انسان جان لے گا کہ اس نے کیا کیا ہے۔

تفسیر

اس دن معلوم ہوگا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے یعنی اس جہان کی ویرانی کے موضوع پر آئی تھی زیر بحث آیتوں میں اس کے دوسرے مرحلہ یعنی دوسرے عالم کے ظہور اور نامہ اعمال کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے:

"جس روز اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے" (واذا الصحف نشرت)۔

"صحف" "صحیفہ" کی جمع ہے۔ یہ اس چیز کے معنوں میں ہے جو صفحہ رخ کی طرح وسیع ہو۔ اس کا اطلاق ان تختیوں اور کاغذوں پر بھی ہوا ہے جن پر کچھ مطالب لکھتے ہیں۔ قیامت میں اعمال ناموں کے

کھلنے سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے وہ اعمال انجام دیئے ہیں ان کے سامنے ان کے اعمال ظاہر ہو جائیں گے تاکہ وہ اپنا حساب کتاب دیکھ لیں۔ جیسا کہ سورہ اسریٰ کی آیت ۱۴ میں آیا ہے:

(اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیبًا) اور ان اعمال ناموں کا دوسروں کے سامنے واضح ہونا بھی نیکوکاروں کے لیے ایک تشویق کا عنوان ہے اور بدکاروں کے لیے سزا و رنج اور تکلیف ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"اور جس وقت آسمان کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا جائے گا" (و اذا السماء کشطت)۔

"کشطت" (بروزن کشف) کے مادہ سے اصل میں، جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے، جانور کی کھال اتارنے کے معنی میں ہے اور ابن منظور کے بقول "لسان العرب" میں کسی چیز کے رُخ سے پردہ ہٹانے کے معنی میں بھی آیا ہے، لہٰذا جس وقت بادل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

زیرِ بحث آیت میں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ پردے جو اس دنیا میں عالم مادّہ اور عالم بالا پر پڑے ہوئے ہیں یعنی لوگ فرشتوں کو یا دوزخ و جنت کو نہیں دیکھ سکتے، وہ ہٹ جائیں گے اور انسان عالم ہستی کے حقائق کو دیکھ سکیں گے۔

جیسا کہ بعد والی آیت میں آئے گا کہ جہنم شعلہ ور ہوگا اور جنت انسانوں کے نزدیک ہو جائے گی۔ جی ہاں قیامت کا دن یوم البروز ہے۔ چیزوں کی ہیئت اس دن آشکار ہو جائے گی اور آسمان کے چہرہ سے پردہ ہٹ جائے گا۔

اس تفسیر کے مطابق مندرجہ بالا آیت قیامت کے دوسرے مرحلہ کے حوادث یعنی انسانوں کی حیاتِ تازہ کے مراحل کی گفتگو کرتی ہے۔

قبل و بعد کی آیات بھی انہی چیزوں کی حامل ہیں اور یہ جو بہت سے مفسرین نے اس آیت کو آسمانوں کے لپیٹے جانے اور قیامت کے پہلے مرحلہ یعنی اس عالم کی فنا سے متعلق سمجھا ہے، یہ بہت بعید نظر آتا ہے اور نہ یہ مفہوم قبل و بعد کی آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس لیے بعد والی آیات میں مزید فرماتا ہے:

"اور جس وقت جہنم شعلہ ور ہوگا" (و اذا الجحیم سعرت)۔

(و ان جہنم لمحیطۃ بالکافرین)۔ "بے شک دوزخ کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے" (توبہ/۴۹) کے مطابق جہنم اب بھی موجود ہے لیکن اس دنیا کے حجابات اس کے مشاہدہ کی راہ میں حائل ہیں۔ جیسا کہ بہت سی آیاتِ قرآنی کے مطابق جنت بھی اس وقت پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے۔ اسی بناء پر بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

"اور جس وقت جنت پرہیزگاروں کے نزدیک کر دی جائے گا" (و اذا الجنۃ ازلفت)۔ یہی معنی سورہ شعراء کی آیت ۹۰ میں بھی اس فرق کے ساتھ آئے ہیں کہ یہاں متقین کے نام کی تصریح نہیں ہوئی۔

"ازلفت"، "زلف" (بروزن حرف) اور "زلفیٰ" (بروزن کبریٰ) کے مادّہ سے نزدیکی کے معنوں میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد قرب مکانی ہو یا قربِ زمانی یا اسباب و مقدمات کے لحاظ سے یا پھر یہ سب امور ہوں یعنی جنت مکان کے لحاظ سے بھی مومنین کے نزدیک ہو جائے گی اور زمانِ ورود کے اعتبار سے بھی اور اس کے اسباب و علل بھی وہاں سہل و آسان ہوں گے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ یہ نہیں فرماتا کہ نیکوکار جنت کے نزدیک ہو جائیں گے بلکہ فرماتا ہے جنت ان کے نزدیک کر دیں گے اور یہ بہت ہی محترم تعبیر ہے جو اس سلسلہ میں ممکن ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے جنت اور جہنم دونوں اس وقت موجود ہیں لیکن اس دن جنت زیادہ نزدیک اور دوزخ ہر زمانہ کی نسبت زیادہ بھڑک رہا ہوگا۔

آخری زیرِ بحث آیت میں جو فی الحقیقت تمام گزشتہ آیتوں کی تکمیل کرتی ہے اور تمام شرطیہ جملوں کی جزا ہے جو گزشتہ بارہ آیتوں میں آئے ہیں، فرماتا ہے:

"اس وقت ہر شخص جان لے گا کہ اس نے کیا کچھ حاضر کیا ہے" (علمت نفس ما احضرت)۔ اور یہ تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ انسان کے تمام اعمال وہاں حاضر ہوں گے اور وہاں انسان کا علم مشاہدہ کیے ہوئے ہوگا۔

یہ حقیقت قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے۔ سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہم پڑھتے ہیں (ووجدوا ما عملوا حاضرًا) "جو کچھ انہوں نے اعمال کیے ہیں وہ اسے حاضر پائیں گے"۔ اور سورہ زلزال کی آخری آیات میں آیا ہے: (فمن یعمل مثقال ذرة خیرًا یرہ ومن یعمل مثقال ذرة شرًّا یرہ) جس شخص نے ذرہ برابر نیک عمل کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا۔

یہ آیت بھی اعمال کی تجسیم کو بیان کرتی ہے اور یہ کہ انسانوں کے اعمال جو اس جہان میں بظاہر نابود ہو جاتے ہیں، وہ حقیقتاً نابود نہیں ہوتے۔ اس دن مناسب شکلوں اور صورتوں میں مجسم ہوں گے اور عرصۂ محشر میں حاضر ہوں گے۔

چند نکات

۱۔ نظم آیات

زیرِ بحث آیتوں میں اور گزشتہ آیتوں میں مسئلہ قیامت کے رابطہ سے بارہ حادثات کی طرف اشارہ ہوا ہے جن میں سے چھ حوادث پہلے مرحلہ یعنی اس جہان کی فنا سے متعلق ہیں اور چھ دوسرے حوادث چھ دوسرے مرحلہ یعنی موت کے بعد کی نئی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلے حصہ میں سورج کے تاریک و سیاہ ہو جانے، ستاروں کے بے نور ہونے، پہاڑوں کے تزلزل اور

حرکت میں آجانے، سمندروں میں آگ لگ جانے، اموال کو بھول جانے، اور جانوروں کے وحشت زدہ ہو جانے کے بارے میں گفتگو ہے۔

دوسرے مرحلہ میں انسانوں کے الگ الگ صفوں میں محشور ہونے، بے گناہ زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کیے جانے، نامہ اعمال کے کھلنے، آسمانوں سے حجابوں کے ہٹ جانے، جہنم کی آگ کے بھڑک اٹھنے، جنت کے نزدیک ہونے اور آخر میں انسان کے اپنے اعمال سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کی بات ہوئی ہے۔

یہ آیات، باوجود اختصار، اس قدر پُرمعنی اور دل ہلا دینے والی ہیں کہ ہر انسان کے وجود کو متزلزل کر دیتی ہیں اور اسے غور و فکر پر اس طرح مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ اس دنیا کے انجام اور قیامت کی کیفیات کو مختصر عبارتوں میں اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم دیکھنے لگتا ہے۔ کس قدر زیبا، خوبصورت اور اثر کرنے والی یہ آیاتِ قرآن ہیں اور کس قدر پُرمعنی اور الہام بخش ان کے نکات ہیں۔

۲۔ کیا نظامِ شمسی ختم ہو جائے گا اور ستاروں کے چراغ گُل ہو جائیں گے؟

ہر چیز سے پہلے ہمیں جاننا چاہیئے کہ ہمارے نظامِ شمسی کا یہ حیات بخش مرکز جسے ہم سورج کہتے ہیں آسمان کے باقی ستاروں کی بہ نسبت، اگرچہ یہ متوسط ستارہ ہے، لیکن اپنی ذات کی حد تک اور کرۂ زمین کی نسبت بہت بڑا ہے۔

ماہرین کی تحقیق اور ان کے مطالعوں کے مطابق اس کا حجم ایک ملین اور تین کروڑ گنا زمین کے مقابلہ میں ہے۔ البتہ یہ چونکہ ہم سے تقریباً ایک سو پچاس ملین کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے لہٰذا وہ موجودہ حجم میں نظر آتا ہے۔

سورج کی عظمت و وسعت کی تصویر کشی کے لیے یہی مقدار کافی ہے کہ اگر چاند اور زمین کو اس فاصلہ کے ساتھ جو اس وقت ان دونوں کے درمیان ہے، سورج کے اندر منتقل کر دیں تو چاند آسانی کے ساتھ زمین کے گرد گردش کر سکتا ہے بغیر اس کے کہ وہ سورج کی سطح سے خارج ہو۔

سورج کی سطح کی حرارت چھ ہزار سنٹی گریڈ سے زیادہ ہے اور اس کے عمق کی حرارت کئی ملین درجوں سے زیادہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ سورج کے وزن کو ٹنوں کے حساب سے بیان کریں تو ضروری ہے کہ ہم دو کا عدد لکھیں اور ستائیس صفر اس کے آگے لگائیں یعنی دو ارب ارب ارب ٹن۔

سورج کی سطح سے شعلے بلند ہوتے ہیں جن کا ارتفاع کبھی تو ایک لاکھ ساٹھ ہزار کلومیٹر ہوتا ہے اور کرۂ زمین اس کے اندر آسانی سے گم ہو سکتا ہے کیونکہ زمین کا قطر بارہ ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ باقی رہا سورج کی نورانی روشنی دینے والی طاقت کا سرچشمہ، اس کے برعکس جو بعض ماہرین نے طے کر رکھا ہے

وہ جلنے سے پیدا نہیں ہوتا۔

جارج گاموف اپنی کتاب "سورج کی پیدائش اور اس کی موت" میں لکھتا ہے کہ اگر سورج کا جسم خالص پتھر کے کوئلے سے بنا ہوا ہوتا اور مصر کے پہلے فرعون کے زمانے میں اسے آگ لگائی گئی ہوتی تو ضروری تھا کہ وہ اب تک سب جل چکا ہوتا اور خاک کے سوا کوئی چیز باقی نہ بچی ہوتی اور کسی قسم کا دوسرا جلنے والا مادہ اگر پتھر کے کوئلے کی جگہ ہم فرض کریں تو وہ بھی یہی اشکال رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جلنے کا مفہوم سورج پر صادق نہیں آتا۔ اس میں جو کچھ ہے وہ ایٹمی تجربوں سے حاصل شدہ طاقت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ طاقت (انرجی) بہت زیادہ اور بڑی ہے اس بناء پر سورج کے ایٹم انرجی کی تبدیلی میں مصروف ہیں جو ماہرین کے حساب کے مطابق ہر سیکنڈ میں چار ملین ٹن کم ہو جاتے ہیں مگر سورج کا حجم اتنا بڑا ہے کہ ہزارہا سال گزرنے کے باوجود اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس کی کیفیت و وضع میں معمولی سا تغیر بھی واقع نہیں ہوتا۔

لیکن جاننا چاہیئے کہ یہی چیز ایک مدت دراز کے بعد سورج کے فنا ہونے کا سبب بنے گی اور آخر کار یہ جرم عظیم لاغر، کمزور، پتلا اور بے نور ہو جائے گا۔ اور یہی چیز ستاروں پر بھی صادق آتی ہے[1]

اس بناء پر جو کچھ اوپر والی آیات میں سورج کے تاریک ہونے اور ستاروں کے بکھر جانے کے سلسلہ میں آیا ہے وہ ایسی حقیقت ہے جو موجودہ زمانے کے علم کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور قرآن نے اس وقت ان حقائق کو بیان کیا ہے جب نہ صرف جزیرۃ العرب کے ماحول میں بلکہ اس زمانے کی علمی دنیا کی محفلوں میں بھی ان مسائل کی کوئی خبر نہیں تھی۔



[1] اقتباس از کتب "پیدائش و مرگ خورشید" و "نجوم بی تلسکوب" اور "ساختمان خورشید"

(۱۵) فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ
(۱۶) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ
(۱۷) وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۙ
(۱۸) وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ
(۱۹) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ
(۲۰) ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ
(۲۱) مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۭ
(۲۲) وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۚ
(۲۳) وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۚ
(۲۴) وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۚ
(۲۵) وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ

ترجمہ

(۱۵) قسم ہے ان ستاروں کی جو پلٹ آتے ہیں۔
(۱۶) چلتے ہیں اور نگاہوں سے چھپ جاتے ہیں۔
(۱۷) اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ پشت پھیرے اور آخر کو پہنچ جائے۔
(۱۸) اور صبح کی جب وہ تنفس کرے۔
(۱۹) کہ یہ باعظمت قرآن بھیجے ہوئے کا کلام ہے (جبرائیل امین)۔

(۲۰) جو صاحبِ قدرت ہے اور صاحبِ عرش خدا کے ہاں بلند مقام کا حامل ہے۔

(۲۱) فرمانروا اور امین ہے۔

(۲۲) اور تمہارا ساتھی (پیغمبرؐ) دیوانہ نہیں ہے۔

(۲۳) اُس نے اُس کو (جبرائیل کو) روشن افق میں دیکھا۔

(۲۴) وہ اس کے بارے میں جسے اس نے وحی سے حاصل کیا ہے بخیل نہیں ہے۔

(۲۵) یہ قرآن شیطانِ رجیم کا قول نہیں ہے۔

تفسیر

وحیِ الٰہی اس پر نازل ہوئی

پروردگارِ عالم گزشتہ آیتوں کے بعد، جو قیامت و معاد اور اس کے مقدمات اور محشر کے عظیم دن کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، ان آیتوں میں قرآن کی حقانیت اور پیغمبرِ اسلامؐ کی گفتار کے سچ ہونے کی بحث کو پیش کرتا ہے اور معاد کے بارے میں جو کچھ گزشتہ آیات میں آیا، حقیقت میں اس کی تائید کرتا ہے اور آگاہی بخشنے والی قسموں کے ساتھ ان مطالب کی تائید کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"قسم ہے ستاروں کی جو لوٹتے ہیں" (فلا اقسم بالخنس)[1] "چلتے ہیں اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں" (الجوار الکنس)۔

"خنس" "خانس" کی جمع ہے "خنس" (بروزن شمس) کے مادہ سے اصل میں انقباض، بازگشت اور پنہاں ہونے کے معنی میں ہے۔ اور شیطان کو اس لیے خناس کہتے ہیں کہ وہ خود کو چھپاتے رکھتا ہے اور جس وقت خدا کا نام لیا جائے تو وہ منقبض ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: (الشیطان یوسوس الی العبد فاذا ذکر اللہ خنس) شیطان ہمیشہ خدا کے بندوں کو وسوسہ میں ڈالتا ہے لیکن جس وقت خدا کو یاد کریں تو پلٹ جاتا ہے[2]

---

[1] یہ کہ لا اقسم میں "لا" نافیہ ہے یا زائد اور تاکید کے لیے ہے مفسرین نے اس سلسلہ میں کئی بحثیں کی ہیں۔ اور چونکہ سورہ قیامت کی ابتدا میں اسی جلد میں اس عنوان پر ہم بحث کر چکے ہیں لہٰذا تکرار کی ضرورت نہیں۔

[2] لسان العرب مادہ خنس۔

"جوار" "جاریہ" کی جمع ہے جس کے معنی تیز رفتار کے ہیں۔ "کنس" کانس کی جمع ہے۔ "کنس" (بروزن شمس) کے مادہ سے چھپ جانے کے معنی ہیں۔ اور کناس (بروزن پلاس) پرندوں کے گھونسلوں، ہرنوں اور دوسرے وحشی جانوروں کے چھپنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

یہ کہ ان قسموں سے کیا مراد ہے بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے نظام شمسی کے پانچ سیاروں کی طرف اشارہ ہے جو دوربین کے بغیر دیکھے جا سکتے ہیں۔ (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل) اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر ہم پے در پے چند راتوں کو آسمان پر نگاہ لگائے رکھیں تو اس حقیقت کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ آسمان کے ستارے اجتماعی طور پر بتدریج طلوع ہوتے ہیں اور اکٹھے ہی غروب ہوتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے فاصلوں میں کوئی تبدیلی رونما ہو۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسے مروارید ہیں جو ایک سیاہ پارچہ پر معین و مقرر فاصلوں پر ٹانکے گئے ہیں۔ اس پارچہ کو ایک طرف سے اوپر لے جاتے ہیں اور دوسری طرف سے نیچے کھینچتے ہیں۔ صرف پانچ ستارے ہیں جو اس قانون کلی سے مستثنیٰ ہیں یعنی دوسرے ستاروں کے درمیان چلتے پھرتے رہتے ہیں، گویا پانچ مروارید ٹکے ہوئے نہیں ہیں اور اس پارچہ پر آزاد قرار دیئے گئے ہیں اور وہ لوٹتے پوٹتے رہتے ہیں۔

یہ وہی مذکورہ بالا پانچ ستارے ہیں جو نظام شمسی کے خاندان کے ارکان ہیں اور ان کی حرکت قریب ہونے کی وجہ سے ہمیں محسوس ہوتی ہے ورنہ آسمان کے تمام ستارے ہی اس قسم کی حرکات کے حامل ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ہم سے دور ہیں لہٰذا ہم ان کی حرکات کو محسوس نہیں کرتے۔

پھر اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ علمائے ہیئت نے ان ستاروں کا نام "نجوم متحیرہ" رکھا ہے اس لیے کہ ان کی حرکات خطِ مستقیم پر نہیں ہے اور اس طرح نظر آتا ہے کہ ایک مدت تک سیر کرتے ہیں پھر تھوڑا سا واپس پلٹ آتے ہیں۔ دوبارہ اپنی سیر شروع کر دیتے ہیں جس کے اسباب کے بارے میں علم ہیئت میں بہت سے مباحث ہیں۔

مندرجہ بالا آیات ہو سکتا ہے کہ اس طرف اشارہ ہوں کہ یہ ستارے حرکت رکھتے ہیں (الجوار) اور اپنی سیر و حرکت میں رجوع و بازگشت رکھتے ہیں (الخنس) اور انجام کار سورج کے طلوع کے وقت پنہاں ہو جاتے ہیں (اُن ہرنوں کی طرح جو راتوں کو بیابانوں میں اپنی غذا تلاش کرنے کے لیے پھرتے رہتے ہیں اور صبح کے وقت شکاریوں اور وحشی جانوروں کے خوف سے اپنے کناس اور غار میں مخفی ہو جاتے ہیں (الکنس)

یہ احتمال بھی ہے کہ کنس سے مراد ان کا سورج کی شعاؤں میں پوشیدہ ہونا ہے۔ اس اعتبار سے سورج کے گردش کرتے وقت کبھی اس نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ سورج کے قریب ہو جاتے ہیں اور پھر بالکل نظر نہیں آتے جسے علمائے نجوم احتراق سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے جو ان ستاروں کی

وضع وکیفیت کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کنس کو ان ستاروں کے آسمان کے برجوں میں قرار پانے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو ہرنوں کے اپنے ٹھکانوں میں پنہاں ہونے سے مشابہت رکھتا ہے۔البتہ یہ معلوم ہے کہ نظام شمسی کے سیارے صرف ان پانچ تک محدود نہیں ہیں اور تین دوسرے سیارے اورانوس، پلوٹون اور نپٹون بھی موجود ہیں جو صرف ان دوربینوں سے دیکھے جا سکتے ہیں جو ستاروں کو دکھاتی ہیں اور وہ کرۂ ارض کے ساتھ مل کر نظام شمسی کے نو سیاروں کو تشکیل دیتے ہیں (البتہ یہ نو سیارے ایک یا کئی چاند رکھتے ہیں جن کا حساب اس جمع سے الگ ہے)۔

"جوادی"، جو جاریہ کی جمع ہے اور جس کے معنی وہ کشتیاں ہیں جو چل رہی ہوں، ایک لطیف تعبیر ہے جو ان ستاروں کی آسمان کے سمندر میں حرکت اور چلنے کو کشتیوں کے سمندروں اور دریاؤں میں چلنے سے تشبیہ دیتی ہے۔

بہرحال قرآن مجید گویا یہ چاہتا ہے کہ ان پُرمعنی اور ایک قسم کے ابہام کی آمیزش رکھنے والی قسموں کے ساتھ افکار انسانی کو بیدار کرے اور انہیں آسمان کے ستاروں کی عظیم فوج اور دستوں کے درمیان جو ان سیاروں کی مخصوص اور استثنائی وضع وکیفیت ہے، اس کی طرف متوجہ کرے تاکہ ان اجرام فلکی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور وفکر کے بعد دماغِ انسانی اس عظیم دست گاہ کو عالم وجود میں لانے والے کی عظمت سے آشنا ہو۔

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی کچھ اور تفسیریں بھی کی ہیں لیکن چونکہ وہ قابل ملاحظہ نہیں لہٰذا ان کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں جو امیرالمومنینؑ سے منقول ہے[1] آیا ہے کہ آپ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا (هی خمسة انجم زحل والمشتری والمریخ والزهرة وعطارد) وہ پانچ ستارے ہیں زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد۔

پس دوسری مرتبہ قسم کھا کر فرماتا ہے: "قسم ہے رات کی جب وہ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ (واللیل اذا عسعس)

"عسعس"، "عسعسة"، کے مادہ سے اصل میں دقیق اور ہلکی تاریکی کے معنی میں ہے اور چونکہ رات کی ابتدا اور انتہا میں تاریکی زیادہ ہلکی ہوتی ہے لہٰذا یہ معنی رات کے پشت پھیرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اور لفظ "عسعس" کا اطلاق رات کو گردش کرنے والے ملازمین پر بھی اسی مناسبت سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے اگرچہ یہ لفظ مکمل طور پر دو مختلف معانی رکھتا ہے لیکن یہاں بعد میں آنے

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۶۔

والی آیت کے قرینے کے پیش نظر جو صبح کی بات کرتی ہے مراد رات کا اختتام ہی ہے اور حقیقت میں اس قسم کے مشابہ ہے جو سورہ مدثر کی آیت ۳۳ میں آئی ہے (واللیل اذ ادبر)

اصولی طور پر رات جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے، خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے جو جسم و روح کے آرام و سکون کا باعث بھی ہے اور حرارت آفتاب کے اعتدال اور موجودات کی زندگی کے جاری رہنے کا سبب بھی ہے لیکن اختتام شب پر انحصار ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ وہ روشنی اور نور کی طرف رخ کیے ہوئے ہے اور اس سے قطع نظر پروردگار سے مناجات اور عبادت کرنے کے لیے بہترین وقت ہے اور عالم زندگانی کے آغاز و حرکت کا لمحہ ہے۔

آخر کار تیسری اور آخری قسم کی جانب رُخ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"قسم ہے صبح کی جبکہ وہ سانس لے" (والصبح اذا تنفس)۔ کیا ہی عمدہ اور جاذب توجہ تعبیر ہے۔ صبح کو زندہ موجود سے تشبیہ دی ہے کہ اس کے تنفس یعنی سانس لینے کی ابتدا طلوع سپیدۂ سحری سے ہوتی ہے وہ تمام موجودات میں روح حیات پھونکتی ہے۔ گویا ایک کالے حبشی لشکر کے ہاتھ اور پاؤں کے نیچے اس کا سانس رُک گیا تھا اور نور و روشنی کی پہلی شعاع کے چمکنے سے اس کے چنگل سے آزاد ہو کر تازہ سانس لینے لگی ہے۔

یہ تعبیر اس تعبیر کے مشابہ ہے جو سورہ مدثر میں رات کی قسم کے بعد آئی ہے جس میں فرماتا ہے: (والصبح اذا اسفر) "قسم ہے صبح کی جب وہ اپنے چہرہ سے نقاب ہٹائے" گویا رات کی تاریکی سیاہ نقاب کے مانند ہے جو صبح کے چہرہ پر پڑی ہے۔ سپیدۂ سحر کے وقت نقاب ہٹا کر اپنا نورانی اور حیات افزا چہرہ جو زندگی کی نشانی ہے، ساری دنیا کو دکھاتی ہے۔

بعد والی آیت میں اس چیز کو جس کی خاطر یہ ساری قسمیں کھائی گئی ہیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یقیناً یہ قرآن صاحب عزت اور عظیم بھیجے ہوئے کا کلام ہے (جبرائیل امینؑ) جسے وہ خدا کی طرف سے اس کے پیغمبرؐ کی طرف لایا ہے" (انہ لقول رسول کریم)۔ یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو پیغمبرؐ پر اتہام لگاتے تھے کہ قرآن انہی کا بنایا ہوا ہے اور اس کو خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

اس آیت میں اور بعد والی آیت میں جبرائیل امینؑ جو خدا کے پیک وحی ہیں، ان کے پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں جو درحقیقت ایسے ہیں جو ہر جامع الشرائط بھیجے جانے والے کے لیے لازمی ہیں۔

اس کی پہلی توصیف کریم ہونا ہے جو اس کے وجود کی قدر و قیمت کی طرف اشارہ ہے۔ جی ہاں، وہ خداوند بزرگ کی طرف سے ہے اور قیمتی وجود کا حامل ہے۔

اس کے بعد اس کے دوسرے اوصاف پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ صاحب قدرت ہے

اور عرش والے خدا کی بارگاہ میں بلند مقام کا حامل ہے" (ذی قوۃ عند ذی العرش مکین)[1]

ذی العرش خدا کی پاک ذات کی طرف اشارہ ہے۔ اگرچہ وہ تمام عالم ہستی کا مالک ہے لیکن چونکہ عرش چاہے وہ اس عالم کے معنی میں ہو جو ماورائے طبیعت ہے یا خدا کے علم مکنون کے مقام کے معنی میں ہو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لہٰذا صاحب عرش کہہ کر اس کی تعریف کی گئی ہے۔

"ذی قوۃ" (صاحب قدرت) کی تعبیر جبرائیلؑ کے بارے میں اس بناء پر ہے کہ اس قسم کے عظیم پیغام کے حصول اور اس کے باریک بینی پر مبنی ابلاغ کے لیے بڑی قدرت و توانائی کی ضرورت ہے اور اصولی طور پر ہر رسول کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی رسالت کے حدود میں صاحب قدرت ہو اور بالخصوص ہر قسم کی فراموشی سے مبرّا ہو جو ابلاغ کی راہ میں حائل ہو۔

مکین اس شخص کے معنوں میں ہے جو صاحب منزلت و مکانت ہو۔ بنیادی طور پر ضروری ہے کہ رسول کی شخصیت عظیم ہو تاکہ خدا کی رسالت اور نمائندگی کا فریضہ انجام دے سکے اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہو۔ اور یہ مسلّم ہے کہ عند کی تعبیر حضورِ مکانی کے معنوں میں نہیں ہے، وہ اس لیے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا۔ اس سے مراد حضورِ معنوی ہے۔

چوتھی اور پانچویں توصیف میں کہتا ہے "وہ فرشتوں کا فرمانروا اور مطاع ہے" (مطاع ثم امین)۔ ثُمَّ کی تعبیر جو اشارہ بعید کے لیے استعمال ہوتی ہے اس حقیقت کو پیش کرتی ہے کہ پیکِ وحیِ الٰہی عالم فرشتگان میں موردِ اطاعت ہے اور ان تمام چیزوں سے قطع نظر پیام الٰہی کے ابلاغ میں انتہائی امین ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی جبرائیل امین قرآن کی آیات کے پہنچانے کے سلسلہ میں فرشتوں کے ایک عظیم گروہ کے ہمراہ آتے تھے اور یقیناً ان کے درمیان مطاع تھے، یعنی سب فرشتے ان کی اطاعت کرتے تھے اور ایک رسول و سفیر کے لیے ضروری ہے کہ اس کے تمام ہمراہی اس کی اطاعت کرتے ہوں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ان آیات کے نزول کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ نے جبرائیل امین سے فرمایا: ما احسن ما اثنی علیك ربك: ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین فما کانت قوتك؟ وما کانت امانتك؟ تیرے پروردگار نے تیری کیا ہی عمدہ تعریف کی ہے کہ فرمایا ہے صاحب قدرت ہے اور صاحب عرش خدا کے ہاں قرب رکھتا ہے اور وہاں فرمانروا ہے اور امین ہے،

---

[1] "مکین"، "مکانت" کے مادہ سے مقام و منزلت کے معنوں میں ہے اور جیسا کہ راغب کے مفردات میں کلمات سے اور دوسرے مفسرین سے معلوم ہوتا ہے یہ اصل میں کون کے مادہ سے اسم مکان ہے۔ اس کے بعد کثرت استعمال کی بنا پر اسے مادہ فعل کے برابر قرار دیا گیا ہے اور تمکن اس سے مشتق ہوا ہے تسکن کی طرح جو سکون کے مادہ سے ہے۔

لہٰذا اپنی قدرت و امانت کا نمونہ پیش کر۔

تو جبرائیلؑ نے جواب میں عرض کیا "میری قدرت کا نمونہ یہ ہے کہ میں قوم لوط کے شہروں کی تباہی پر مامور ہوا وہ چار شہر تھے اور ہر شہر میں چار لاکھ جنگجو افراد موجود تھے۔ ان کی اولاد اس کے علاوہ تھی۔ میں نے ان شہروں کو اٹھالیا اور میں انہیں آسمان کی طرف لے گیا یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے ان کے جانوروں کی آواز سننے لگے۔ پھر انہیں زمین کی طرف لے آیا اور انہیں زیر و زبر کر دیا۔

"باقی رہا میری امانت کا نمونہ تو وہ یہ ہے کہ کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو مجھے دیا گیا ہو اور اس میں میں نے معمولی سا تجاوز بھی کیا ہو"[1]

اس کے بعد لوگ وہ ناروا نسبت، جو پیغمبر کی طرف دیتے تھے، اس کی نفی کرتے ہوئے فرماتا ہے: تمہارا صاحب دیوانہ نہیں ہے (وما صاحبکم بمجنون)۔

"صاحب" کی تعبیر جو ہمیشہ ساتھ رہنے والے رفیق، دوست اور ہم نشین کے معنی میں ہے علاوہ اس کے کہ پیغمبرؐ تمام لوگوں کے ساتھ اخلاق و تواضع سے پیش آتے تھے اور کبھی کسی کے مقابلہ میں برتری کا دعویٰ نہیں رکھتے تھے۔

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ نے سالہا سال تمہارے درمیان زندگی گزاری ہے اور تمہارے ہم نشین رہے ہیں اور تم نے انہیں عاقل و امین دیکھا ہے اور سمجھا ہے تو اب کس طرح ان کی طرف جنون کی نسبت دیتے ہو سوائے اس کے کہ وہ بعثت کے ساتھ ایسی تعلیمات اپنے ہمراہ لائے ہیں جو تمہارے تعصبات، ہوا و ہوس اور کورانہ تقلید کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔

لہٰذا اس خیال سے کہ تم اپنے آپ کو ان کے قوانین اور احکامات کی اطاعت سے بچائے رکھو، اس قسم کے اتہام ان پر لگاتے ہو۔ جنون کا الزام ان تمام الزامات میں سے ایک ہے جو، آیاتِ قرآن کے مطابق، خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں پر ہٹ دھرم دشمنوں کی طرف سے لگائے گئے۔

(کذالک ما اتی الذین من قبلھم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون) بات اس طرح ہے کہ ان سے پہلے کوئی پیغمبر کسی قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا مگر یہ کہ اس نے کہا کہ یہ ساحر اور جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ (ذاریات - ۵۲)۔

ان کی منطق میں عاقل وہ شخص تھا جو فاسد ماحول میں گھل مل جائے اور ویسی ہی خواہشات کی پیروی کرے۔ جدھر کی ہوا ہو ادھر کو چلے اور ہر اصلاحی و انقلابی تحریک سے بے تعلق رہے۔ اس معیار اور ضابطے کے مطابق دنیا پرستوں کی تاریک نگاہ میں تمام پیغمبر دیوانے تھے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۶۔ یہی مضمون تفسیر درالمنثور میں بھی زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلامؐ کے جبرائیل امین سے ارتباط کی تاکید کے لیے مزید فرماتا ہے: "اس نے یقینی طور پر جبرائیل کا واضح اور آشکار افق میں مشاہدہ کیا ہے" (ولقد راٰہ بالافق المبین)۔

افق مبین سے مراد وہی افق اعلیٰ اور فرشتوں کو آشکار کرنے والا افق ہے جس میں پیغمبر اکرمؐ نے جبرائیل کا مشاہدہ کیا۔

بعض مفسرین نے سورہ نجم کی آیت ۷ کو جس میں ہے (وھو بالافق الاعلیٰ) اس تفسیر پر شاہد سمجھا ہے لیکن جیسا کہ سورہ نجم کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ آیت اس سورہ کی باقی آیات کی طرح ایک دوسری حقیقت کو بیان کرتی ہے جو اس کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوگی۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ پیغمبرؐ نے جبرائیلؑ کا ان کی اصلی شکل وصورت میں دو بار مشاہدہ کیا۔ ایک دفعہ آغازِ بعثت میں کہ جبرائیل آنحضرتؐ کے سامنے افق بالا پر ظاہر ہوئے اور تمام مشرق و مغرب کو ڈھانپ لیا اور دوسری مرتبہ معراج میں کہ پیغمبرؐ نے انہیں اوپر والے آسمان میں اُن کی اصلی شکل میں دیکھا اور مفسرین زیر بحث آیت کو اسی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کی مراد ایسا مشاہدہ ہو جو شہودِ باطنی کے لحاظ سے ہو۔ مزید وضاحت کے لیے جلد ۲۲ ص ۴۸۶ سے آگے سورہ نجم کی آیت ۵ تا ۱۳ کی طرف رجوع فرمایئے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "پیغمبر اس چیز کے بارے میں جو اس نے بطریقِ وحی عالمِ غیب سے حاصل کی ہے بخیل نہیں ہے" (وما ھو علی الغیب بضنین)۔ ہر چیز بے کم وکاست بندگانِ خدا کے اختیار میں دے دیتا ہے۔

وہ بہت سے دوسرے لوگوں کے مانند نہیں کہ جب کسی اہم حقیقت پر دسترس حاصل کر لیتے ہیں تو اس کو چھپانے پر اصرار کرتے ہیں اور اکثر اس کے بیان کرنے پر بخل سے کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ان معلومات کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاتے ہیں۔

پیغمبرؐ ایسے نہیں ہیں، وہ پورے جود وسخا کے ساتھ، جو کچھ حاصل کرتے ہیں اُسے تمام ضرورت مندوں کے سامنے بیان کر دیتے ہیں حتیٰ کہ انہیں بھی بتا دیتے ہیں جو بلندی اور قرب کے قائل ہی نہیں ہیں اس امید پر کہ شاید ہدایت حاصل کریں اور راہِ حق کو اختیار کریں۔

"ضنین" "ضنّۃ" (بروزن منّۃ) نفیس اور قیمتی اشیاء کے بارے میں بخل کرنے کے معنی میں ہے اور یہ ایک ایسا عیب ہے جو کبھی کسی پیغمبر میں نہیں ہوتا۔ اور اگر دوسرے افراد اپنے علوم کے بارے میں ایسے عیب کا شکار ہیں تو ہوا کریں۔ پیغمبر جس کے علم کا سرچشمہ علمِ خدا کا بیکراں سمندر ہے، اس قسم کی باتوں سے مبرّا ہے۔

پروردگارِ عالم مزید فرماتا ہے: "اور وہ شیطانِ رجیم کی کہی ہوئی بات نہیں ہے" (وما ھو بقول

شیطان (رجیم)۔ یہ آیاتِ قرآنی ہرگز کاہنوں کی باتوں کی طرح نہیں ہیں جو شیاطین سے تعلق کی وجہ سے معلوم کر لیتے تھے۔ اور پھر اس حقیقت کی نشانیاں اس کے کلام سے ظاہر ہیں۔

اس لیے کہ کاہنوں کی باتیں جھوٹی ہوتی تھیں۔ ان میں بہت سے شبہات ہوتے تھے اور وہ غلطیوں کی آمیزش سے ملوث ہوتی تھیں، اور شیطانی میلانات و خواہشات کے گرد گھومتی تھیں۔ اس چیز کا قرآن مجید سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ حقیقت میں ان کی دوسری تہمت کا جواب ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ (معاذ اللہ) کاہن ہیں اور جو کچھ وہ لائے ہیں انہوں نے شیاطین سے لیا ہے۔ حالانکہ شیطانی باتیں گمراہ کن ہوتی ہیں اور قرآنی آیات سراسر نورِ ہدایت اور روشنی ہیں اور یہ حقیقت قرآنی آیات کو دیکھتے ہی ثابت ہو جاتی ہے۔

لفظ "رجیم" اصل میں رجم اور "رجام" (بروزن لجام) کے مادہ سے پتھر کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر قسم کے دور کرنے کے معنی میں آیا ہے اور شیطان رجیم سے مراد یہاں یہی معنی ہیں، یعنی وہ شیطان جو بارگاہِ خداوندی سے نکالا گیا ہے۔

ایک نکتہ

رسول کی شائستگی کی شرطیں

پانچ صفتیں جو مندرجہ بالا آیات میں جبرائیل امین کے لیے پیغمبر گرامی اسلامؐ کی طرف خدا کے بھیجے ہوئے قاصد کے عنوان کے ماتحت آئی ہیں، ان میں سے دو صفتیں ایسی ہیں جو ہر رسول اور فرستادۂ خدا میں سلسلہ مراتب کو نظر میں رکھتے ہوئے پائی جانی ضروری ہیں۔

پہلی صفت کرامت اور عمدہ صفات نفسی کا حامل ہونا ہے جو اس کو رسالت جیسے اہم کام کا اہل بنا دیں۔

دوسری صفت قدرت کا حامل ہونا ہے۔ (ذی قوۃ) تاکہ اپنے اثر رسالت کو لے کر قاطعیت اور توانائی کے ساتھ وہ آگے بڑھے اور ہر قسم کے ضعف اور کمزوری سے دور ہو۔

اس کے بعد اُس ہستی کی بارگاہ میں مقام و منزلت رکھنا جس کی رسالت کو اس نے قبول کیا ہے (مکین) تاکہ پیغامات کو اچھی طرح حاصل کرے اور اگر جواب کی ضرورت ہو تو بغیر کسی خوف و خطر کے اس کا ابلاغ کرے۔

چوتھی صفت یہ کہ اگر امرِ رسالت اہمیت رکھتا ہو تو اس کے معاون ہونے چاہئیں جو اس کی مدد کریں۔ ایسے معاون جو اطاعت گزار و فرمانبردار ہوں۔ (مطاع)

آخری صفت اس کا امانت دار ہونا ہے تاکہ وہ لوگ جو اس رسول سے پیغام لیں اس پر اعتماد کریں اور اس کی گفتگو بے کم و کاست اُس کا کلام شمار ہو جس کی طرف سے وہ آیا ہے۔

جب یہ پانچ اصول پورے ہوں تو پھر حق رسالت و پیغمبری ادا ہوگا۔ اسی لیے ہم پیغمبر اسلامؐ کے حالات اور آپؐ کی تاریخ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ آپؐ اپنے بھیجے ہوئے ایلچیوں کو بہت زیادہ احتیاط سے ساتھ ان افراد میں سے جو ان صفات کے حامل ہوتے تھے منتخب کرتے تھے جس کا ایک زندہ نمونہ جناب امیرالمومنین حضرت علیؑ کی ذات ہے اور پیغمبرؐ کی طرف سے سورہ برأت کی ابتدائی آیات کی مشرکین مکہ کے سامنے ان خاص حالات میں تبلیغ ہے جس کی تفصیل سورہ برات میں آچکی ہے۔

حضرت فرماتے ہیں: (رسولک ترجمان عقلک وکتابک ابلغ ماینطق عنک) تیرا بھیجا ہوا تیری عقل کو نمایاں کرتا ہے اور تیرا خط تیری بات کا نہایت پرگو ناطق ہے[1]

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ ۳۰۱۔

(۲۶) فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝
(۲۷) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝
(۲۸) لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ ۝
(۲۹) وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

ترجمہ

(۲۶) پس تم کہاں جا رہے ہو؟
(۲۷) یہ قرآن عالمین کے لیے صرف نصیحت ہے۔
(۲۸) ان لوگوں کے لیے جو چاہتے ہیں کہ نصیحت حاصل کریں۔
(۲۹) اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو عالمین کا پروردگار چاہے۔

تفسیر

اے غافلو! کہاں جا رہے ہو؟

گزشتہ آیات میں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے اس لیے کہ اس کے مضامین سے ہویدا ہے کہ یہ شیطانی کلام نہیں ہے بلکہ رحمٰن کا کلام ہے جو پیکِ وحیِ الٰہی کے ذریعہ، قدرت و امانتِ کلّی کے ساتھ، اس پیغمبر پر، جو انتہائی طور پر اعتدالِ عقلی کا حامل ہے، نازل ہوا ہے۔ ایسا پیغمبر جس نے تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور جو کچھ اسے تعلیم دی گئی ہے اس نے اسے بے کم و کاست بیان کیا ہے۔

پروردگارِ عالم زیرِ بحث آیات میں مخالفین کو اس عظیم کلام کی پیروی کرنے کی وجہ سے مستحقِ سرزنش قرار دیتا ہے اور ایک استفہام توبیخی کے ساتھ فرماتا ہے:

"ان حالات میں تم کہاں جا رہے ہو" (فاین تذھبون)۔ کیوں راہ راست کو چھوڑ کر بے راہ روی اختیار کرتے ہو اور کیوں اس چراغِ فروزاں سے منہ موڑ کر تاریکی کی طرف رواں دواں ہو۔ کیا تم اس سعادت و

سلامتی کے دشمن ہو؟ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

"یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے نصیحت ہی نصیحت ہے" (ان ھو الا ذکر للعالمین) ۔ سب کو نصیحت کرتا ہے تاکہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور چونکہ ہدایت و تربیت کے لیے فاعل کی صرف فاعلیت ہی کافی نہیں ہے بلکہ قابل کی قابلیت بھی درکار ہے لہٰذا بعد میں آنے والی آیت میں مزید فرماتا ہے :

"قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت کا باعث ہے جو تم میں سے چاہتے ہیں کہ صراطِ مستقیم اختیار کریں" (لمن شاء منکم ان یستقیم) ۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں فرماتا ہے کہ قرآن تمام لوگوں کے لیے نصیحت و بیداری کا سبب ہے اور اس آیت میں صرف ایک گروہ کا ذکر کرتا ہے، وہ لوگ جو ہدایت کو قبول کرنے اور راہ راست اختیار کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں ۔

یہ فرق اس بنا پر ہے کہ گزشتہ آیت فیضِ الٰہی کی عمومیت کو بیان کرتی ہے اور یہ آیت اس فیض سے فائدہ اٹھانے کی شرط کو پیش کرتی ہے ۔ تمام مواہب اور نعمتیں اسی طرح ہیں کہ اصل فیض عام ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ارادہ کی پختگی سے مشروط ہے ۔

انہی معانی کو لیے ہوئے سورہ بقرہ کی آیت ۲ بھی آئی ہے (ذالك الكتاب لا ريب فيه هدًى للمتقين) اس کتاب میں کوئی شک و تردد نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے ۔

بہرحال یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو بتاتی ہیں کہ خدا نے انسان کو آزاد اور خود مختار پیدا کیا ہے اور راہِ حق و باطل کو طے کرنے کا آخری فیصلہ اس کے اختیار میں ہے ۔

یستقیم کی تعبیر جاذبِ توجہ اور عمدہ ہے جو بتاتی ہے کہ راہِ اصلی جو انسان کے سامنے قرار پائی ہے وہ راہِ ہدایت و سعادت ہے باقی سب راستے منحرف کر دینے والے ہیں ۔

انسان کی تمام اندرونی اور بیرونی توانائیاں مجتمع ہیں کہ اسے راہِ مستقیم پر چلائیں اور اگر افراط و تفریط، شیطانی وسوسے اور گمراہ کرنے والے پروپیگنڈے درمیان میں نہ ہوں تو انسان ندائے فطرت کے ذریعہ اس صراطِ مستقیم پر قدم رکھ سکتا ہے ۔

ہمیں معلوم ہے کہ خطِ مستقیم ہمیشہ مقصد کی نزدیک ترین راہ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس بات کا امکان ہے کہ انسان کا ارادہ یہ توہم پیدا کرے کہ آدمی اس طرح آزاد ہے کہ اس راستے کو طے کرنے میں الٰہی توفیق کی کوئی احتیاج نہیں رکھتا تو بعد میں آنے والی آیت میں، جو اس سورہ کی آخری آیت ہے فرماتا ہے :

"تم ارادہ نہیں کرتے مگر یہ کہ عالمین اور تمام جہانوں کا پروردگار ارادہ کرے" (وما تشاءون الا ان یشاء اللہ رب العالمین) ۔ درحقیقت ان دونوں آیات کا مجموعہ اس دقیق و ظریف مسئلہ امر بین الامرین کو بیان کرتا ہے ۔ ایک طرف کہتا ہے ارادہ کی پختگی تمہارے اپنے اختیار میں ہے اور دوسری طرف کہتا ہے جب تک خدا نہ چاہے تم ارادہ نہیں کر سکتے ۔ یعنی اگر تمہیں مختار و آزاد پیدا کیا گیا ہے تو یہ اختیار و آزادی بھی خدا کی جانب سے

ہے۔ اس نے چاہا ہے کہ تم ایسے رہو۔

انسان اپنے اعمال میں نہ مجبور ہے نہ سو فیصدی آزاد ہے۔ نہ طریقۂ جبر صحیح ہے نہ طریقۂ تفویض۔ بلکہ جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ جسم و ہوش، عقل و توانائی، ارادہ کی پختگی کی قوت، وہ سب خدا کی جانب سے ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو ہمیشہ اسے ایک طرف تو خالق کا محتاج و نیاز مند بناتی ہے اور دوسری طرف اس کی آزادی اور اختیار کے تقاضے کی بنا پر اسے ذمہ داری سونپتی ہے۔

"رب العالمین" کی تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ مشیت الٰہی بھی انسان اور تمام عالمین کی تربیت، تکامل اور ارتقا کی راہ میں دخل رکھتی ہے وہ کبھی بھی نہیں چاہتا کہ کوئی گمراہ ہو اور گناہ کر کے اس کے جوارِ رحمت سے دور ہو۔ وہ اپنے ربوبیت کے تقاضے سے ان تمام لوگوں کی مدد کرتا ہے جو چاہتے ہیں کہ راہِ ارتقاء میں قدم رکھیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلکِ جبر کے طرفدار صرف دوسری آیت سے چمٹے ہوئے ہیں جبکہ ممکن ہے کہ تفویض کے طرفدار بھی پہلی آیت سے متوسل ہوں۔ آیات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا جو عام طور پر پہلے سے کیے ہوئے غلط فیصلوں کا معلول ہے، گمراہی کا سبب ہے۔

آیاتِ قرآن کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر ان کے مجموعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب پہلی آیت "لمن شاء منکم ان یستقیم" نازل ہوئی تو ابوجہل نے جو عملی طور پر نظریہ تفویض کا حامی تھا، کہا بڑا اچھا ہوا کہ تمام اختیارات ہمیں دے دیئے گئے ہیں۔ یہی موقع تھا کہ دوسری آیت نازل ہوئی "وما تشاءون الّا ان یشاء اللہ رب العالمین"[1]

خداوندا! ہم جانتے ہیں کہ راہ مستقیم کو طے کرنا تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے، ہمیں اس راہ کو طے کرنے کی توفیق عطا فرما۔

پروردگارا! ہماری خواہش ہے کہ ہم راہِ ہدایت پر چلیں تو بھی ارادہ فرما کہ اس راہ میں ہماری دستگیری فرمائے۔

بارالٰہا! محشر کا منظر اور تیری دادگاہ عدل و انصاف بہت ہولناک ہے اور ہمارا نامہ اعمال حسنات سے خالی ہے ہمیں اپنے عفو و فضل کی پناہ میں جگہ دے، نہ کہ میزان عدل و انصاف کے سامنے۔ آمین یارب العالمین۔

سورۂ تکویر کا اختتام

---

[1] روح المعانی، جلد ۳۰ ص ۶۲۔ اور روح البیان جلد ۱۰ ص ۳۵۴۔

سورۃ

انفطار

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اس میں ۱۹ آیتیں ہیں ۔

سورۂ انفطار کے مضامین

یہ سورہ قرآن مجید کے آخری پارے کی بہت سی سورتوں کی مانند قیامت سے متعلق مسائل کے بارے میں ہے اور اس کی آیتوں میں مجموعی طور پر اس تعلق کے پانچ موضوعات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۱۔ اشراط الساعۃ یعنی وہ عظیم حوادث جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کی ابتدا پر رونما ہوں گے۔

۲۔ انسان کی توجہ خدا کی نعمتوں کی طرف جنہوں نے اس کے سارے وجود کو گھیر رکھا ہے، اور اس کے غرور کو توڑنے کی جانب، تاکہ وہ اپنے آپ کو معاد کے لیے تیار کرے۔

۳۔ ان فرشتوں کی طرف اشارہ جو انسانوں کے اعمال کو ثبت کرنے پر مامور ہیں۔

۴۔ قیامت میں نیک و بد لوگوں کی سرنوشت۔

۵۔ اس عظیم دن کی سختیوں کا ایک گوشہ۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ (من قرأ هاتين السورتين "اذا السماء انفطرت" و "اذا السماء انشقت" وجعلهما نصب عينه في صلوٰة الفريضة والنافلة لم يحجبه من الله حجاب ولم يحجزه من الله حاجز ولم يزل ينظر الى الله وينظر الله اليه حتى يفرغ من حساب الناس) جو شخص ان دو سورتوں سورہ انفطار اور سورہ انشقاق کی تلاوت کرے اور دونوں کو نماز فریضہ و نافلہ میں اپنا نصب العین بنالے تو کوئی اسے خدا سے محجوب نہیں کر سکے گا اور کوئی چیز اس کے اور خداوند متعال کے درمیان حائل نہیں ہوگی [1]

یقیناً سب سے بڑی نعمت بارگاہِ خداوندی میں حضوری ہے اور بندہ کے اور خدا کے درمیان سے حجابوں کا ہٹ جانا اس کے لیے ہے جو ان دونوں سورتوں کو اپنے دل و جان کی گہرائیوں میں جگہ دے اور اپنی اس بنیاد پر اصلاح کرے، نہ یہ کہ صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا کرے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۴۴ و نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۲۰ (از کتاب ثواب الاعمال)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ
(۲) وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ
(۳) وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ
(۴) وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ۙ
(۵) عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ؕ

ترجمہ اُس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

(۱) جس وقت (کرّاتِ آسمانی) پھٹ جائیں گے۔
(۲) جس وقت ستارے پراگندہ ہو کر گر پڑیں گے۔
(۳) اور جس وقت سمندر ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔
(۴) اور جس وقت قبریں زیر و زبر ہوں گی۔ (اور مُردے خارج ہوں گے)۔
(۵) جس وقت ہر شخص جان لے گا اس کو جسے پہلے بھیج چکا ہے اور جو کچھ بعد کے لیے چھوڑا ہے۔

تفسیر

جس وقت اس جہان کا نظام زیر و زبر ہو جائے گا

ہم پھر اس سورہ کے آغاز میں بعض ایسے وحشت ناک حوادث کا سامنا کر رہے ہیں جو آغازِ قیامت میں سارے جہان کو گھیر لیں گے۔ پہلے فرماتا ہے:

"جس وقت آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے" (اذا السماء انفطرت)۔ اور جس وقت ستارے

پراگندہ ہوکر گرنے لگیں گے ،، (و اذا الکواکب انتثرت) ۔ عالم بالا کا نظام درہم وبرہم ہو جائے گا اور ہولناک دھماکے سارے آسمان کے کُروں کو گھیر لیں گے تمام منظومے اپنے نظام کھو بیٹھیں گے۔ اور ستارے اپنے مدار سے نکل جائیں گے اور شدید تصادم کی وجہ سے ادھر ادھر بکھر جائیں گے ۔اس جہان کی عمر ختم ہو جائے گی اور عام چیزیں ویران ہو جائیں گی تاکہ ان کی ویرانی سے آخرت کا جہاں آباد ہو جائے۔

،، انفطرت ،، انفطار کے مادہ سے شگافتہ ہونے کے معنوں میں ہے ۔اس تعبیر کی نظیر بہت سی آیات میں آئی ہے ۔منجملہ دیگر تعبیرات کے سورہ انشقاق کی آیت ۱ میں ہم پڑھتے ہیں (اذا السماء انشقت) اور سورہ مزمل کی آیت ۱۸ میں فرماتا ہے : (السماء منفطر بہ)

"انتثرت" اصل میں مادہ نثر (بروزن نصر) سے پراگندہ کرنے اور ہونے کے معنی میں ہے اور چونکہ ستاروں کا پراگندہ ہونا (گلوبند کی طرح جس کا دھاگہ ٹوٹ جائے) سبب بنتا ہے کہ ہر ایک کسی گوشہ میں جا گرے۔

بعض مفسرین نے ستاروں کے سقوط اور ان کے گرنے سے تفسیر کی ہے اور یہ پراگندگی کے معنی کا لازمہ ہے۔

،، کواکب ،، کوکب کی جمع عربی زبان میں بہت سے معانی میں آتی ہے۔دوسرے ستارے بطورِ عام اور زہرہ ستارہ بطور خاص۔

وہ سفیدی جو آنکھ میں ظاہر ہوتی ہے ،بلند گھاس ، درخت کا شگوفہ ،فولاد کی چمک ، زیبا و خوبصورت نوجوان ،تلوار ، پانی اور کسی جمعیت کا رئیس ۔

لیکن ظاہری طور پر اس کے حقیقی معنی وہی درخشاں اور فروزاں ستارہ ہیں ۔باقی معانی مجازی شمار ہوتے ہیں جن میں اصلی معانی کی مشابہت پائی جاتی ہے ۔

یہ کہ ستاروں کا پراگندہ ہونا اور آسمانی کواکب کا انفجار اور پھٹنا اور ان کے نظام کا درہم برہم ہونا کن عوامل و اسباب کے زیرِ اثر رونما ہوگا ۔کیا فطرت کا اعتدال درہم وبرہم ہو جائے گا یا کوئی عظیم مرموز قوت اسے اپنے تحت الشعاع قرار دے گی یا عالم کا عظیم تدریجی انبساط اور پھیلاؤ جو موجودہ زمانے میں ماہرین کے نقطہ نظر سے اثبات کے درجہ کو پہنچ گیا ہے یہاں تک ہو جائے گا کہ جس کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوگا ۔کوئی شخص ٹھیک طرح نہیں جانتا۔

لیکن ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جس وقت یہ عظیم آسمانی کُرے اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہوں گے تو اس وقت کمزور ضعیف انسان کا جو حال ہوگا وہ ظاہر ہے ۔

یہ سب کچھ اس جہان کے فنا ہونے کے بارے میں انسان کو خبردار کرنا ہے اور اسے تنبیہ کرنا ہے تاکہ وہ اس دنیا کو ایسا جاودانی گھر نہ سمجھ بیٹھے جس میں اسے ہمیشہ رہنا ہے اس سے دل نہ لگائے اور اس کے لیے ہزارہا گناہوں سے آلودہ نہ ہو۔

اس کے بعد آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوع بناتا ہے اور فرماتا ہے :

"جس وقت سمندر اور دریا آپس میں مل جائیں گے" (واذا البحار فجرت)۔ اگرچہ اس وقت بھی روئے زمین کا عام سمندر، سوائے کچھ چھوٹے دریاؤں کے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں لیکن یوں نظر آتا ہے کہ ابتدائے قیامت میں شدید زلزلوں کی بنا پر یا پہاڑوں کے پراگندہ ہونے اور سمندر میں گرپڑنے کی وجہ سے سمندر اس طرح پُر ہو جائیں گے کہ پانی تمام خشکیوں کو گھیرے گا اور سارے دریا ایک وسیع تر سمندر کی شکل اختیار کرلیں گے جیسا کہ سورہ تکویر کی آیت ۶ (و اذا البحار سجرت) کی ایک یہ بھی تفسیر ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

دوسرا احتمال، جو اس آیت کی تفسیر میں اور اسی طرح سورہ تکویر کی آیت ۶ کی تفسیر میں پیش کیا گیا ہے، یہ ہے کہ فجرت اور سجرت وہی انفجار یعنی پھٹنا اور جلنا ہے جو تمام سمندروں اور دریاؤں کو آگ کے ایک عظیم ٹکڑے میں تبدیل کر دے گا۔

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے پانی دو عناصر سے تشکیل پاتا ہے جو دونوں شدید طور پر قابلِ احتراق یعنی جلنے کے قابل ہے۔ اب اگر سمندروں کے پانی کا تجزیہ ہو اور وہ کچھ عوامل و اسباب کے زیرِ اثر آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تبدیل ہو جائے تو ایک ہی شعلے کے زیرِ اثر سب آگ میں تبدیل ہو جائیں۔

اس کے بعد قیامت کے دوسرے مرحلہ کے بارے میں جو اس جہان کی تجدیدِ حیات اور مُردوں کی زندگی کی تجدید کا مرحلہ ہے فرماتا ہے:

"اور جس وقت قبریں زیر و زبر ہوں" (و اذا القبور بعثرت)۔ اور مُردے باہر آکر حساب کتاب کے لیے آمادہ ہوں۔

"بعثرت" کے معنی زیر و زبر ہونا اور منتشر ہونا ہے۔ راغب مفردات میں بعید نہیں سمجھتا کہ یہ لفظ دو الفاظ سے مرکب ہو۔ "بعث" اور "اثرت" اسی لیے دونوں کے معنی اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور نتیجہ زیر و زبر ہونے کے معانی کی صورت میں نکلا ہے۔ (مثل بسملہ کے جو بسم اور اللہ سے لیا گیا ہے)۔

بہرحال جو کچھ اوپر والی آیات میں آیا ہے اس چیز کے مشابہ ہے جو ہم سورہ زلزال میں پڑھتے ہیں: (و اخرجت الارض اثقالھا) "زمین اپنے ذخائر باہر نکالے گی" (اس بنا پر اس سے مراد زمین میں دفن شدہ مردے ہوں گے جو اس آیت کی مشہور تفاسیر میں سے ایک ہے)۔ یا اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نازعات کی آیہ ۱۳ اور ۱۴ میں آئی ہے۔ (فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذا ھم بالساھرۃ) "صرف ایک ہی صیحہ ہوگا جس کے بعد اچانک سب کے سب صفحۂ زمین پر ظاہر ہوں گے۔

یہ سب تعبیریں بتاتی ہیں کہ مُردوں کا زندہ ہونا اور قبروں سے خارج ہونا نہایت تیزی سے ناگہانی طور پر صورت پذیر ہوگا۔ ان نشانیوں کو بیان کرنے کے بعد جو قیامت سے قبل اور اس کے بعد صورت پذیر ہوں گی آخری بات کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"اس دن ہر شخص جانتا ہے کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا رکھا ہے" (علمت نفس ما قدّمت و اخّرت)۔ جی ہاں! اس دن حجابات ہٹ جائیں گے۔ غرور و غفلت کے پردے چاک ہو جائیں گے اور حقائقِ جہاں آشکار ہو جائیں گے۔ اور چونکہ وہ دن یوم البروز ہے لہٰذا ہر چیز ظاہر ہو جائے گی اور یہ وہی وقت ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال کو دیکھے گا اور اپنے نیک و بد سے آگاہ ہوگا۔ کون سے اعمال وہ آگے بھیج چکا ہے اور کون سے کام ہیں جن کے آثار اس کے بعد دنیا میں باقی رہ گئے ہیں اور اس کے نتائج اس تک پہنچے ہیں۔

خیرات اور صدقہ جاریہ کے مثل۔ اور وہ تعمیرات و آثار جو مقاصد رحمانی یا مقاصد شیطانی کے لیے اس نے بنائی ہیں اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ یا کتابیں اور دیگر علمی آثار وغیرہ۔ علمی آثار جو نیک و بد مقاصد کے لیے اس نے اپنے بعد چھوڑے ہیں اور وہ دوسروں کے لیے استفادہ کا باعث بنے ہیں۔ ایسے نیک و بد سنن و طرق جنہوں نے اقوام و ملل کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ یہ ہیں اُن کاموں کے نمونے جن کے نتائج انسان کے بعد اس تک پہنچتے ہیں اور جو اوپر والی آیت میں "اخرت" کا مصداق ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان اس دنیا میں بھی اجمالی طور پر اپنے اعمال سے باخبر ہے لیکن بھول جانا اور اپنے اعمال کی پرستش کرنا عام طور پر مانع ہوتا ہے کہ انسان ان سب کو اپنے دل میں جگہ دے اور اپنے اعمال کے آثار کی گہرائی اور عمق سے واقف ہو۔

لیکن اس دن جب ہر چیز میں انقلاب برپا ہوگا تو انسان کی روح اور جان بھی اس قسم کے انقلاب سے متاثر ہوگی۔ یہ وہ جگہ ہوگی جہاں انسان اپنے تمام اعمال کا تفصیلی علم حاصل کرے گا بلکہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۳۰ (یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرًا وما عملت من سوء) سب کو اپنے سامنے حاضر پائے گا۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے اور تفاسیر بھی بیان کی ہیں۔ منجملہ دیگر تفاسیر کے مراد وہ کام ہیں جنہیں ابتدائے عمر میں مقدم رکھتا تھا اور وہ کام جو اواخرِ عمر کے لیے چھوڑ رکھے تھے لیکن پہلی تفسیر ہر جہت سے زیادہ مناسب ہے۔ نفس سے مراد یہاں نفوسِ انسانی میں سے ہر فرد ہے اور اس میں تمام افرادِ بشر شامل ہیں۔

ایک نکتہ

وہ آثار جو انسان کے بعد باقی رہ جاتے ہیں

علاوہ اس چیز کے جو اوپر والی آیات میں آئی ہے اسلامی روایات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کچھ آثار انسان کے بعد باقی رہ جائیں جن کی برکتیں یا بُرے نتائج سالہا سال تک حتیٰ کہ

قیامت تک اس شخص کو پہنچتے رہیں۔

ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے (لیس یتبع الرجل بعد موتہ من الاجر الا ثلاث خصال صدقۃ اجراھا فی حیاتہ فھی تجری بعد موتہ وسنۃ ھدی سنّھا فھی تعمل بھا بعد موتہ وولد صالح یستغفر لہ) انسان کی موت کے بعد اس کے اعمال کی کتاب بند ہو جاتی ہے اور سزا یا جزا اُسے نہیں ملتی لیکن تین طریقوں سے اجر یا سزا مل سکتی ہے عمارتیں یا مفید چیزیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے وہ اپنی طرف سے بطور یادگار چھوڑ گیا ہے جو اس کے بعد باقی ہیں، دوسرے ہدایت کرنے والی سنت جسے وہ وجود میں لایا ہے اور اس کی موت کے بعد اس پر عمل ہو رہا ہے اور تیسرے وہ نیک اور صالح بیٹا جو اس کے لیے استغفار کرتا ہے [1]

ایک دوسری روایت میں یہ چھ امور شمار کیے گئے ہیں جو مومنین کی حالت کے لیے ان کی موت کے بعد مفید ہیں، نیک بیٹا، وہ قرآن جس کی وہ تلاوت کرتا تھا، وہ کنواں جو اس نے کھودا، وہ درخت جو اس نے بویا، پانی مہیا کرنا اور سنت حسنہ جو اس کے بعد رہ جائے اور مورد توجہ قرار پائے [2]

بعض روایات میں اس علم و دانش پر جو کسی کی جانب سے لوگوں میں رہ جائے انحصار کیا گیا ہے [3]

خصوصیت کے ساتھ نیک یا بد سنت کے بارے میں کئی روایتیں ہمارے پاس ہیں جو لوگوں کو خبردار کرتی ہیں کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے اعمال کے نتیجے میں کس قسم کی سنت لوگوں کے درمیان باقی رہتی ہے۔

مرحوم طبرسی زیر بحث آیات کے ذیل میں اسی مضمون کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ ایک دن ایک شخص بارگاہ پیغمبرؐ میں کھڑا ہو گیا اور اس نے لوگوں سے مدد طلب کی تو سب لوگ خاموش رہے۔ اس موقع پر ایک صحابی نے اس سائل کو کوئی چیز دے دی، باقی اصحاب نے بھی اس کی پیروی کی اور وہ بھی اس ضرورت مند کی مدد کرنے لگے۔ اس پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

(من استن خیرًا فاستن بہ فلہ اجرہ ومثل اجور من اتبعہ غیر منتقص من اجورھم ومن استن شرًا فاستن بہ فعلیہ وزرہ ومثل اوزار من اتبعہ غیر منتقص من اوزارھم)

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱۷، ص ۲۵۷۔

[2] ایضاً " " " "

[3] منیۃ المرید ص ۱۱۔

"جو شخص کوئی نیک سنت جاری کرے اور دوسرے اس کی پیروی کریں تو وہ اپنا اجر تو رکھتا ہی ہے اس کے علاوہ ان لوگوں کے اجر کے برابر بھی جنہوں نے اس کی پیروی کی ہے بغیر اس کے کہ ان پیروی کرنے والے لوگوں کے اجر میں کوئی کمی ہو اور جو شخص بُری سنت جاری کرے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا اپنا گناہ تو ہے ہی اس کے علاوہ جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے ان کے گناہوں کے برابر بھی اس کا گناہ ہے بغیر اس کے کہ پیروی کرنے والوں کے گناہوں میں کچھ کمی ہو"

یہ وہ مقام تھا جہاں اصحاب پیغمبر میں سے حذیفہ نے آیت (علمت نفس ماقدمت واخرت) کی تلاوت کی ہے[1]

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: (فکیف بکم لوتناهت بکم الامور و بعثرت القبور هنالك تبلواکل نفس ما اسلفت وردوا الی الله مولاهم الحق وضل عنهم ما کانوا یفترون) تمہارا کیا حال ہوگا جس وقت تمام امور اختتام پذیر ہوں گے قبریں زیر و زبر ہوں گی اور تم سب کے سب عرصہ محشر میں قیام پذیر ہو گے وہاں ہر شخص ہر عمل کو جسے اس نے پہلے انجام دیا ہوگا آزمائے گا اور سب کے سب خدا کی طرف پلٹ جائیں گے جو ان کا حقیقی مولا و سرپرست ہے اور جنہیں جھوٹ موٹ اس کی مثل قرار دیا تھا ان کے دل سے محو ہو جائیں گے[2]

یہ آیات و روایات انسان کی ذمہ داری کی حدود کو اس کے اعمال کے مقابلہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے معین کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ کس حد تک ہر انسان اپنے اعمال کے سلسلہ میں جوابدہ ہے یہاں تک کہ ممکن ہے کہ ہزارہا سال گزرنے کے بعد اس کے لیے اچھا اجر حاصل کریں یا اس پر لعنت و گناہ کا بوجھ ڈالیں۔ اس سلسلہ میں جلد ۱ ص ۲۰۶ تا ۲۰۸ (سورہ نحل کی آیت ۲۵ کے ذیل میں) پر بھی ہم بحث کر چکے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۹۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۶۔

۶ يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۙ
۷ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۙ
۸ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۚ
۹ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ ۙ
۱۰ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۙ
۱۱ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۙ
۱۲ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝

ترجمہ

۶ اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے کریم پروردگار کے مقابلہ میں مغرور کر دیا ہے؟
۷ وہ خدا جس نے تجھے پیدا کیا اور منظم کیا۔
۸ اور جس شکل میں چاہتا تھا تجھے مرکب کیا۔
۹ جیسا تم خیال کرتے ہو ویسا نہیں ہے بلکہ تم روزِ جزا کے منکر ہو۔
۱۰ اور اس میں شک نہیں کہ تم پر نگہبان مقرر کیے گئے ہیں۔
۱۱ بلند منزلت والے اور لکھنے والے (تمہارے نیک و بد اعمال کے)۔
۱۲ وہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو۔

تفسیر

اے انسان تجھے کس چیز نے مغرور کر دیا ہے؟

گزشتہ آیتوں کے بعد جو قیامت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں زیر بحث آیتوں میں انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اور اس کو خدا کے سامنے اس کی ذمہ داریوں کے طرف توجہ دلاتے ہوئے پہلے اسے مخاطب کیا ہے اور تیز ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ جس میں ایک طرح کا لطف و کرم بھی ملا ہوا ہے فرماتا ہے:

"اے انسان تجھے کس چیز نے تیرے کریم پروردگار سے غافل کر دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں مغرور کیا ہے" (یا ایھا الانسان ما غرك بربك الکریم)۔

یہاں انسان کا اس کی انسانیت کے لحاظ سے جس میں اس جہان کے باقی موجودات کے مقابلہ میں تمام امتیازات کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے مخاطب کیا ہے۔ اس کے بعد اُسے اس خدا کے سامنے پیش کیا ہے جو رب بھی ہے اور کریم بھی ہے۔ جس نے اپنی ربوبیت کے تقاضے سے ہمیشہ اسے اپنی رحمت سے نوازا ہے اور اس کی تربیت و تکامل و ارتقاء کا ذمہ لیا ہے اور اپنے تقاضائے کرم سے اسے اپنے خوان نعمت پر جگہ دی ہے۔ اور اپنی تمام مادی و معنوی نعمتوں سے اُسے سرفراز کیا ہے بغیر اس بات کے کہ اس سے وہ کوئی توقع رکھتا ہو اور ان نعمتوں کا کوئی اجر اس سے طلب کرے حتیٰ کہ اس کی خطاؤں سے بھی چشم پوشی کرتا ہے اور اپنے لطف و کرم سے اسے مورد عفو و بخشش قرار دیتا ہے۔

کیا یہ مناسب ہے کہ اس قسم کا وجود ایسے پروردگار کے مقابلہ میں جسارت و غرور سے کام لے یا ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل ہو اور اس کے فرمان کی انجام دہی میں جو خود اس کی سعادت کا ضامن ہے قصور و کوتاہی کا ارتکاب کرے۔

اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اس آیت کی تلاوت کے موقع پر فرمایا (غرّہ جھلہ) اس کی جہالت و نادانی نے اسے مغرور و غافل بنایا ہے[1]

یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ اپنی ربوبیت و کرم پر انحصار کرتے ہوئے وہ انسان کے غرور و غفلت کو ختم کرے۔ اس طرح سے جیسا کہ بعض نے خیال کیا ہے کہ مقصود کلام یہ ہے کہ آدمی کو تلقین کی جائے کہ خدا سے عذر خواہی کے سلسلہ میں وہ جواب میں کہے: "تیرے کرم نے مجھے مغرور کیا ہے"

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۴۹۔ یہی حدیث درالمنثور، روح البیان، روح المعانی اور قرطبی میں بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہے۔

نیز جو کچھ فضیل ابن عیاض سے نقل ہوا ہے کہ اس سے سوال کیا گیا کہ اگر تجھے خدا قیامت کے دن اپنے حضور میں طلب کرے اور تجھ سے سوال کرے، "ما غرك بربك الكريم"، تو جواب میں تو کیا کہے گا۔ اس نے کہا میں جواب میں کہوں گا "غرني ستورك المرخاة"، جو پردے تو نے میرے گناہ پر ڈالے ہوئے تھے انہوں نے مجھے غافل و مغرور کیا ہے۔

یہ سب مفہوم آیت کے ساتھ سازگار نہیں ہے بلکہ آیت کے مفہوم کے تضاد سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے کہ مقصودِ آیت غرور کو ختم کرنا ہے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنا ہے، نہ یہ کہ نیا پردہ غفلت کے پردوں پر ڈالنا ہے۔ اس بنا پر مناسب نہیں ہے کہ آیت کو اس کے مقصد سے دُور لے جائیں اور اس کی متضاد کیفیت سے نتیجۂ کلام اخذ کریں۔

"غرك"، غرور کے مادہ سے اصل میں بیداری کے موقعہ پر غفلت کے معنی میں ہے دوسرے لفظوں میں ایسے مقام پر غفلت سے کام لینا جہاں غفلت کرنا بالکل نامناسب ہو۔ اور چونکہ غفلت بعض اوقات جسارت یا احساسِ برتری کا سبب بنتی ہے لہٰذا غرور کے لفظ کی ان معانی سے بھی تفسیر ہوئی ہے اور شیطان کو اسی وجہ سے غرور (بروزن شرور) کہتے ہیں۔ وہ انسان کو اپنے وسوسوں سے فریب دیتا ہے اور اسے غافل و مغرور کر دیتا ہے۔

"کریم" کی تفسیر میں مفسرین نے انواع و اقسام کی تعبیریں پیش کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کریم وہ بخشنے والا ہے جس کے تمام افعال احسان ہیں اور وہ کبھی اتنی بخشش کے ہوتے ہوئے نفع و نقصان کا خیال نہیں کرتا۔ بعض نے کہا ہے کہ کریم وہ شخص ہے جو طلب سے زیادہ بخش دے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کریم وہ شخص ہے جو تھوڑی سی متاع کو قبول کر لیتا ہے اور اس کے مقابلے میں زیادہ قیمت دیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ سب چیزیں کریم کے مفہوم میں شامل ہیں۔

خدا کے کرم کے سلسلہ میں بس اتنا کافی ہے کہ وہ صرف گنہگاروں کو معاف کر کے راضی نہیں ہوتا بلکہ شائستہ افراد کے گناہوں کو حسنات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ اس آیت کی تفسیر میں عجیب و غریب جملے ارشاد فرماتے ہیں:

یہ آیت سننے والے کے سامنے بہت مضبوط دلیل ہے اور ایسے شخص کے سامنے جسے جہالت و نادانی نے مغرور کر دیا ہو قاطع عذر ہے۔ خدا فرماتا ہے:

"اے انسان تجھے کس چیز نے گناہ کرنے پر جرأت دلائی ہے اور کس چیز نے تجھے تیرے پروردگار کے مقابلہ میں مغرور کر دیا ہے اور کس چیز نے اپنی ہلاکت کے ساتھ تعلق پیدا کر دیا ہے؟ کیا تیری اس بلا کے لیے صحتمند ہونا نہیں ہے، یا تیرے اس خواب کے لیے بیداری نہیں ہے۔ تو خود پر کم از کم اتنا تو رحم کر جتنا تو دوسروں پر کرتا ہے۔

تُو جب کسی کو جلانے والے سورج کی دھوپ میں دیکھے تو اس پر سایہ کرتا ہے جب کسی بیمار کو دیکھے کہ درد و تکلیف نے اسے سخت نالاں کر دیا ہے تو تُو اس پر رحم کھا کر آنسو بہاتا ہے تو وہ کیا شئے ہے جس نے اپنی بیماری پر تجھے ایک طرح کا صبر کرنے والا بنا دیا ہے اور اپنی مصیبت پر مطمئن کر دیا ہے اور خود پر گریہ کرنے سے باز رکھا ہے، حالانکہ تیرے نزدیک عزیز ترین افراد میں سے تُو خود ہے تو پھر کس طرح رات کو نزولِ بلا کے خوف نے تجھے بیدار نہیں کیا حالانکہ گناہ و معصیت میں تُو غوطہ زن ہے اور اس کے غلبہ سے باہر بھی نہیں ہے۔

آ اور اس غفلت کی بیماری کا عزمِ صمیم کی دوا سے علاج کر اور اس خوابِ غفلت کو جس نے تیری آنکھوں کو گھیر رکھا ہے، بیداری سے برطرف کر۔ آخدا کا مطیع و فرمانبردار بن جا اور اس کی یاد سے مانوس ہو۔

اچھی طرح جان لے کہ تیرے خدا سے غفلت کرنے کے موقع پر وہ نعمتیں دینے پر تجھ سے عنایت کرتا ہے اور تجھے اپنے عفو و کرم کی طرف بلاتا ہے اور اپنی برکتوں کے زیرِ سایہ تجھے دیکھنا چاہتا ہے، حالانکہ تُو نے اس کی طرف پشت کر رکھی ہے اور دوسرے کی طرف رخ کر رکھا ہے۔

بزرگ و عظیم ہے وہ خدا جو باوجود اس عظیم قدرت کے کریم ہے لیکن تُو باوجود اس ضعف و حقارت کے اس معصیت پر کس قدر جری ہے[1]

اس کے بعد اس غافل انسان کو بیدار کرنے کے لیے اپنے لطف و کرم کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ خدا جس نے تجھے پیدا کیا ہے پھر تیرے وجود کی دستگاہ کو منظم کیا اور اسے اعتدال بخشا" (الذی خلقك فسوّاك فعدلك) - "اور جس شکل میں چاہتا تھا تیری ترکیب کی" (فی ای صورة ماشاء ركّبك)[2]

اور اس طرح خلقت کے چار عظیم مرحلوں کو یعنی اصل خلقت، پھر اس کی تنظیم، پھر اس میں اعتدال، آخر میں ترکیب بندی کو چار مختصر سی پُرمعنی عبارتوں میں بیان کرتا ہے۔

پہلے مرحلے میں اصل خلقتِ انسانی قرار پاتی ہے کہ اسے ناچیز و حقیر نطفہ سے رحم کے ظلمت کدے میں خلق کیا۔ بعد کے مرحلہ میں جو تسویہ و تنظیم کا مرحلہ ہے اس کے پیکر کے اعضا میں سے ہر عضو کو تنظیم کے ساتھ

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۳۔

[2] "ماشاء" میں ما زائدہ ہے بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ ما شرطیہ ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

موزوں کیا۔ آنکھ، کان، دل، رگیں اور باقی اعضا جن میں سے اگر انسان ہر ایک کی ساخت، بناوٹ اور نظام پر غور و فکر کرے اور خدا کے لطف و کرم کو ان میں سے ایک ایک میں دیکھے تو علم و قدرت اور لطف و کرم کی ایک دنیا اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم دیکھے گا۔

وہ نعمتیں کہ ہزارہا سال گزرنے کے بعد بھی ماہرینِ علوم طبعی ان کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں لیکن ابھی آغازِ کار ہے اور وہ ابھی تحقیق کی ابتدا ہی میں ہیں۔

اس کے بعد ایک تیسری نعمت کو موضوع گفتگو بناتا ہے اور وہ اعضائے جسم انسانی کے درمیان اعتدال و ہم آہنگی ہے۔ جسم انسانی دو حصّوں پر مبنی پیدا کیا گیا ہے جو دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ہاتھ پاؤں، آنکھ کان، استخواں، عروق و اعصاب و عضلات جسم کے دونوں حصوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے والے اور ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔

علاوہ ازیں مختلف اعضا بھی ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرتے ہیں مثلاً سانس لینے کا نظام گردشِ خون کی مدد کرتا ہے اور گردشِ خون کا نظام تنفس کے ساتھ مل کر غذا کے لقمے کو نگلنے کے لیے اور دانت، زبان، لعابِ دہن کے غدود اور اطرافِ دہن کے عضلات اور گلا یہ سب ایک دوسرے کے دست بدست کام کرتے ہیں یہاں تک کہ لقمہ ہاضمہ کے نظام میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بھی بہت سی ہم آہنگیاں صورت پذیر ہوتی ہیں تاکہ غذا جزوِ بدن ہو سکے اور قوت و حرکت و سعی و کوشش کو پیدا کرے۔ یہ سب "فعدلك" کے جملہ میں پنہاں ہیں۔ بعض اس جملہ کو تمام انواعِ حیوانات میں سے انسان کے سیدھے قد کی طرف، جو اس کی بہت ہی فضیلت کا باعث ہے اشارہ سمجھتے ہیں۔ یہ معانی بعد والے مرحلہ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں لیکن پہلے معانی زیادہ جامع ہیں۔

انجام کار آخری مرحلہ، دوسرے موجودات کے مقابلہ میں اس کی ترکیب اور صورت پذیری کا آن پہنچتا ہے۔ جی ہاں خدا نے نوعِ انسان کو دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں موزوں تر اور زیباتر بنایا ہے اور اسے عمدہ شکل عنایت کی ہے اور ایسی سیرت دی ہے جس میں زیبائی و خوبصورتی کے ساتھ فطری بیداری بھی ہے اور ایسی ترکیب جو علم، آگاہی، تعلیم و تربیت کو قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

اس سے قطع نظر افرادِ انسانی کی صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور جیسا کہ سورہ روم کی آیت ۲۲ میں آیا ہے: "تمہارے رنگوں اور زبانوں کا اختلاف خدا کی آیات میں سے ہے" (ومن آیاته خلق السماوات والارض واختلاف السنتكم والوانكم) اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو نوعِ بشر کی اجتماعی زندگی کا نظام معطل ہو جاتا۔

اس اختلافِ ظاہری کے علاوہ استعداد، ذوق اور سلیقے کے اختلاف قرار دیئے ہیں اور ان کی دو صورتیں بنائیں جن کا اس کی حکمت تقاضا کرتی تھی تاکہ ان کے مجموعہ سے ایک صحیح و سالم معاشرہ وجود میں

آئے جو اپنی تمام ضرورتوں کو پورا کرے اور انسانوں کے ظاہری و باطنی قویٰ ایک دوسرے کے تکمیل کنندہ بنیں۔ اور مجموعی طور پر، جیسا کہ سورہ ۔ تین ۔ کی آیت نمبر ۴ میں آیا ہے: (لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم) "خدا نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے"۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان آیتوں میں اور بہت سی دوسری قرآنی آیات کی طرح خدا اس بھلا دینے والے اور مغرور انسان کو اپنی معرفت کی راہ دکھاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ رحم مادر سے لے کر اپنے پیدا ہونے تک کے زمانے کا اور اس وقت سے لے کر مکمل نشو و نما کی منزل تک پہنچنے کے عہد کا بغور مطالعہ کرے اور یہ دیکھے کہ منعم حقیقی کی جانب سے ہر قدم پر ایک نئی نعمت اس کے پاس آئی ہے۔

اس طرح اس کو معلوم ہوگا کہ وہ سر سے پیر تک خالق کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس کو چاہیئے کہ غرور و غفلت کو خیرباد کہے اور پروردگار عالم کی محبت کا طوق اپنی گردن میں ڈالے۔

اس کے بعد قرآن ان کے غرور و غفلت کو موضوع گفتگو بنا کر کہتا ہے: "جیسا تم گمان کرتے ہو ایسا نہیں ہے تم روز جزا کے منکر ہو" (کلا بل تکذبون بالدین)۔ نہ تو خدا کا کرم تمہارے غرور کا سبب ہے اور نہ اس کی نعمتوں کا سلسلہ بلکہ اس کا اصلی سبب تمہارا روز قیامت پر ایمان نہ لانا ہے[1]

جی ہاں! اگر ہم مغرور اور غافل افراد کی حالت پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اصلی سبب یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے افراد کی روح کی گہرائیوں میں قیامت کے بارے میں شک یا اس کا انکار پوشیدہ ہے اور باقی امور تو صرف بہانے ہیں۔ لہذا اگر ان کے دلوں میں قیامت پر ایمان پیدا ہو جائے تو یہ غرور اور غفلت سب ختم ہو کر رہ جائے۔

دین سے مراد یہاں جزا اور روز جزا ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ یہاں مراد دین اسلام ہے بعید نظر آتا ہے اس لیے کہ ان آیتوں میں گفتگو کا جو محور ہے وہ معاد و قیامت ہے۔

اس کے بعد اسباب غرور و غفلت کو ختم کرنے اور قیامت پر ایمان کو تقویت دینے کے لیے مزید

---

[1] "کلا" حرف ردع ہے اور پہلے سے ذکر شدہ یا توہم شدہ مطلب کے انکار کے لیے ہے اور یہ کہ کلا اس آیت میں کسی چیز کی نفی کرتا ہے اس سلسلہ میں مفسرین نے کئی احتمال پیش کیے ہیں۔ سب سے پہلے وہی احتمال ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے یعنی یہاں کلا غرور و غفلت کے تمام سرچشموں کی نفی کرتا ہے سوائے قیامت کی تکذیب اور انکار کے جس کا "بل" کے بعد ذکر ہوا ہے۔ راغب نے مفردات میں (بل کے مادہ کے سلسلہ میں) ان معانی کو منتخب کیا ہے اور اوپر والی آیت بیان کرنے کے بعد کہتا ہے (کانه قیل لیس فیهنا مایقضی ان یغرهم به تعالیٰ ولکن تکذیبهم هو الذی حملهم علیٰ ما ارتکبوه) گویا کہا گیا ہے کہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جو انہیں اللہ کے مقابلہ میں مغرور کرے لیکن ان کا تکذیب کرنا وہ ہے جس نے اس کا ارتکاب کیا ہے۔

کہتا ہے: "اس میں شک نہیں کہ تم پر نگران مقرر کیے گئے ہیں" (وانّ علیکم لحافظین)[1]

ایسے نگران و نگہبان جو پروردگار کی بارگاہ میں مقرب و محترم ہیں اور وہ ہمیشہ تمہارے اعمال کو تحریر کرتے ہیں (کراماً کاتبین)۔ اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہیں اور سب کچھ اچھی طرح جانتے ہیں۔ (یعلمون ما تفعلون)۔

"حافظین" سے مراد یہاں وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کی نگرانی پر مامور ہیں، اس سے قطع نظر کہ اعمال اچھے ہوں یا بُرے۔ ان فرشتوں کو سورہ ق کی آیت ۱۸ میں رقیب و عتید سے تعبیر کیا گیا ہے (مایلفظ من قول الّا لدیہ رقیب عتید) انسان کوئی بات نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کے پاس فرشتہ ہے جو نگرانی کا فرض انجام دینے کے لیے مستعد ہے۔ اسی سورہ ق کی اس سے پہلے کی آیت میں فرماتا ہے:

(اذ یتلق المتلقیان عن الیمین و عن الشمال قعید) "یاد کر اس وقت کو جب وہ دو فرشتے جو دائیں بائیں سے تجھے پکڑے ہوئے ہیں، تیرے اعمال ثبت کرتے ہیں"۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی ان فرشتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو نگرانِ اعمال ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ خدا ہر شخص سے پہلے اور ہر شخص سے بہتر اعمالِ انسانی کا شاہد و ناظر ہے لیکن اس نے مزید تاکید کے لیے اور زیادہ احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کے لیے نگران فرشتے مقرر کیے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور نگران بھی ہیں جو انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں جن سب کا قیامت کی دادگاہ کے گواہوں کے عنوان کے ماتحت سات حصّوں میں جلد ۲۰ کے صفحہ ۲۵۴ تا ۲۵۸ پر ہم نے ذکر کیا ہے۔ (سورہ حٰم سجدہ) کی آیت ۲۰ اور ۲۱ کے ذیل میں) یہاں ان کی طرف فہرست وار اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلا گواہ خدا ہے جو فرماتا ہے: "جو عمل تم انجام دیتے ہو ہم اس کے شاہد و ناظر ہیں" (یونس۔ ۶۱)۔ "اس کے بعد انبیاء و اوصیاء ہیں" (نساء۔ ۴۱)۔ اس کے بعد "زبان، ہاتھ، پاؤں اور پیکرِ انسان کے تمام اعضاء و جوارح" (نور۔ ۲۴)۔ ایک گواہ جسم کی کھال ہے (حٰم سجدہ۔ ۲۱)۔ اور گواہ فرشتے ہیں (ق۔ ۲۱) اور زیرِ بحث آیت .... اس کے بعد وہ زمین جس پر انسان زندگی بسر کرتا ہے اور اس پر اطاعت کی جاتی ہے اور گناہ ہوتے ہیں (زلزال۔ ۴)۔ اور آخر میں وہ وقت و زمانہ جس میں اعمال انجام پاتے ہیں (سفینۃ البحار جلد ۲ مادہ یوم)۔

احتجاج طبرسی میں آیا ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا کہ انسانوں کے نیک و بد اعمال کے تحریر کرنے پر جو فرشتے مامور ہیں اس کا کیا سبب ہے جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ خدا عالم السر و ما ھو اخفی

---

[1] بعض مفسرین مثلاً روح البیان اور روح المعانی کے مؤلف نے کہا ہے کہ واؤ یہاں حالیہ ہے لیکن استینافیہ کا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

ہے یعنی ہر وہ چیز جس سے زیادہ پوشیدہ کوئی چیز نہیں ہے وہ اسے جانتا ہے تو امامؑ نے جواب میں فرمایا:

استعبدھم بذالك وجعلھم شھودًا علیٰ خلقه لیکون العباد لملازمتھم ایاھم اشد علی طاعة الله مواظبة وعن معصیته اشد انقباضًا وکم من عبد ھم بمعصیة فذکر مکانھما فارعوی وکف فیقول ربی یرانی و حفظتی علی بذالك تشھد وان الله برأفته ولطفه وکلھم بعباده یذبون عنھم مردة الشیاطین و ھوام الارض وآفات کثیرة من حیث لا یرون باذن الله الیٰ ان یجیٔ امر الله عز وجل۔

خدا نے ان فرشتوں کو اپنی عبادت کے لیے بلایا اور انہیں اپنے بندوں پر گواہ قرار دیا تاکہ بندے ان کی نگرانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ خدا کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی سے انہیں زیادہ سے زیادہ پریشانی اور دکھ ہو۔ بہت سے ایسے بندے ہیں جو گناہ کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں اور پھر اس فرشتے کو یاد کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہ سے باز رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں دیکھتا ہے اور نگران فرشتے بھی گواہی دیں گے۔ اس کے علاوہ خدا نے اپنی رحمت اور مہربانی سے انہیں بندوں پر مامور کیا ہے تاکہ حکم خدا سے سرکشی کرنے والے شیاطین کو ان سے دور رکھیں اور زمین کے جانوروں اور بہت سی آفات و بلیات کو جنہیں بندے اس وقت تک نہیں دیکھتے جب تک حکم خدا یعنی ان کی موت نہ آجائے[1]

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحریر اعمال کی ذمہ داری کے علاوہ ناگوار حادثوں، مصیبتوں اور شیاطین کے وسوسوں سے انسانوں کو محفوظ رکھنے پر بھی مامور ہیں (خدا کے فرشتوں کی مختلف ذمہ داریوں کے بارے میں ایک تفصیلی بحث جلد ۱۸ ص ۱۷۳ تا ۱۷۷ سورہ فاطر کی آیت ۱ کے ذیل میں آچکی ہے)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات ان فرشتوں کی تعریف و توصیف میں کہتی ہیں وہ کریم اور بزرگ فرشتے پروردگار کی بارگاہ میں بلند مقام کے حامل ہیں تاکہ انسان اپنے اعمال پر زیادہ توجہ دیں، اس لیے کہ انسان کے اعمال کی نگرانی کرنے والا جس قدر بلند شخصیت رکھتا ہے انسان اس کا زیادہ لحاظ کرتا ہے اور گناہ کے انجام دینے سے زیادہ شرمندہ ہوتا ہے۔ کاتبین کی تعبیر درحقیقت اس بات کی تاکید ہے کہ وہ حافظہ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ باریک بینی کے ساتھ لکھتے ہیں، اس انداز سے کہ کبھی کوئی چیز ان سے نظر انداز نہیں ہوتی اور وہ ہر چھوٹے بڑے عمل کو ضبط تحریر میں لاتے ہیں (یعلمون ما تفعلون) "جو کچھ تم انجام دیتے ہو وہ اسے جانتے ہیں"۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۲۔

یہ اس حقیقت پر ایک مزید تاکید ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے بغیر استثناء آگاہ ہیں اور ان کا لکھنا اسی آگاہی کی بنیاد پر ہے۔ یہ تمام تعبیریں انسان کے اختیار اور ارادے کی آزادی کو بیان کرتی ہیں اس لیے کہ اگر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوتا تو اعمال کے تحریر کرنے والے فرشتوں کے مقرر کرنے کا اور ان سب تنبیہوں کا کوئی صحیح مفہوم نہ ہوتا۔

اور پھر یہ سب چیزیں اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ حساب و کتاب کا ہونا اور جزا و سزا کا ملنا قطعی اور حتمی ہے، اس لیے کہ خدا نے اسے حد سے زیادہ اہمیت دی ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ اور اس پر ایمان اس مقصد کے لیے ہے کہ انسان کی تربیت کرے اور اسے اس کی ذمہ داریوں سے آشنا کرے اور غلط کاموں پر حد سے زیادہ روکنے والا اثر ڈالے۔

ایک نکتہ

ثبت اعمال کے مامورین

نہ صرف اوپر والی آیات میں بلکہ بہت سی دوسری آیاتِ قرآنی میں اور اسلامی روایات میں ان معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ خدا نے ہر انسان پر نگہبان و نگران مقرر کیے ہیں جو اس کے اعمال قطع نظر اس کے کہ وہ اچھے ہوں یا بُرے، تحریر کرتے ہیں اور اس کا اعمال نامہ روزِ جزا کے لیے تیار کرتے ہیں۔

ان فرشتوں کی خصوصیات کے بارے میں معنی خیز اور خبردار و ہشیار کرنے والی تعبیریں اسلامی روایات میں وارد ہوئی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ کسی شخص نے امام موسیٰ کاظمؑ سے سوال کیا کہ جو انسان کے اعمال تحریر کرنے پر مامور ہیں کیا وہ انسان کے ارادہ اور نیک یا بد کام کرنے کے باطنی عزم سے بھی باخبر ہوتے ہیں تو امام نے جواب میں فرمایا:

"کیا بچے کھچے اور گندے پانی کے کنویں کی بُو اور عطر کی خوشبو ایک جیسی ہوتی ہے"

راوی نے عرض کیا نہیں تو امامؑ نے فرمایا:

"کہ جب انسان کوئی اچھا کام کرنے کی نیت کرتا ہے تو اس کا سانس خوشبو دار ہو جاتا ہے تو وہ فرشتہ جو دائیں طرف ہے (اور حسنات کے ثبت کرنے پر مامور ہے) بائیں طرف والے فرشتے سے کہتا ہے، اٹھ کھڑا ہو کہ اس نے نیک کام کا ارادہ کیا ہے اور جب وہ اس کام کو انجام دے دیتا ہے تو اس انسان کی زبان اس فرشتے کا قلم بن جاتی ہے اور لعاب دہن سیاہی بن جاتا ہے لیکن جب انسان گناہ کا ارادہ کرے تو اس کا سانس بدبو دار ہو جاتا ہے۔ اس وقت بائیں طرف کا فرشتہ دائیں طرف والے فرشتے سے کہتا ہے اٹھ کھڑا ہو کہ اس نے معصیت و نافرمانی کا ارادہ کیا ہے اور جب وہ نافرمانی انجام دے دیتا ہے تو اس کی زبان اس فرشتے کا

قلم اور لعاب دہن سیاہی بن جاتا ہے اور وہ اسے لکھ دیتا ہے [۱]

یہ حدیث اچھی طرح بتاتی ہے کہ انسان کی نیت اس کے وجود پر اچھی طرح اثر انداز ہوتی ہے اور فرشتے اس کے اندرونی اسرار سے باہر کے آثار کے ذریعہ آگاہ ہو جاتے ہیں اور اگر آگاہ نہ ہوں تو انسان کے اعمال کو اچھی طرح ضبطِ تحریر میں نہیں لا سکتے اس لیے کہ نیت کی کیفیت عمل کی آلودگی اور خلوص کے سلسلہ میں حد سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے یہاں تک کہ پیغمبر اسلامؐ نے مشہور حدیث میں فرمایا ہے:

(انما الاعمال بالنیات) اعمال نیتوں سے وابستہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ فرشتے خود انسان سے لیتے ہیں اور اسی پر خرچ کرتے ہیں۔ ہماری زبان ان کا قلم اور ہمارا لعاب دہن ان کی سیاہی ہے۔

۲۔ وہ مامور ہیں کہ جب انسان نیک کام کی نیت کرے تو اسے ایک نیکی کی حیثیت سے تحریر کریں اور جس وقت اسے انجام دے دے تو دس نیکیاں لکھ دیں لیکن جب انسان گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو جب تک عمل نہ کرے کوئی چیز اس کے خلاف نہیں لکھتے اور گناہ کے ارتکاب کے بعد بھی صرف ایک ہی گناہ لکھتے ہیں [۲]

یہ تعبیر انسان پر خدا کے انتہائی لطف و کرم کو بیان کرتی ہے کہ گناہ کی نیت کو وہ بخش دیتا ہے اور فعلِ گناہ کی عدل کے مطابق سزا دیتا ہے لیکن اطاعت کے سلسلہ میں ہر نیت ایک نیکی ہے اور ہر نیک کام کی وہ اپنے تفضل کے مطابق جزا دیتا ہے نہ کہ میزانِ عدل کے مطابق اور یہ نیک اعمال کی تشویق ہے۔

۳۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ رسولِ خداؐ نے ان دونوں فرشتوں کے موجود ہونے اور دس گنی حسنات کی جزا کے لکھنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا:

جب انسان کسی بُرے کام کو انجام دیتا ہے دائیں طرف کا فرشتہ بائیں طرف کے فرشتے سے کہتا ہے اس گناہ کے لکھنے میں جلدی نہ کر شاید اس کے بعد کوئی نیک کام انجام دے جو اس کے گناہ پر پردہ ڈال دے جیسا کہ خدائے عظیم فرماتا ہے:

(ان الحسنات یذھبن السیئات) "نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں"

یا یہ کہ توبہ و استغفار کرے اور (گناہ کا اثر ختم ہو جائے) گناہ کا فرشتہ سات گھنٹے تک گناہ کے تحریر کرنے سے رکا رہتا ہے اگر اس گناہ کے بعد کوئی استغفار یا نیک کام نہ ہو تو پھر حسنات والا فرشتہ سیئات والے فرشتے سے کہتا ہے کہ اس بدبخت محروم کا گناہ لکھ دے [۳]

---

[۱] اصول کافی، جلد ۲ باب من ہم بالحسنۃ او السیئۃ حدیث ۳۔
[۲] ایضاً " " " " " " " " " " " "۔
[۳] ایضاً " " " " " " " " حدیث ۴۔

۴۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ جب مومنین کسی خصوصی مجلس میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں تو محافظینِ اعمال ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ ہم ان سے دور ہو جائیں، شاید ان کا کوئی راز ہے جسے خدا نے پوشیدہ رکھا ہے [1]

۵۔ حضرت علیؑ اپنے خطبہ میں جس میں لوگوں کو تقویٰ اور خوفِ خدا کی دعوت دیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

"اے بندگانِ خدا! جان لو کہ خود تم میں سے کچھ نگران تم پر مقرر کیے گئے ہیں، وہ تمہارے بدن کے اعضا ہیں اور یہ بھی جان لو کہ سچے حساب کرنے والے تمہارے اعمال کو لکھتے ہیں یہاں تک کہ تمہارے سانسوں کی تعداد کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ نہ شبِ تاریک کی سیاہی تمہیں ان سے پوشیدہ رکھ سکتی ہے اور نہ محکم اور بند دروازے۔ اور آج سے کل کس قدر قریب ہے" [2]

---

[1] اصول کافی مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۱۱۰۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۷۔

(۱۳) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۚ
(۱۴) وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۚ
(۱۵) یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ۝
(۱۶) وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ ؕ
(۱۷) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝
(۱۸) ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ؕ
(۱۹) یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝

ترجمہ

(۱۳) یقیناً نیک افراد نعمت فراواں میں ہیں۔
(۱۴) اور بدکار دوزخ میں ہیں۔
(۱۵) جزا کے روز اس میں وارد ہوں گے اور چلیں گے۔
(۱۶) اور کبھی بھی اس سے غائب اور دُور نہیں ہوں گے۔
(۱۷) تُو کیا جانے کہ قیامت کا دن کیا ہے؟
(۱۸) پھر تُو کیا جانے کہ قیامت کا دن کیا ہے؟
(۱۹) ایسا دن ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کے حق میں کسی کام کے انجام دینے پر قدرت نہیں رکھتا اور اس دن سب امور اللہ سے مخصوص ہیں۔

تفسیر

وہ دن جس میں کوئی شخص کسی کیلئے کوئی کام انجام نہیں دے گا

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں فرشتوں کے ذریعہ انسانوں کے اعمال کے ثبت وضبط کے سلسلہ میں آئی ہے ان آیتوں میں اس حساب وکتاب کے نتیجے اور نیکوں اور بُروں کی جو رہگذر ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگارِ عالم فرماتا ہے :

"یقیناً نیک وصالح افراد خدا کی عظیم نعمت میں ہیں" (ان الابرار لفی نعیم) ۔ "اور بدکار یقیناً جہنم میں ہیں" (وان الفجار لفی جحیم) ۔

"ابرار" "بار" اور "بَر" (بروزن حق) کی جمع ہے جس کے معنی نیکوکار شخص کے ہیں، اور "بِر" (ب کے زیر کے ساتھ) ہر قسم کی نیکی کے معنی میں ہے ۔ یہاں اچھے عقائد بھی مراد ہیں اور اچھی نیتیں اور اچھے اعمال بھی ۔

"نعیم" مفرد ہے اور نعمت کے معنی میں ہے اور یہاں بہشتِ جاودانی کے معنی میں ہے اور نکرہ کی صورت میں جو آیا ہے اس نعمت کی اہمیت، وسعت اور عظمت کے بیان کے لیے ہے ۔ خدا کے علاوہ کوئی اور اس کی وسعت وعظمت سے واقف نہیں ہے ۔

"نعیم" جو یہاں صفت مشبہ ہے یہاں اس نعمت کی بقا اور اس کے استمرار کی تاکید کے لیے ہے ۔ یہ مفہوم عام طور پر صفت مشبہ میں چھپا ہوا ہوتا ہے ۔

"فجار" فاجر کی جمع ہے ۔ اصل میں فجر کے معنی وسیع طور پر شگاف کرنے کے ہیں اور طلوعِ صبح کو اس لیے فجر کہتے ہیں کہ گویا رات کا سیاہ پردہ سپیدۂ سحری کے ہاتھوں کلّی طور پر شگافتہ ہو جاتا ہے ۔ اس بنا پر فجور کا لفظ ان لوگوں کے اعمال کے بارے میں دستیاب ہوتا ہے جو پاکدامنی اور تقویٰ کا پردہ چاک کرتے ہیں اور گناہ کے راستے میں قدم رکھتے ہیں ۔

"جحیم" "جحم" (بروزن فہم) کے مادہ سے آگ بھڑکانے کے معنی میں ہے ۔ اس وجہ سے جحیم بھڑکتی ہوئی آگ کو کہتے ہیں ۔ قرآنی تعبیر میں یہ لفظ عام طور پر دوزخ کے معنی میں آیا ہے اور یہ جو فرماتا ہے :

"نیکوکار جنت میں اور بدکار دوزخ میں ہیں ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ وہ ابھی سے جنت اور دوزخ میں وارد ہو گئے ہیں اور اس دنیا ہی میں جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب نے انہیں گھیر رکھا ہے جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیت ۵۴ میں ہم پڑھتے ہیں : (وان جھنم لمحیطة بالکافرین) ۔ "دوزخ نے کافروں کا احاطہ کر رکھا ہے ۔"

لیکن ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس قسم کی تعبیریں حتمی اور یقینی طور پر مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اس لیے کہ ادب عربی میں حتمی اور یقینی مستقبل اور متحقق الوقوع مضارع کو حال کی شکل میں اور کبھی ماضی کی شکل میں بیان کرتے ہیں۔

(آیت کے پہلے معنی ظاہر کے ساتھ سازگار ہیں لیکن مناسب دوسرے معنی ہیں)۔

بعد کی آیت میں فاجروں کی سرنوشت کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ روزِ جزا دوزخ میں داخل ہوں گے اور اس کی آگ میں جلیں گے" (یصلونھا یوم الدین)۔

جب گزشتہ آیت کے معنی ایسے ہوں کہ وہ ابھی سے دوزخ میں داخل ہیں تو پھر یہ آیت بتاتی ہے کہ روزِ قیامت اس جلانے والی آگ میں ان کا داخلہ اور شدید ہوگا اور آگ کے اثر کو وہ اچھی طرح محسوس کریں گے۔

"یصلون" "صلی" (بروزن سعی) کے مادہ سے آگ میں داخل ہونے، جلنے، بھن جانے اور اس کے درد و تکلیف کو برداشت کرنے کے معنی میں ہے اور اس بنا پر، کہ فعل مضارع ہے، استمرار پر دلالت کرتا ہے، مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے:

"وہ اس آگ سے کبھی دور اور مفقود نہیں ہیں" (وما ھم عنھا بغائبین)۔ بہت سے مفسرین نے اس جملہ کو فجار پر جو عذاب ہوگا اس کے جاوداں ہونے کی دلیل کے طور پر لیا ہے اور اس طرح نتیجہ نکالا ہے کہ فجار سے مراد ان آیات میں کفار ہیں، اس لیے کہ خلود اور ہمیشگی ان کے مورد کے علاوہ وجود نہیں رکھتی۔

اس آیت کی تعبیر زمانہ حال کی شکل میں اس چیز کی مزید تاکید ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ اس قسم کے افراد دنیا میں بھی کلی طور پر جہنم سے دور نہیں ہیں۔ ان کی زندگی بجائے خود دوزخ ہے۔ اور مشہور حدیث کے مطابق ان کی قبر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے اور اس طرح دنیا کی دوزخ اور برزخ کی دوزخ اور قیامت کی دوزخ تینوں ان کے لیے موجود ہیں۔

مندرجہ بالا آیت ضمنی طور پر اس حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے کہ دوزخیوں کے عذاب میں کسی قسم کا وقفہ نہیں ہے، یہاں تک کہ ایک لمحے کا وقفہ بھی نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس عظیم دن کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے کہتا ہے: "تو کیا جانے کہ روزِ جزا کیا ہے" (وما ادراک مایوم الدین)۔ "پھر تو کیا جانے کہ روزِ جزا کیا ہے" (ثم ما ادراک مایوم الدین)۔

جب پیغمبر اسلامؐ قیامت کے بارے اس وسیع آگاہی اور علم کے باوجود اس پر حکومت کرنے والے حوادث، اضطراب اور عظیم وحشت کو اچھی طرح نہیں جانتے تو باقی کا معاملہ واضح ہے۔

یہ گفتگو اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ قیامت کے ہولناک حوادث اس قدر وسیع و عظیم ہیں جو قالبِ

بیان میں نہیں سما سکتے اور جس طرح ہم عالمِ خاک کے اسیر جنت کی بے پایاں نعمتوں سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہیں جہنم کے عذاب اور اس کے حوادث سے کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد ایک مختصر اور پُرمعنی جملہ میں اس دن کی ایک اور خصوصیت جس میں درحقیقت تمام چیزیں چھپی ہوئی ہیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہی دن جس دن کوئی شخص کسی دوسرے کے حق میں کوئی کام انجام نہیں دے سکے گا اور اس دن تمام امور خدا سے مختص ہیں" (یوم لا تملك نفس لنفس شیئًا والامر یومئذ لله)۔

کام تو اس جہان میں بھی سب اسی کے دستِ قدرت میں ہیں اور سب لوگ اسی کے نیازمند ہیں لیکن پھر بھی یہاں کبھی کبھی بہرحال مجازی مالک و حاکم اور فرماں روا موجود ہیں جنہیں سطحی نگاہ رکھنے والے افراد مستقل مبداء قدرت خیال کرتے ہیں لیکن اس دن یہ مجازی مالکیت و حاکمیت بھی ختم ہو جائے گی اور خدا کی حاکمیتِ مطلقہ ہر زمانہ کی بہ نسبت زیادہ واضح ہو گی۔

یہ چیز قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آئی ہے (لمن الملك الیوم لله الواحد القهار) "آج کے دن حکومت کس کے لیے ہے غالب و یکتا خدا کے لیے ہے" (مومن - ۱۶)۔

اصولی طور پر اس دن ہر شخص اس قدر اپنے آپ میں گرفتار ہو گا کہ اگر بالفرض اس میں قوت ہوتی بھی تب بھی دوسروں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ (لکل امرئ منهم یومئذ شأن یغنیه)۔ اس دن ان میں سے ہر ایک اس طرح مبتلا ہو گا جو اس کے لیے کافی ہو گا۔ (عبس - ۳۷)۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے:

(ان الامر یومئذ والیوم کله لله ... اذا کان یوم القیامة بادت الحکام فلم یبق حاکم الا الله)

"اور آج اور اس دن تمام کام اللہ کے اختیار میں ہیں لیکن جب قیامت کا دن ہو گا تو تمام حاکم تباہ و برباد ہو جائیں گے اور خدا کی حکومت کے علاوہ کوئی حکومت باقی نہیں رہے گی"[1]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ تعبیر انبیاء، اولیاء اور فرشتوں کی شفاعت کے سلسلہ سے متصادم نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب ان مباحث سے جو ہم مسئلہ شفاعت کے سلسلہ میں پہلے تحریر کر چکے ہیں واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید متعدد آیات میں تصریح کر چکا ہے کہ شفاعت خدا کے اذن اور اجازت سے ہو گی اور روزِ جزا کے شفیع اس کی رضا کے بغیر کسی کی شفاعت نہیں کریں گے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۰۔

(ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ) (انبیاء۔ ۲۸)۔

خداوندا! اس ہولناک دن کے بارے میں سب کی نظریں تیری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہم ابھی سے تیری طرف نظریں لگائے ہوتے ہیں۔

پروردگارا! ہمیں اس جہان میں اور اُس جہان میں اپنے بے پایاں لطف وکرم سے محروم نہ کیجو۔

بارالٰہا! ہر حالت میں حاکمِ مطلق تُو ہے، ہمیں وادیِ شرک میں محصور ہونے سے بچا اور دوسروں کی پناہ لینے سے محفوظ رکھ۔

آمین یارب العالمین

سورۂ انفطار کا اختتام

سورۂ
مطففین

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اس میں ۳۶ آیتیں ہیں

سورۂ مطففین کے مضامین کا دائرہ کار

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا یا مدینہ میں اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ شانِ نزول بتاتی ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات جن کا موضوع کم تولنا ہے، ان لوگوں سے متعلق ہیں جو مدینہ میں اس قبیح کام میں مشغول تھے۔

لیکن دوسری آیات کا لب و لہجہ مکی سورتوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے جس میں مختصر اور پُرجلال آیات میں پروردگار عالم قیامت اور حوادثِ قیامت کی خبر دیتا ہے خصوصاً اس سورہ کی آیات جو مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے بارے میں کفار کو موضوع گفتگو بناتی ہیں۔

یہ آیتیں مکہ کے ماحول کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں مومنین اقلیت میں تھے اور کافروں کی قطعی اکثریت تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین سورہ کے ایک کو مکی اور ایک حصہ کو مدنی سمجھتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ سورۃ مکی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے بہرحال اس سورہ کے مباحث پانچ محوروں کے گرد گھومتے ہیں۔

۱۔ کم تولنے والوں کے بارے میں شدید تنبیہ و تہدید۔

۲۔ اس مفہوم کی طرف اشارہ کہ بڑے بڑے گناہوں کا سرچشمہ قیامت کے بارے میں پختہ یقین کا نہ ہونا ہے۔

۳۔ اس عظیم دن فجار کی سرنوشت کا ایک حصہ۔

۴۔ جنت میں نیکوکاروں کو ملنے والی عظیم اور روح پرور نعمتوں کا ایک حصہ۔

۵۔ کفار کا مومنین سے جاہلانہ مذاق اور اس کے برعکس قیامت کے ہونے کا بیان۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ (من قرأ سورۃ المطففین سقاہ اللہ من الرحیق المختوم یوم القیامۃ) جو شخص سورہ مطففین پڑھے خدا اسے خالص شراب سے جو کسی کو میسر نہیں ہوئی قیامت میں سیراب کرے گا۔[1]

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے: من قرأ فی فرائضہ "ویل للمطففین" اعطاہ اللہ من یوم القیامۃ من النار ولم تره ولم یرها... جو شخص اپنی فریضہ نمازوں میں سورہ مطففین پڑھے خدا قیامت میں اسے عذابِ جہنم سے محفوظ رکھے گا نہ جہنم کی آگ اسے دیکھے گی نہ وہ جہنم کی آگ کو دیکھے گا۔[2]

یہ سب ثواب فضیلت اور برکت اس شخص کے لیے ہے جو اس کے پڑھنے کو عمل کی تمہید اور مقدمہ قرار دے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۵۱۔

[2] ثواب الاعمال مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۲۷۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ
(۲) الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۖ
(۳) وَاِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ؕ
(۴) اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّہُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ
(۵) لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۙ
(۶) یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ

ترجمہ

(۱) وائے ہے کم تولنے والوں پر۔
(۲) وہ جب خود لیتے ہیں تو اپنا حق پورا لیتے ہیں۔
(۳) لیکن جب چاہتے ہیں کہ دوسروں کے لیے تولیں تو کم تولتے ہیں۔
(۴) کیا وہ باور نہیں کرتے کہ وہ اٹھائے جائیں گے۔
(۵) عظیم دن
(۶) جس روز لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔

شانِ نزول

ابن عباس کہتے ہیں جس وقت پیغمبر اکرمؐ مدینہ میں داخل ہوئے تو بہت سے لوگ کم تولنے کے مرض میں مبتلا تھے تو خدا نے ان آیتوں کو نازل کیا اور انہوں نے قبول کیا اور کم تولنا ختم کر دیا۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے اہلِ مدینہ تاجر تھے اور وہ کم تولنے کے عادی تھے اور وہ بہت سے حرام کام کرتے تھے، تو ایسی صورت میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیتیں اہلِ مدینہ کو سنائیں۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

(خمس بخمس) - پانچ چیزیں پانچ چیزوں کے مقابلہ میں ہیں۔ انہوں نے عرض کیا "اے خدا کے رسول! کونسی پانچ چیزیں پانچ چیزوں کے مقابلہ میں ہیں" تو آپؐ نے فرمایا:

(ما نقض قوم العهد الا سلط الله عليهم عدوهم وما حكموا بغير ما انزل الله الا فشا فيهم الفقر وما ظهرت فيهم الفاحشة الا فشا فيهم الموت ولا طففوا الكيل الا منعوا النبات واخذوا بالسنين ولا منعوا الزكاة الا حبس عنهم المطر)

کسی قوم نے عہد شکنی نہیں کی مگر یہ کہ خدا نے اس کے دشمنوں کو اس پر مسلط کر دیا اور کسی جمعیت نے حکمِ خدا کے خلاف حکم نہیں دیا مگر یہ کہ ان میں فقر و فاقہ زیادہ ہو گیا۔ کسی ملت کے درمیان فحاشی اور برائیاں ظاہر نہیں ہوئیں مگر یہ کہ موت کا وقوع ان میں زیادہ ہو گیا۔ کسی قوم نے کم نہیں تولا مگر یہ کہ ان کی زراعت ختم ہو گئی اور قحط سالی نے انہیں گھیر لیا اور کسی قوم نے زکوٰۃ نہیں روکی مگر یہ کہ بارش سے محروم ہو گئے۔[1]

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ان آیتوں کی شانِ نزول کے سلسلہ میں نقل کیا ہے کہ مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام ابوجہنہ تھا جس کے پاس دو چھوٹے بڑے پیمانے تھے۔ خریدتے وقت بڑا پیمانہ استعمال کر کے فائدہ اٹھاتا اور بیچتے وقت چھوٹے پیمانے سے دیتا۔ (تو یہ سورہ نازل ہوا اور اسے خبردار کیا)۔[2]

تفسیر

کم تولنے والوں پر وائے ہے

ان آیات میں ہر چیز سے پہلے کم تولنے والوں کو شدید عذاب کا مستحق ٹھہرا کر فرماتا ہے: "وائے ہے کم تولنے والوں پر" (ویل للمطففین)۔ یہ حقیقت میں خدا کی جانب سے ان ظالم، ستمگر اور گندے لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو بزدلوں کی طرح لوگوں کا حق پامال کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱ ص ۸۸۔

[2] مضمون کو ابوالفتوح اور مراغی نے اپنی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ (۲) مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۲۔

"مطففین"، "تطفیف"، کے مادّہ سے اصل میں "طف" سے لیا گیا ہے جو کسی چیز کے کناروں کے معنی میں ہے اور یہ جو سرزمین کربلا کو وادیِ طف کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرات کے کنارے پر واقع ہے۔

اس کے بعد ہر کم چیز پر طفیف کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ پیمانہ جو لبریز نہ ہو، وہاں بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لفظ کم تولنے کے لیے استعمال ہوا ہے خواہ وہ کسی شکل وصورت کا ہو۔

"ویل"، یہاں شر، غم واندوہ، ہلاکت یا دردناک عذاب یا جہنم کی سخت جلانے والی وادی کے معنوں میں ہے۔ عام طور پر یہ لفظ نفرین کرنے اور کسی چیز کی قباحت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یا یہ کہ ایک مختصر سی تعبیر ہے جو بہت سے مفاہیم کو چاہتی ہے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا نے لفظ ویل قرآن میں کسی شخص کے لیے استعمال نہیں کیا مگر یہ کہ اس کو کافر کہا ہے (فویل للذین کفروا من مشھد یوم عظیم) "وائے ہے کافروں پر عظیم دن کے مشاہدہ سے"[1] (مریم۔ ۳۷)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم تولنے سے کفر کی بُو آتی ہے۔ اس کے بعد مطففین یعنی کم تولنے والوں کے کام کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے لیے تولتے ہیں تو اپنا حق مکمل طور پر وصول کرتے ہیں" (الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون)[2]

لیکن جب وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کے لیے تولیں تو کم تولتے ہیں (واذا کالوھم اووزنوھم یخسرون)۔

مفسرین کی ایک جماعت نے مندرجہ بالا آیات سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ مطفف سے مراد وہ شخص ہے جو خریدتے وقت اپنا حق زیادہ لیتا ہے اور بیچتے وقت مقابل کو اس کے حق سے کم دیتا ہے۔ اسی لیے خدا نے دونوں پہلوؤں کے پیشِ نظر ان پر ویل رکھی ہے۔

لیکن یہ ایک اشتباہ ہے اور غلط ہے کیونکہ "یستوفون" کا مفہوم یہ ہے کہ اپنا حق مکمل طور پر وصول کرتے ہیں اور ایسا پہلو جس میں اپنے حق سے زیادہ لینے کی بات ہو اس عبارت میں موجود نہیں ہے اور یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا نے ان کی مذمت کی ہے ان دونوں حالتوں کے ایک دوسرے سے تقابل

---

[1] اصول کافی مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۷۔

[2] یہاں علی الناس کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ لوگوں پر وہ کوئی حق رکھتے ہیں اور تقدیر اذا کالوا ما علی الناس بھم، اور اصولاً کال علیہ وہاں کہا جاتا ہے جہاں کیل کا مقصد حق لینا ہوتا ہے باقی رہا کالہ اور کال لہ اس جگہ سے مربوط ہے جہاں کیل سے مراد دوسرے کا حق دینا ہے۔ (غور کیجئے)۔

کی شکل میں ہے کہ خرید تے وقت پورا پورا حق لیتے ہیں اور بیچتے وقت کمی کرتے ہیں۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم کسی کی مذمت میں کہتے ہیں۔" جب کسی سے اس کو کوئی چیز لینی ہوتی ہے تو وعدہ کے مطابق (جو وقت مقرر ہو عین اسی وقت) لیتا ہے لیکن کسی کو کچھ دینا ہو تو مہینوں تاخیر کرتا ہے" حالانکہ اپنی طلب کا وعدہ کے مطابق لینا کوئی بُری بات نہیں ہے لیکن ان دونوں کے تقابل کا جائزہ لینے کے نتیجے میں بُری بات ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حق لینے کے معاملہ میں گفتگو کیل کے بارے میں ہے لیکن دینے کے معاملہ میں گفتگو کیل و وزن دونوں کے حوالے سے ہے۔ تعبیر کا یہ فرق، ہو سکتا ہے کہ، ذیل کی دو وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر ہو:

پہلی وجہ یہ کہ خریدار عام طور پر پہلے زمانے میں کیل سے استفادہ کرتے تھے اس لیے کہ بڑی ترازو جو زیادہ وزن تول سکے اس زمانے میں موجود نہیں تھی لیکن بڑے پیمانے آسانی سے مل سکتے تھے ("کر" کے بارے میں بھی علماء نے کہا ہے کہ یہ لفظ اصل میں ایک بڑے پیمانے کا نام ہے) بیچتے وقت وہ تھوک کا کاروبار کیل سے کرتے تھے اور وزن کے ذریعہ خوردہ فروشی کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ حق لینے کے وقت پیمانے سے استفادہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس میں دھوکے کا امکان بہت کم ہے لیکن کم تولنے کے لیے وزن کا ذریعہ زیادہ مفید ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں دھوکہ دینے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات اگرچہ صرف کیل و وزن کے حوالے سے کم تولنے کی بات کرتی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور اس کا اطلاق کم تولنے کے سلسلہ میں ان چیزوں پر بھی ہے جن کا لین دین گن کر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ آیت اپنے مفہوم کی گہرائی کے اعتبار سے موعودہ خدمت میں کمی کرنے کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے۔

مثال کے طور پر کوئی کاریگر یا مزدور اپنا کام صحیح طور پر مکمل نہیں کرتا تو وہ بھی مطففین کا مصداق ہے یعنی کم تولنے والوں کی صف میں ہے جن کی یہ آیتیں سختی سے مذمت کر رہی ہیں۔

بعض مفسرین اس آیت کو اور زیادہ وسیع معانی کا حامل سمجھتے ہیں اور حدودِ خداوندی سے ہر قسم کا تجاوز اور اجتماعی و اخلاقی روابط میں کمی کو بھی اس کے مفہوم میں شامل سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس آیت کے الفاظ سے ان معانی کا استفادہ واضح نہیں ہے لیکن غیر مناسب بھی نہیں ہے۔

اس لیے مشہور صحابیٔ رسول عبداللہ بن مسعود سے منقول ہے کہ نماز میں ایک معقول پیمانہ ہے جو شخص اس کا کیل مکمل طور پر ادا کرے تو خدا اس کو اس کا اجر مکمل دے گا اور جو شخص اس میں کمی کرے تو اس کے بارے میں وہی کچھ جاری ہوگا جو خدا نے مطففین یعنی کم تولنے والوں کے

بارے میں فرمایا ہے [1]

اس کے بعد پروردگارِ عالم ایسے لوگوں کو تنبیہ یعنی استفہام توبیخی کے ذریعے متنبہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"کیا وہ باور نہیں کرتے کہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے" (الا یظن اولئک انھم مبعوثون)۔

"عظیم دن" (لیوم عظیم)۔ وہ دن جس کا حساب عذاب اور اس کی ہولناکی اور سب عظیم ہیں۔ "وہ دن جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے اور رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے" (یوم یقوم الناس لرب العالمین)۔

یعنی وہ اگر قیامت کو باور کرتے اور جانتے کہ حساب کتاب ہونا ہے اور تمام اعمال ایک عظیم عدالت میں محاکمہ کے لیے پیش ہوں گے اور جس شخص نے سوئی کی نوک کے برابر بھی اچھا یا بُرا کام کیا ہے اس کا نتیجہ وہ اس عظیم دن دیکھے گا، پھر وہ کبھی اس قسم کا ظلم وستم نہ کرتے اور لوگوں کے حقوق پامال نہ کرتے۔

بہت سے مفسرین "لظن" کو جو ظن کے مادہ سے ہے، یہاں یقین کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ اس تعبیر کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۹ (قال الذین یظنون انھم ملاقوا اللہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ) جو مانتے تھے کہ خدا سے ملاقات کریں گے (اور وہ قیامت کے دن پر ایمان رکھتے تھے) " انہوں نے کہا کہ کئی چھوٹے گروہ تھے جو حکمِ خدا سے بڑے گروہ کے مقابلے میں کامیاب ہوئے" (توجہ رکھیں کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے ایک گروہ کے بارے میں ہے جس نے ایمان واستقامت کا مختلف مراحل میں مظاہرہ کیا تھا)۔

اس بات کی شاہد وناطق وہ حدیث ہے جو امیرالمومنین حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپ نے آیہ (الا یظن اولئک انھم مبعوثون لیوم عظیم) کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ (الیس یوقنون انھم مبعوثون)؟ کیا انہیں یقین نہیں ہے کہ وہ قبروں سے اٹھیں گے؟ [2]

انہی حضرت سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ ظن کی دو قسمیں ہیں، ظنِ تردید اور ظنِ یقین۔ جو قرآن میں معاد وقیامت کے بارے میں آیا ہے وہ ظنِ یقین ہے اور جو کچھ دنیا کے بارے میں آیا ہے وہ ظنِ شک ہے [3]

ایک جماعت کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ ظن سے یہاں مراد موجودہ دور کے مشہور

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۲۔

[2] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۸۔

[3] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۸۔

معانی گمان ہیں جو اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کی جان اور روح میں قیامت کی طرف توجہ کرنا اس طرح اثر کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کا گمان بھی کرتا ہو اور اس کو اس دن کا احتمال بھی ہو تو وہ برے کاموں سے اجتناب کرے، چہ جائیکہ اس کا یقین رکھتا ہو۔ یہ وہی چیز ہے جو علماء کے درمیان دفع ضرر مظنون یا دفع ضرر محتمل کے عنوان سے مشہور ہے۔

اب اس بات کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ بے پرواہ اور بے باک گنہگار نہ صرف یہ کہ قیامت کا یقین نہیں رکھتے بلکہ اس کا گمان بھی نہیں رکھتے لیکن پہلی تفسیر، اُن وجوہ کی بنا پر، جو بیان کی گئی ہیں مقدم ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ لفظ ظن راغب کے مفردات کی رو سے اصل میں اس حالت کا نام ہے جو چند قرائن کے ہونے کی وجہ سے فکرِ انسانی کو حاصل ہوتی ہے اگر نشانیاں قوی ہوں تو علم و یقین لے آتی ہے اور اگر نشانیاں کمزور ہوں تو پھر وہ گمان کی حد سے آگے نہیں بڑھتی [1]

اس بنا پر مذکورہ لفظ، اس کے برخلاف جو ہمارے زمانہ میں مشہور ہے، وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں علم اور گمان دونوں شامل ہیں اور دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایک نکتہ

کم تولنا فساد فی الارض کا ایک سبب ہے

قرآن مجید کی آیات میں کئی مرتبہ کم تولنے کی مذمت کی گئی ہے۔ کبھی حضرت شعیبؑ کے واقعہ میں جہاں وہ قوم کو خطاب کرکے کہتے ہیں (اوفوا الکیل ولا تکونوا من المخسرین وزنوا بالقسطاس المستقیم ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین) "پیمانے کے حق کو ادا کرو اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچاؤ وزن صحیح ترازو میں کرو اور لوگوں کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو" (شعراء۔ ۱۸۱ تا ۱۸۳)۔

اس طرح وزن کرتے وقت اور چیز کو پیمانے سے ناپتے وقت تولنے کو اور انصاف کو نظر انداز کرنے کو فساد فی الارض بتایا گیا ہے اور یہ کام اجتماعی مفاسد میں سے ایک ہے۔

سورہ رحمٰن کی آیت ۷، ۸ میں وزن کرتے وقت انصاف سے کام لینے کو عالمِ ہستی کے نظام تخلیق میں جو عدالت کارفرما ہے، اس کے برابر قرار دیا گیا ہے فرماتا ہے:

(والسماء رفعھا ووضع المیزان الا تطغوا فی المیزان) "خدا نے آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز میں میزان و حساب رکھا تاکہ تم وزن و حساب میں طغیان و سرکشی سے کام نہ لو"

---

[1] مفردات، مادہ ظن۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ناپ تول میں عدل کی رعایت کا مسئلہ کم اہم نہیں ہے بلکہ حقیقت میں اصل عدالت ہے اور سارے نظامِ ہستی پر حاکم نظم کلی کا ایک جز ہے۔

اسی بنا پر عظیم آئمہ اسلام نے اس مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے یہاں تک کہ اصبغ بن نباتہ کی مشہور روایت میں آیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؑ سے سنا کہ آپ منبر پر فرما رہے تھے:

(یامعشر التجار! الفقه ثم المتجر) "اے گروہ تجار پہلے فقہ کی تعلیم حاصل کرو اس کے بعد تجارت کرو" اس بات کی امام نے تین بار تکرار کی اور اس کلام کے آخر میں فرمایا:

(التاجر فاجر والفاجر فی النار الّا من اخذ الحق واعطی الحق) "تجارت کرنے والا فاجر ہے اور فاجر دوزخی ہے، سوائے اس کے جو صرف اپنا حق لوگوں سے لے اور لوگوں کا حق ادا کرے"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ جس وقت امیرالمومنین علیؑ کوفہ میں تھے تو آپ ہر روز صبح کے وقت کوفے کے بازاروں میں آتے اور ایک ایک بازار میں گشت کرتے اور تازیانہ آپ کے کاندھے پر ہوتا ہر بازار کے وسط میں کھڑے ہو جاتے اور بلند آواز سے کہتے اے گروہ تجار! خدا سے ڈرو۔

جس وقت حضرت علیؑ کی پکار کو سنتے تو جو کچھ تاجروں کے ہاتھ میں ہوتا رکھ دیتے اور پورے خلوص کے ساتھ آپ کی باتوں کو سنتے۔ اس کے بعد آپ فرماتے:

(قدموا الاستخارة وتبرکوا بالسهولة واقتربوا من البتاعین وتزینوا بالحلم وتناهوا عن الیمین وجانبوا الکذب وتجافوا عن الظلم وانصفوا المظلومین ولا تقربوا الربا وفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاءهم ولا تعثوا فی الارض مفسدین)

"خدا سے خیر طلب کرو اور لوگوں کے ساتھ معاملہ آسان کر کے برکت چاہو اور خریداروں کے پاس جاؤ، حلم و بردباری کو اپنی زینت قرار دو، قسم کھانے سے پرہیز کرو، جھوٹ بولنے سے اجتناب کرو، ظلم سے بچو اور مظلوموں کا حق ظالموں سے لے کر دو، سود کے قریب نہ جاؤ، پیمانے اور وزن کے معاملہ میں پورے پورے انصاف سے کام لو، لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں باعث فساد نہ بنو"۔

اس طرح آپ کوفہ کے بازاروں میں گردش کرتے، اس کے بعد دارالامارۃ کی طرف پلٹ آتے اور لوگوں کی دادخواہی اور ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھ جاتے۔[2]

اور جیسا کہ ان آیات کی شانِ نزول میں بھی آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: "جو گروہ کم تولے گا خدا

---

[1] کافی جلد ۵ باب آداب التجارة حدیث ۱۔

[2] کافی باب آداب التجارة حدیث ۳ (تھوڑے سے اختصار کے ساتھ)۔

اس کی زراعت اس سے چھین لے گا اور اسے قحط سالی میں مبتلا کر دے گا۔ جو کچھ اوپر کہا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گزشتہ اقوام کی بربادی اور ان پر عذاب نازل ہونے کے عوامل میں سے ایک عامل یہ ہے کہ وہ کم تولتے تھے۔ ان کا یہ اقدام ان کی اقتصادی بدحالی اور نزولِ عذابِ خدا کا سبب بنا۔

یہاں تک اسلامی روایات میں آدابِ تجارت کے سلسلہ میں آیا ہے کہ مومنین کے لیے بہتر ہے کہ پیمانہ بھرتے اور وزن کرتے وقت کچھ زیادہ دیں اور لیتے وقت اپنا حق کچھ کم لیں (ان لوگوں کے کام کے بالکل برعکس جن کی طرف مندرجہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے کہ وہ اپنا حق تو پورا پورا وصول کرتے تھے لیکن دوسروں کا حق کم دیتے تھے) [1]

دوسرے، جیسا کہ ہم نے اوپر والی آیت کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے، کم تولنے کا مسئلہ بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق وسیع معانی کا حامل ہے، جو ہر قسم کی اجتماعی و انفرادی اور خدا سے تعلق رکھنے والی ذمہ داریوں کے انجام دینے کے سلسلہ میں کمی ہو سکتی ہے اس کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔



---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ابواب التجارہ باب ۷، ص ۲۹۰ سے رجوع فرمائیے۔

۷ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝

۸ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝

۹ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝

۱۰ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

ترجمہ

۷ اس طرح نہیں ہے (جیسا وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں)
یقیناً فاجروں کا نامہ اعمال سجّین میں ہے۔

۸ تُو کیا جانے کہ سجّین کیا ہے؟

۹ رقم زدہ نامہ اور سرنوشت ہے۔

۱۰ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں پر۔

تفسیر

تُو کیا جانے کہ سِجّین کیا ہے؟

اس بحث کے بعد، جو گزشتہ آیات میں کم تولنے والوں کے بارے میں اور قیامت کے دن کے بارے میں گناہ اور ایمان راسخ نہ ہونے کے رابطہ کے سلسلہ میں آئی تھی، ان آیتوں میں اس روز بدکاروں اور فاجروں کا جو حال ہوگا، اس کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتا ہے پہلے فرماتا ہے:

"اس طرح نہیں ہے جیسا وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ حساب وکتاب نہیں ہوگا بلکہ فاجروں کا نامہ اعمال سجّین میں ہے" (کلّا انّ کتاب الفجار لفی سجین)۔ "تو کیا جانے سجین کیا ہے" (وما ادراك ما سجین) "ایک مُہر زدہ تحریر اور نامہ ہے" (کتاب مرقوم)۔

ان آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں دو عمدہ نظریئے ہیں:

۱۔ کتاب سے مراد انسان کا وہی نامہ اعمال ہے۔ کوئی چھوٹا یا بڑا ایسا کام نہیں ہے جس کا اس میں شمار

نہ کیا گیا ہو۔ تمام باتیں بے کم و کاست اس میں درج ہیں۔

اور سجّین سے مراد ایک جامع کتاب ہے جس میں تمام انسانوں کے نامہ ہائے اعمال جمع کیے گئے ہیں۔ سادہ اور عام تعبیر میں وہ ایک ایسے مکمل رجسٹر کے مانند ہے جس میں ہر ایک قرض خواہ اور مقروض کا حساب علیٰحدہ اور مستقل صفحہ پر تحریر ہے۔

البتہ ان آیات اور بعد کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام بدکاروں کے اعمال سجّین نامی کتاب میں ہیں اور تمام نیک افراد کے اعمال ایک دوسری کتاب میں درج ہیں جس کا نام علیین ہے۔

"سجّین" سجن کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی زندان کے ہیں۔ اس کے مختلف معانی ہیں۔ سخت و شدید زندان، محکم موجود، قعرِ جہنم میں ایک بہت ہی ہولناک وادی، وہ جگہ جہاں بدکاروں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں، اور جہنم کی آگ [1]

طریحی مجمع البحرین میں سجن کے مادہ کے بارے میں کہتا ہے: (وفی التفسیر ھو کتاب جامع دیوان الشر دوّن اللہ فیہ اعمال الکفرۃ والفسقۃ من الجن والانس) تفسیر میں آیا ہے کہ سجّین ایک کتاب ہے جو برائیوں کے دیوان کا جامع ہے جس میں خدا نے جن و انس میں سے کافروں اور فاسقوں کے اعمال کو مدون کیا ہے۔ طریحی نے واضح نہیں کیا کہ اس تفسیر سے مراد کونسی تفسیر ہے، آیا وہ معصوم سے منقول ہے یا کسی غیر سے۔

جو قرائن ان معانی کی تائید کرتے ہیں وہ درج ذیل سے عبارت ہیں

۱۔ قرآن مجید میں اس قسم کے مواقع پر کتاب کی تعبیر عام طور پر نامۂ اعمال کے معنوں میں ہے۔

۲۔ آخری آیت جو سجّین کی تفسیر کی شکل میں بیان ہوئی ہے کہتی ہے: "وہ کتاب ہے مُہر زدہ اور یہ جو بعض نے آیت کو سجّین کی تفسیر کے طور پر قبول نہیں کیا یقیناً ظاہر کے برخلاف ہے۔

۳۔ بعض نے کہا ہے سجّین و سجیل کے ایک ہی معنی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ سجّل (سین اور جیم کے زیر اور لام پر تشدید کے ساتھ) بہت بڑی کتاب کے معنی میں ہے [2]

۴۔ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال چند کتابوں میں منضبط ہوتے ہیں، تاکہ حساب کے وقت کسی قسم کا عذر یا بہانہ کسی شخص کے لیے باقی نہ رہے۔

ایک تو شخصی اعمال نامہ ہیں جو قیامت میں متعلقہ افراد کے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے۔ نیکو کاروں کو

---

[1] لسان العرب، مادہ سجن۔

[2] روح المعانی جلد ۳۰ ص ۷۰ اور مجمع البحرین مادہ سجّل۔

دائیں ہاتھ میں اور بدکاروں کو ان کے بائیں ہاتھ میں۔ آیاتِ قرآنی میں اس کی طرف بہت اشارہ ہوا ہے۔

دوسری کتاب وہ ہے جسے امتوں کے نامہ اعمال کا نام دیا جا سکتا ہے جس کی طرف سورہ جاثیہ کی آیت ۲۸ میں اشارہ ہوا ہے۔ (کل امۃ تدعی الی کتابھا) "قیامت کے دن ہر امت کو اس کے نامۂ اعمال کی طرف پکارا جائے گا۔

تیسرا نامہ اعمال عمومی ہے وہ تمام نیکوکاروں اور بدکاروں کا نامہ اعمال ہے جس کا زیر بحث آیات اور آنے والی آیات میں سجین اور علیین کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس تفسیر کے مطابق سجین وہی دیوانِ کل ہے جس میں تمام بدکاروں کے نامہ اعمال جمع ہوں گے۔ اس کو سجین اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دیوان کے مشتملات ان کے جہنم میں زندانی اور مقید ہونے کا سبب ہوں گے نیکوکاروں کی کتاب کے برعکس جو اعلیٰ علیین بہشت میں ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ سجین اسی مشہور و معروف معنی یعنی دوزخ کے لیے استعمال ہوا ہے جو تمام بدکاروں کے لیے بہت بڑا زندان ہے یا دوزخ میں ایک سخت جگہ ہے۔

اور کتاب فجار سے مراد وہی سرنوشت ہے جو ان کے لیے تحریر ہوئی ہے اس بنا پر اس آیت کے یہ معنی ہوں گے "مقرر و مسلم سرنوشت بدکاروں کی جہنم میں ہے"

اور لفظ کتاب کے استعمال قرآن میں اسی معنی میں بہت مقامات پر ہیں، مثلاً سورہ نساء کی آیت ۲۴، بعد اس کے کہ فرماتا ہے:

"شوہر دار عورتیں تم پر حرام ہیں" مزید کہتا ہے:

(کتاب اللہ علیکم) یہ حکم (اور اس سے پہلے کے احکام) ایسے ہیں جو خدا نے تمہارے لیے مقرر کر دیئے ہیں"

اور سورہ انفال کی آیت ۷۵، میں ہم پڑھتے ہیں:

(واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ) "رشتہ دار ایک دوسرے کی بہ نسبت ان احکام میں جو خدا نے مقرر کیے ہیں، (دوسروں سے) زیادہ سزاوار اور حقدار ہیں"

وہ مطلب جو اس تفسیر کی تائید کرتا ہے، یہ ہے کہ سجین اپنے اسی مشہور معنی میں ہیں جو اخبار و آثارِ اسلامی میں بیان ہوا ہے یعنی اس کی تفسیر جہنم کی گئی ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ "ان کتاب الفجار لفی سجین" کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ان کے لیے عذاب مقرر کیا گیا ہے وہ سجین (دوزخ) میں ہے۔

ایک حدیث امام محمد باقرؑ سے بھی منقول ہے کہ (السجین الارض السابعۃ وعلیون السماء

السابعة) سجّین ساتویں زمین اور علیین ساتواں آسمان ہے (سب سے نچلی اور سب سے اوپر والی جگہ کی طرف اشارہ ہے)[1]

متعدد روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعمال جو قربِ خدا کے لائق نہیں ہیں ساقط ہو جائیں گے اور سجّین میں قرار پائیں گے جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے:

ان الملک لیصعد بعمل العبد مبتهجًا فاذا صعد بحسناته یقول الله عزوجل اجعلوها فی سجین انه لیس ایای اراد فیها۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ بندہ کے عمل کو خوشی خوشی آسمان کی طرف لے جاتا ہے تو خداوند عزوجلّ فرماتا ہے اسے سجّین میں قرار دو، اس لیے کہ اس کا مقصد میری رضا نہیں تھا[2]

ان تمام روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سجّین جہنم میں ایک بہت ہی پست جگہ ہے جس میں بدکاروں کے اعمال یا نامۂ اعمال رکھے جائیں گے۔

یا ان کی سرنوشت یہ ہے کہ وہ اس زندان میں گرفتار رہیں گے۔ اس تفسیر کے مطابق (کتاب مرقوم) کا جملہ تاکید ہے "ان کتاب الفجار لفی سجین" کے جملے کی (نہ یہ کہ سجّین کی تفسیر ہے) یعنی یہ ان کے لیے لکھی ہوئی حتمی اور قطعی سزا ہے۔

"مرقوم" رقم (بروزن زخم) واضح خط (تحریر) کے معنی میں ہے اور چونکہ خطوط یا تحریریں ابہام سے خالی ہوتی ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ یہ تعبیر ابہام سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہو، وہ چیز جو نہ کبھی محو ہوتی ہے نہ فراموش ہوگی۔

یہ دونوں تفسیریں بھی صحیح ہو سکتی ہیں اس لیے کہ پہلی تفسیر میں سجّین بدکاروں کے کل اعمال کے دیوان کے معنی میں ہے اور دوسری تفسیر میں دوزخ کی گہرائی اور گڑھے کے معنوں میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔

یعنی جس وقت انسان کا نامۂ اعمال بدکاروں کے کل اعمال کا دیوان قرار دیا گیا تو یہی سبب بنے گا کہ اسے پست ترین مقام یعنی دوزخ کے گڑھے میں کھینچ کر لے جائیں۔

آخری اور زیرِ بحث آیت میں ایک دل ہلا دینے والے جملے سے منکرینِ معاد و قیامت کی منحوس عاقبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۰ حدیث ۱۵۔

[2] ایضاً " " " " حدیث ۱۹۔

"وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں پر" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

وہ تکذیب جو انواع واقسام کے گناہوں کا سرچشمہ ہے جن میں سے ایک کم تولنا ہے۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے:

(ویل للمطففین) اور یہاں فرماتا ہے: (ویل یومئذ للمکذبین)، وہ تعبیر جو مختصر ہونے کے باوجود انواع واقسام کے دردناک عذابوں اور ہولناک مصائب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

قابلِ توجہ یہ کہ پہلی آیت میں گفتگو کم تولنے والوں کے بارے میں ہے اس کے بعد بدکاروں کی بات ہے، اور آخری آیت میں منکرین قیامت کا ذکر ہے اور اچھی طرح بتاتا ہے کہ اس اعتقاد اور ان اعمال کے درمیان قریبی رابطہ ہے جو آنے والی آیات میں زیادہ واضح طور پر منعکس ہوا ہے۔

(۱۱) الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ
(۱۲) وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۙ
(۱۳) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۙ
(۱۴) كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝
(۱۵) كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۙ
(۱۶) ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۙ
(۱۷) ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۙ

ترجمہ

(۱۱) وہی جو قیامت کے دن کا انکار کرتے ہیں۔
(۱۲) صرف وہی لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جو گنہگار اور تجاوز کرنے والے ہیں۔
(۱۳) وہی شخص کہ جب اسے ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ گزشتہ لوگوں کے افسانے ہیں۔
(۱۴) اس طرح نہیں جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال ان کے دلوں پر زنگ کی طرح ہیں۔
(۱۵) ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتے ہیں بلکہ وہ اس دن اپنے پروردگار سے محجوب ہوں گے۔

(۱۶) جہنم میں وارد ہوں گے۔

(۱۷) پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی چیز ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔

تفسیر

گناہ دِلوں کا زنگ ہیں

گزشتہ آیات کی آخری آیت میں مکذبین اور جھٹلانے والوں کی منحوس سرنوشت کی طرف واضح اشارہ تھا۔ زیرِ بحث آیات پہلے ان افراد کا تعارف کراتی ہیں اور کہتی ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو روزِ جزا کا انکار کرتے ہیں (الذین یکذبون بیوم الدین)۔ اور اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"صرف وہ لوگ روزِ جزا کی تکذیب کرتے ہیں جو متجاوز اور گنہگار ہیں" (وما یکذب بہ الا کل معتد اثیم)۔ یعنی انکارِ قیامت کا اصلی سبب منطق، استدلال اور تفکر نہیں ہے، بلکہ جو افراد چاہتے ہیں کہ زیادتیاں کرتے رہیں اور گناہ کرتے رہیں وہ قیامت کا انکار کر دیتے ہیں۔ (توجہ فرمائیں کہ اثیم صفت مشبہ ہے جو استمرار اور گناہ کو جاری رکھنے پر دلالت کرتی ہے)۔

وہ چاہتے ہیں کہ کسی قسم کے احساسِ ذمہ داری کے بغیر اپنے گمان کے مطابق انتہائی آزادی کے ساتھ اور ہر قسم کے دباؤ اور ذہنی پریشانی کے بغیر اپنی برائیوں اور قباحتوں کو جاری رکھیں اور کسی قانون کو قانون نہ سمجھیں۔

یہ چیز اس چیز کے مانند ہے جو سورہ قیامت کی آیت ۵ میں آئی ہے (بل یرید الانسان لیفجر امامہ) "بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اپنی آئندہ عمر میں مسلسل فسق و فجور کی راہ اختیار کیے رہے"، اس لیے وہ قیامت کی تکذیب کرتا ہے۔

جس طرح عقیدہ عمل پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح غلیظ اعمال عقائد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ معانی بعد والی آیات کی تفسیر میں زیادہ واضح ہوں گے۔

بعد والی آیات میں قیامت کا انکار کرنے والوں کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"جب ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں: "یہ گزشتہ لوگوں کے بے بنیاد مطالب اور افسانے ہیں"۔ (اذا تتلیٰ علیہ اٰیاتنا قال اساطیر الاولین)۔

یہ لوگ علاوہ اس کے کہ تجاوز کرنے والے (معتد) اور گناہ گار ہیں، آیاتِ الٰہی کا مذاق اُڑاتے ہیں، انہیں کہانیاں اور موہوم قصے بتاتے ہیں، ایسے قصے جو انسان کے نادانی کے

زمانے کی یادگار ہیں [1]

اور اس بہانے سے چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ان آیات کی سماعت سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس سے بچالیں۔ نہ صرف اس سورہ میں بلکہ قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ جسارت کرنے والے مجرم دعوتِ خداوندی سے منحرف ہونے کا یہی بہانہ کرتے تھے۔

قرآن مجید کی نو آیتوں میں یہی مضمون واضح کیا گیا ہے کہ مشرکین قرآنِ مجید کی آیتوں کے مقابلہ میں اسی بہانہ سے کام لیتے تھے (وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملیٰ علیہ بکرۃ واصیلاً) "انہوں نے کہا یہ قرآن گزشتہ لوگوں کے افسانوں اور قصے کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے اس نے لکھا ہے اور صبح و شام اسے لکھایا جاتا ہے۔" (فرقان - ۵)۔

سورہ احقاف کی آیت ۱۷ میں ایک سرکش جوان کی زبانی جو اپنے مہربان اور مومن ماں باپ کے مقابلہ پر کھڑا ہو جاتا ہے ہم اس طرح سنتے ہیں کہ اپنے ماں باپ کی تمام نصیحتوں کا یہ کہہ کر مذاق اڑاتا ہے کہ (ما ھٰذا الّا اساطیر الاولین) یہ باتیں جو تم کرتے ہو گزشتہ لوگوں کی بے بنیاد باتوں اور افسانوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیرِ بحث آیت نضر بن حارث بن کلدہ، پیغمبر اسلامؐ کی خالہ کے بیٹے کے بارے میں جو کفر و ضلالت کے سرغنوں میں سے تھا، نازل ہوئی ہے۔

لیکن واضح رہے کہ آیت کا نزول کسی خاص مورد میں اس سے مانع نہیں ہے کہ دوسروں کے بارے میں صادق آئے، بہرحال سرکش لوگ وجدان کی تنبیہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اور حق پسند لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کے لیے ہمیشہ فضول قسم کے بہانے بناتے رہتے ہیں تاکہ خود اس طرح سکون حاصل کریں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ عام طور پر ایک ہی انداز سے بات کرتے تھے، گویا تاریخ کے طویل دور میں ایک دوسرے کے کان میں کہہ جاتے تھے سحر، کہانت، جنون اور افسانہ وغیرہ۔ لیکن قرآن اس کے بعد آنے والی آیت میں ایک مرتبہ پھر ان کی سرکشی کے اصل سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے بُرے اعمال ان کے دل پر زنگ بن کر لگے ہوئے ہیں اور وہ حقیقت کے ادراک سے محروم ہو گئے ہیں (کلّا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون)۔ عجیب دل ہلا دینے والی تعبیر ہے ان کے اعمال نے ان کے دلوں پر زنگ لگا دیا ہے

---

[1] "اساطیر" "اسطورہ" کی جمع "سطر" کے مادہ سے عام طور پر موہوم قصوں اور جھوٹی باتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اور وہ نور جو خدا داد فطرت کی بنا پر تھا سلب کر لیا ہے۔ اس وجہ سے حقیقت کا چہرہ جو آفتاب عالمتاب کی طرح درخشاں ہے ان کے دلوں پر ہرگز روشنی نہیں ڈالتا اور انوارِ وحی کا پرتو منعکس نہیں ہوتا۔

"ران" "رین" (بروزن عین) کے مادہ سے جیسا کہ راغب نے کہا ہے، وہی زنگ ہے جو قیمتی چیزوں کو لگ جاتا ہے۔ اور بعض دوسرے اربابِ لغت کے بقول سرخ رنگ کا چھلکا ہے جو ہوا کی رطوبت کے زیرِ اثر لوہے اور دوسری اسی قسم کی چیزوں پر چپک جاتا ہے جسے فارسی میں زنگ یا زنگار کہتے ہیں اور عام طور پر وہ اسی دھات کے پرانے اور بوسیدہ ہونے کی نشانی ہے اور طبعی طور پر اس کی شفافیت اور درخشندگی کے ختم ہونے کی علامت ہے۔

کبھی اس لفظ کی ایک چیز سے دوسری چیز پر غلبہ حاصل کرنے، یا کسی چیز میں اس طرح گرنے سے جس سے بچا نہ جا سکے تفسیر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں ان اصلی معانی کا لازمہ ہیں[1]

دل کی نورانیت کو ختم کرنے کے سلسلہ میں گناہ کے تباہ کن اثرات پر ہم بحث کریں گے جسے نکات کے عنوان کے ماتحت ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں فرماتا ہے: "ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتے ہیں بلکہ اس دن وہ اپنے پروردگار سے محجوب ہوں گے" (کلّا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون)۔ اور یہ کہ ان کی زیادہ دردناک سزا ہے۔ یہ اس بالاتر اور زیادہ لذت بخش نعمت کا بالکل تضاد ہے جو نیک لوگوں کو پروردگارِ عالم کی معنوی ملاقات اور اس کی بارگاہِ قرب میں حضور سے حاصل ہوگا۔

کلّا عام طور پر اس بات کی نفی کے لیے آتا ہے جو پہلے سے بیان شدہ ہو اور یہاں مفسرین نے کئی احتمال تجویز کیے ہیں۔ پہلا یہ کہ کلّا اس کی تاکید ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے یعنی اس طرح نہیں ہے کہ جس طرح انہوں نے قیامت کے دن کا افسانے اور کہانی کے طور پر تعارف کرایا ہے۔

یا یہ کہ اس طرح نہیں ہے کہ وہ زنگ جو ان کے دلوں پر لگ چکا ہے وہ اتر جائے۔ وہ اس جہان میں بھی جمالِ حق کے مشاہدہ سے محروم ہیں اور دوسرے جہان میں بھی۔

یا یہ کہ جس طرح قرآن کی دوسری آیات میں آیا ہے کہ وہ مدعی تھے کہ اگر بالفرض قیامت ہو بھی تب بھی وہ خدا کی انواع و اقسام کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے[2]

---

[1] تفسیر فخر رازی در ذیل آیہ زیر بحث اور المنجد مادہ رین کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] سورہ کہف کی آیہ ۳۶ میں آیا ہے (وما اظن الساعۃ قائمۃ ولئن رددت الی ربی لاجدن خیرا منھا منقلبا) میں بالکل باور نہیں کرتا کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹوں بھی اور قیامت ہو بھی پھر بھی اس جگہ سے بہتر جگہ وہاں پاؤں گا (ان معانی کی نظیر سورہ فصلت کی آیت ۵۰ میں بھی آئی ہے)۔

اس طرح نہیں ہے جس طرح وہ خیال کرتے ہیں بلکہ وہ قیامت میں شدید ترین عذابوں اور سخت ترین شکنجوں میں گرفتار ہوں گے۔

جی ہاں! آخرت انسان کے اس دنیا کے اعمال کا عکس اور عظیم تجسّم ہے۔ وہ لوگ جو یہاں مشاہدۂ حق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگے ہوئے ہیں، وہاں بھی پروردگار سے محجوب ہوں گے اور جمالِ حق کے مشاہدہ کی طاقت ان میں نہیں ہوگی اور وہ محبوبِ حقیقی کے لقائے معنوی سے محروم رہیں گے۔

اس کے بعد وہ یقیناً جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے (ثم انھم لصالوا الجحیم)۔ یہ جہنم میں ورود پروردگار سے محجوب ہونے کا نتیجہ ہے اور ایک ایسا اثر ہے جو اس سے جدا نہیں ہے اور بحیثیتِ مسلّم دیدارِ حق سے محرومیت کی آگ جہنم کی آگ سے بھی زیادہ جلانے والی ہے۔ اور آخری آیت میں فرماتا ہے:

"پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی چیز ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے" (ثم یقال ھٰذا الذی کنتم بہ تکذبون)۔ یہ بات ان سے بطور توبیخ و ملامت و سرزنش کہی جائے گی اور یہ اس بیوقوف اور ہٹ دھرم گروہ کے لیے ایک روحانی عذاب ہے۔

چند نکات

۱۔ دل کے لیے گناہ کیوں زنگ ہے

نہ صرف اس سورہ کی آیات میں دل کو تاریک کرنے پر گناہ کی تاثیر کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے بلکہ قرآن مجید کی بہت سی دوسری آیتوں میں بھی ان معانی کی کئی مرتبہ تکرار کی گئی ہے اور بڑی صراحت کے ساتھ انہیں قابلِ توجہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:

(کذالک یطبع اللہ علیٰ کل قلب متکبر جبار) "اسی طرح خدا ہر متکبر جبار اور سرکش کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے" (مومن۔ ۳۵)۔ ایک دوسری جگہ ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے گناہ گاروں کے گروہ کے بارے میں فرماتا ہے:

(ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم) "خدا نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے اور اسی طرح ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے" (بقرہ۔ ۷)۔ اور سورہ حج کی آیت ۴۶ میں ہم پڑھتے ہیں:

(فانھا لا تعمی الابصار ولٰکن تعمی القلوب التی فی الصدور) ظاہری آنکھیں نابینا نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل ہیں جو سینوں میں اندھے اور نابینا ہو جاتے ہیں۔

جی ہاں! گناہ اور اس کو جاری رکھنے کا بدترین اثر دل کا تاریک ہو جانا ہے اور نورِ علم اور حسّ کا

ختم ہو جاتا ہے۔ گناہ اعضاء و جوارح سے سرزد ہوتے ہیں لیکن دل کو متاثر کرتے ہیں اور اُسے غلیظ و متعفن کیچڑ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان راہ اور چاہ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا اور عجیب و غریب شبہات کا شکار اور غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے جن سے ہر شخص حیران ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارتا ہے اور اپنی خوش بختی کا سرمایہ برباد کر دیتا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام سے منقول ہے (کثرة الذنوب مفسدة للقلب) گناہوں کی فراوانی انسان کے دل کو تباہ کر دیتی ہے[1]

پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک اور حدیث ہے (ان العبد اذا اذنب ذنبا نکتت فی قلبه نکتة سوداء فان تاب ونزع واستغفر صقل قلبه وان عاد زادت حتی تعلو قلبه فذالك الرین الذی ذکر الله فی القرآن (کلّا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون) جس وقت بندہ گناہ کرے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اگر توبہ کرے اور گناہ سے دستبردار ہو جائے اور استغفار کرے تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کی طرف پلٹے تو سیاہی بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے پورے دل کو گھیر لیتی ہے اور یہ وہی زنگ ہے جس کی طرف اس آیت (کلّا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون) میں اشارہ ہوا ہے[2]

یہی مفہوم امام محمد باقرؑ سے بھی اصول کافی میں مختصر سے فرق کے ساتھ منقول ہے[3]

نیز اسی اصول کافی میں رسولِ خداؐ سے منقول ہے کہ (تذاکروا وتلاقوا وتحدثوا فان الحدیث جلاء للقلوب ان القلوب لترین کما یرین السیف وجلائه الحدیث) مذاکرہ کرو اور ایک دوسرے سے ملاقات کرو اور (دین کے پیشواؤں کی) احادیث نقل کرو اس لیے کہ حدیث دلوں کی جِلا کا سبب ہے۔ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح تلوار کو زنگ لگ جاتا ہے اور قلوب کا صیقل حدیث ہے[4]

اصول نفسیات کی رُو سے بھی یہ مفہوم ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کے اعمال کا ہمیشہ اس کی روح پر اثر ہوتا ہے اور وہ اعمال، روح کو آہستہ آہستہ اپنی صورت پر لے آتے ہیں، یہاں تک کہ انسان کے

---

[1] درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۶۔
[2] درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۵۔
[3] نورالثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۱ حدیث ۲۲، ۲۳۔
[4] ایضاً " " " " " " " " " "۔

سوچنے کے طریقہ اور فیصلہ کرنے کے انداز پر بھی اپنا اثر ڈالتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انسان گناہ کو جاری رکھنے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ روح کی تاریکی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور ایسی منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کو اپنے گناہ حسنات نظر آتے ہیں یعنی وہ اپنی برائیوں ہی کو اچھائیاں سمجھنے لگتا ہے۔ وہ بعض اوقات اپنے گناہ پر فخر کرتا ہے ایسی منزل پر پہنچ کر اس کے لیے واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا یہ ایک خطرناک ترین حالت ہے جو ایک انسان کو پیش آتی ہے۔

۲- رُوح وجان کے چہرہ پر عذاب

اگرچہ بہت سے مفسرین نے کوشش کی ہے کہ آیت (کلّا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون) میں کسی چیز کو مقدر قرار دیں اور کہیں کہ یہ گناہ گار خدا کی رحمت سے محجوب ہوں گے، یا اس کے احسان، کرامت اور ثواب سے محجوب ہوں گے لیکن بظاہر آیت کسی تقدیر کی محتاج نہیں ہے۔

وہ واقعتاً پروردگار سے محجوب ہوں گے جبکہ نیک اور پاک افراد قربِ خداوندی کی منزل پر فائز ہوں گے اور دیدارِ محبوب اور اس کے شہودِ باطنی سے بہرہ مند ہوں گے۔

یہ بے ایمان اور گنہگار دوزخی ہیں جو اس فیضِ عظیم اور نعمتِ بے نظیر سے محروم ہیں۔ بعض پاک دل مومن اس جہان میں بھی اس دیدار سے فیضیاب ہوتے ہیں جبکہ کور دل مجرم اُس جہان میں بھی اس فیض سے محروم ہوں گے۔ پاک دل ہمیشہ حضورِ خداوندی میں ہیں اور یہ بے بصیر تاریک دل اس سے دور ہیں۔

وہ اس کی مناجات سے اس قدر لذت حاصل کرتے ہیں جو کسی بیان کی محتاج نہیں ہے جبکہ یہ گنہگار اپنے گناہوں کی نحوست میں اس قدر غرق ہیں کہ ان کے لیے کوئی راہ نجات نہیں ہے۔

تو کز سرائے طبیعت نمی روی بیروں کجا بکوئے حقیقت گزر توانی کرد

جمالِ یار ندارد حجابُ پردہ ولے غبارِ راہ نشاں تا نظر توانی کرد

تُو مادہ کے گھر سے باہر نہیں نکلتا تو پھر حقیقت کے کوچہ میں تیرا گزر کیسے ہو سکتا ہے۔ محبوب کے جمال پر کوئی پردہ نہیں ہے لیکن غبارِ راہ کو بٹھانا کہ تُو دیکھ سکے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ مشہور دعائے کمیل میں فرماتے ہیں: ھبنی صبرت علی عذابك فکیف اصبر علی فراقك) بالفرض اگر میں تیرے دردناک عذاب پر صبر کر بھی لوں تو تیرے فراق پر کیسے صبر کروں گا۔

(۱۸) كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝
(۱۹) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝
(۲۰) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝
(۲۱) يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝
(۲۲) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝
(۲۳) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝
(۲۴) تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۚ
(۲۵) يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝
(۲۶) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝
(۲۷) وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝
(۲۸) عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۸) ایسا نہیں ہے جیسا وہ (قیامت کے بارے میں) خیال کرتے ہیں بلکہ نیک لوگوں کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔
(۱۹) اور تو کیا جانے علیین کیا ہے؟
(۲۰) تحریر ہے لکھی ہوئی اور سرنوشت ہے قطعی۔
(۲۱) جس کے شاہد مقربین ہیں۔

(۲۲) یقیناً نیک لوگ انواع و اقسام کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

(۲۳) جنت کے خوبصورت پلنگوں اور تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے اور جنت کی خوبصورتی کو دیکھ رہے ہوں گے۔

(۲۴) ان کے چہروں پر تو نعمت کی طراوت اور نشاط دیکھے گا۔

(۲۵) وہ وہ شراب زلال دست نخوردہ و سربستہ سے سیراب ہوں گے۔

(۲۶) اس پر جو مُہر لگائی گئی ہو گی وہ مشک و کستوری سے ہو گی اور ان جنت کی نعمتوں میں رغبت رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہیئے۔

(۲۷) یہ شراب (طہور) تسنیم سے مخزوج ہو گی۔

(۲۸) وہی چشمہ جس سے مقربین پئیں گے۔

تفسیر

عِلیّین ابرار کے انتظار میں ہے

اس توصیف کے بعد جو گزشتہ آیات میں فاجر لوگوں کے اعمال اور سرنوشت کے بارے میں آئی ہے ان آیات میں اس گروہ کے بارے میں گفتگو ہے جو ان کا مدِ مقابل ہے یعنی ابرار اور نیکوکار لوگ جن کا امتیاز، افتخار اور اعزاز فاجروں کے مقابلہ میں ملاحظہ کرنے سے دونوں کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"ایسا نہیں ہے جیسا وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں بلکہ نیک لوگوں کے نامہ ہائے اعمال علیین میں ہوں گے" (کلّا ان کتاب الابرار لفی علیین)۔

"علیین" "علی" (بروزن ملی) کی جمع ہے بلند جگہ اور اس پر بیٹھنے والوں کے معنوں میں ہے۔ پہاڑوں کے بلند ترین حصّوں پر رہنے والوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں مفسرین کی ایک جماعت نے آسمان کی افضل ترین جگہ یا جنت کی بہترین جگہ کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا ذکر صیغہ جمع کے ساتھ جو ہے وہ تاکید کے لیے ہے اور علو فی علو بلندی در بلندی کے معنوں میں ہے۔

بہرحال وہ دو تفسیریں جو گزشتہ آیات میں سجین کے بارے میں ہم کر چکے ہیں انہی سے مشابہ یہ تفسیریں ہیں۔

پہلی یہ کہ کتاب الابرار سے مراد نیک، پاک اور مومنین کا نامہ اعمال ہے اور مقصود کلام یہ ہے کہ ان کا نامہ اعمال ایک ایسے دیوانِ کل میں موجود ہے جو تمام مومنین کے اعمال کو بیان کرتا ہے۔ وہ دیوان بہت ہی بلند منزلت رکھتا ہے۔ یا یہ کہ ان کا نامہ اعمال بلند ترین مکان یا جنت کے فراز پر ہے۔ اور یہ سب معانی بتاتے ہیں کہ خود ان کا مقام بہت ہی بلند و بالا ہے۔

ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علیین سے مراد ساتواں آسمان اور عرشِ خدا کا نچلا حصہ ہے [1]

اور یہ نقطہ فجار کا عین نقطۂ مقابل ہے جو دوزخ کے طبقوں میں پست ترین جگہ قرار پائی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد سرنوشت اور حکمِ قطعی ہے جو نیک لوگوں کو بہشت کے اعلیٰ درجوں میں مقرر کیے ہوتے ہیں۔

ان دونوں تفسیروں میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ ان کا نامۂ اعمال ایک دیوان کل میں برقرار ہے اور اس دیوان کا مجموعہ آسمانوں کی بلندی پر ہے اور فرمانِ الٰہی بھی یہی قرار پایا ہے کہ وہ خود جنت کے بلند ترین مقامات میں ہوں۔

اس کے بعد علیین کی اہمیت و عظمت کو بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "تو کیا جانے کہ علیین کیا ہے" (وما ادراک ما علیون)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسا مقام ہے جو خیال و قیاس اور وہم و گمان سے بھی برتر ہے، جسے کوئی بھی حتیٰ کہ پیغمبرِ اسلامؐ بھی، اس کی عظمت اور حدودِ اربعہ کا ادراک نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد خود قرآن وضاحت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "علیین ایک لکھی ہوئی کتاب ہے" (کتاب مرقوم)۔ یہ اس تفسیر کی بنا پر ہے جو علیین کو ابرار کے نامہ اعمال کے دیوانِ کل کے معنی میں پیش کرتی ہے۔

باقی رہی دوسری تفسیر تو پھر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ حتمی سرنوشت ہے جس کے بارے میں خدا نے تحریر کیا ہے ان کی جگہ جنت کے افضل ترین درجات میں ہوگی۔ اس بنا پر کتابِ مرقوم کتاب الابرار کی تفسیر ہے نہ کہ علیین کی۔ (غور کیجئے)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ ایسی کتاب ہے جس کا مقربین مشاہدہ کریں گے، یا اس کی گواہی دیں گے" (یشھدہ المقربون)۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۷۰۵۳ و مجمع البحرین مادہ "علو"۔

اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت اس آیت میں مقربون سے مراد وہ فرشتے لیتی ہے جو بارگاہ الٰہی میں مقرب ہیں، وہ فرشتے جو نیک لوگوں کے اعمال کے یا یقینی سرنوشت کے ناظر ہیں لیکن بعد کی آیت اچھی طرح بتاتی ہے کہ مقربون خاصانِ خدا اور برگزیدہ مومنین کا ایک گروہ ہے جس کا مقام بہت اونچا ہے اور وہ دوسرے نیک افراد کے اعمال پر شاہد ہے، جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیت ۱۰، ۱۱ میں اصحاب المیمنہ اور اصحاب المشئمہ کے ذکر کے بعد فرماتا ہے:

(والسابقون السابقون اولئک المقربون) اور سبقت کرنے والوں میں سے سبقت کرنے والے ہی مقربین ہیں۔ اور سورہ نحل کی آیت ۸۹ میں ہم پڑھتے ہیں (ویوم نبعث فی کل امة شهیدًا علیهم من انفسهم وجئنا بك شهیدًا علی هٰؤلاء) "اور یاد کرو اس دن کو جب ہر امت میں سے ایک گواہ اس پر مقرر کریں گے اور تجھے ان پر گواہ قرار دیں گے"۔ اس کے بعد نیک لوگوں کے عظیم ثواب کے ایک حصہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یقیناً ابرار انواع واقسام کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہیں" (ان الابرار لفی نعیم)۔

"نعیم" کا اصلی مفہوم، جو راغب کے بقول بہت زیادہ نعمت کے معنی میں ہے اور نکرہ کی شکل میں اپنے ذکر کے اضافہ کے ساتھ یہاں عظمت واہمیت کی دلیل ہے، یہ بتاتا ہے کہ ابرار اس قسم کی برکتوں اور نعمتوں کے حامل ہیں جو حدودِ توصیف وتعریف سے باہر ہیں اور یہ جنت کی تمام مادی ومعنوی نعمتوں اور برکتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔ اس کے بعد ان میں سے بعض کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ جنت کے خوبصورت پلنگوں اور تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ان تمام نعمتوں اور مناظر کو دیکھ رہے ہوں گے اور لذت اٹھا رہے ہوں گے" (علی الارائك ینظرون)[1]

"ارائك" "اریکه" کی جمع ہے اور خوبصورت تخت کے معنی میں ہے، یا پُر زینت پلنگ جو حجلہ عروسی میں رکھتے ہیں۔ یہاں جنت کے بہت ہی خوبصورت تختوں اور پلنگوں کی طرف اشارہ ہے جن پر نیک اور صالح افراد متمکن ہوں گے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کی اصل فارسی ہے اور یہ "ارگ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی قصرِ سلطنت کے ہیں۔ (یہ لفظ اس قلعہ کے معنی میں بھی آیا ہے جو شہر کے اندر ہو، اور چونکہ شہر کے اندر والا قلعہ عام طور پر بادشاہوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے لہٰذا اس پر اطلاق ہوتا ہے)۔

---

[1] اس جملہ میں مبتدا محذوف ہے اور تقدیر میں (هم علی الارائك ینظرون) ہے اس جملہ میں ینظرون حال ہے یا یہ کہ علی الارائك گزشتہ آیت کے لفظ "ان" کی خبر کے بعد خبر ہے۔

بعض دوسرے مفسرین ارائک کو مفرد اور فارسی لفظ "اراک" یا "ارایک" سے ماخوذ جانتے ہیں جس کے معنی شاہی تخت کے ہیں اور پایۂ تخت اور اس صوبہ کے معنی میں ہیں جس میں پایۂ تخت ہو اور عراق کو اراک کا معرب سمجھتے ہیں جو اس قسم کے صوبہ کے معنی میں ہے اور کہتے ہیں کہ لفظ ارائک اوستا (زرتشت کی مقدس کتاب) میں بھی بارگاہ اور تختِ سلطنت کے معنی میں آیا ہے۔

لغت عرب کے بعض علماء اس کی اصل عربی کو سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ اراک سے لیا گیا ہے جو مشہور درخت کا نام ہے جس سے تخت اور سائبان بنائے جاتے ہیں [1]

لیکن قرآن مجید میں اس کے موارد استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس زیبا خوبصورت اور مزین تخت کے معنوں میں ہے جس سے صاحبانِ قدرت و نعمت استفادہ کرتے ہیں۔

(ینظرون) دیکھیں گے کی تعبیر جو سربستہ شکل میں استعمال ہوئی ہے اس میں یہ نہیں فرماتا کہ کس چیز کی طرف دیکھیں گے تاکہ اس کے مفہوم میں وسعت رہے۔ وہ لطفِ خدا کی طرف دیکھیں گے۔ اس کے بے مثال جمال کی طرف، جنت کی انواع و اقسام کی نعمتوں کی طرف اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والی خوبصورتیوں کی طرف دیکھیں گے جو بہشت بریں میں ہوں گے، اس لیے کہ انسانی لذتوں میں سے اہم ترین لذت دیکھنے کی لذت ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"جب تو ان کے چہروں کی طرف دیکھے تو نعمت کی طراوت خوشی اور نشاط ان میں دیکھے گا" (تعرف فی وجوههم نضرة النعیم)۔ جو اس طرف اشارہ ہے کہ نشاط، سرور اور خوشی ان کے چہروں پر جھلک رہی ہوگی اور ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر دوزخیوں کے چہرہ پر نظر کرے تو ان سے غم و رنج اور اندوہ و بدبختی اور بے چارگی نمایاں ہوگی۔

"نضرة" جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، تروتازگی اور نشاط کے معنی میں ہے جو اچھی زندگی گزارنے والوں کے چہرے سے عیاں ہوتی ہے۔ تخت، نظارہ، آرام و سکون و نشاط کی نعمتوں کے بعد ایک اور نعمت یعنی بہشتیوں کی شراب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"انہیں ایسی پاک و پاکیزہ شراب پلائیں گے جس کو کسی کا ہاتھ نہیں لگا ہوگا" (یسقون من رحیق مختوم)۔ وہ شرابِ طہور جو دنیا کی شرابوں کی طرح گناہ پر آمادہ کرنے والی، جنون پیدا کرنے والی شیطانی شراب کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ ہوش و عقل اور نشاط و عشق و صفا پیدا کرتی ہے۔

زیادہ مفسرین نے رحیق کو خالص شراب کے معنی میں لیا ہے، ایسی شراب جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوگی۔

---

[1] "لغت نامہ"، "دھخدا"، کتاب "دیوان دین"، "مفردات راغب"، اور برہان قاطع کی طرف رجوع کیا جائے۔

"مختوم" کے معنی مہر لگی ہوئی۔ اس سے بھی اس کے خالص اور پاک وصاف ہونے کا اظہار ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کے برتنوں کا استعمال مہمان کے خاص احترام کی علامت ہے۔ ایسا ظرف جس کا منہ بند ہے، اس پر مہر لگی ہوئی ہے اور اس کی مُہر صرف مہمان کی خاطر توڑی جاتی ہے۔[1]

اس کے بعد فرماتا ہے: "اس کی مُہر مشک اور کستوری سے لگائی گئی ہے" (ختامہ مسک)۔ دنیا کے منہ بند برتنوں کی طرح نہیں جن کی مُہر مٹی سے لگائی جاتی ہے تو مشک اور عطر کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ آخر میں یعنی اس شرابِ طہور کے پینے کے اختتام پر انسان کے منہ سے مشک وعنبر کی خوشبو آئے گی، دنیا کی نجس شرابوں کے برخلاف جن کے پینے کے بعد منہ تلخ اور بدبودار ہو جاتا ہے لیکن اس تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو گزشتہ آیت میں آئی ہے یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔ آیت کے آخر میں جنت کی شرابِ طہور کے اوصاف بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

"ان بہشتی نعمتوں میں اور خصوصیت کے ساتھ اس شرابِ طہور کی طرف رغبت کرنے والوں کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانی چاہیئے" (و فی ذالك فلیتنافس المتنافسون)۔ مفسر عظیم "طبرسی" "مجمع البیان" میں کہتے ہیں:

"تنافس" کے معنی دو انسانوں کے ایک چیز کے لیے کوشش کرنے کے ہیں جن میں سے دونوں یہ چاہیں کہ یہ نفیس چیز میرے پاس ہو۔

مجمع البحرین میں ہے کہ تنافس کے معنی عظمت وعزت کے ساتھ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا ہے۔ راغب مفردات میں کہتا ہے "منافسہ" کے معنی یہ ہیں کہ معزز افراد سے مشابہت پیدا کرنے کے لیے ان سے ملحق ہو جانے کی اس طرح کوشش کرنا کہ دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔

حقیقت میں اِس آیت کا مضمون اُس آیت کے مشابہ ہے جو سورۂ حدید کی آیت ۲۱ میں آئی ہے (سابقوا الی مغفرة من ربکم و جنة عرضها کعرض السماء والارض) "اپنے پروردگار کی مغفرت تک پہنچنے کے لیے اور اس جنت تک پہنچنے کے لیے جس کی وسعت آسمان وزمین جتنی ہے، ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ"۔

---

[1] گزشتہ زمانے میں معمول تھا اور موجودہ زمانے میں بھی معمول ہے کہ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ اس چیز کو کسی کا ہاتھ نہیں لگا اسکو کسی برتن میں رکھتے اور اس کا منہ بند کرنے کے بعد کسی رسی یا بٹے ہوئے تار سے اس پر گرہ لگا دیتے تھے اور اس گرہ پر سخت مٹی یا لاکھ کو پگھلا کر رکھ دیتے اور اس پر اس طرح سے مہر لگا دیتے کہ برتن کے اندر مہر توڑے بغیر رسائی ممکن نہ ہوتی۔ عرب اس کو مختوم کہتے ہیں۔

یا جو کچھ سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۳ میں آیا ہے: (وسارعوا الیٰ مغفرة من ربکم و جنة عرضها السماوات والارض)۔ بہرحال اس آیت میں جو تعبیر آئی ہے وہ بہت ہی خوبصورت ہے اور جو ایمان و عملِ صالح کے ذریعہ ان بے نظیر نعمتوں تک پہنچنے کے سلسلہ میں انسانوں کو شوق دلانے کا سبب سمجھی جاتی ہے اور قرآن کی فصاحت و بلاغت کو عمدہ انداز میں ظاہر کرتی ہے[1]۔[2]

اس کے بعد آخری نعمت جو اس سلسلۂ آیات میں آئی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ شرابِ طہور تسنیم میں ملی ہوئی ہے" (ومزاجه من تسنیم)۔ "وہی چشمہ جس سے مقربین پیتے ہیں" (عیناً یشرب بها المقربون)[3]

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تسنیم جنت کی افضل ترین شراب طہور ہے جسے خاص طور پر مقربین پیتے ہیں لیکن عام نیک لوگ اس میں سے ایک مقدار رحیقِ مختوم ملا کر پیتے ہیں جو جنت کی شرابِ طہور کی ایک اور قسم ہے۔

یہ کہ یہ شراب یا یہ چشمہ تسنیم کے نام سے کیوں موسوم ہے (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ تسنیم لغت کے اعتبار سے چشموں کے معنوں میں ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف گر رہا ہو) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ وہ شراب ہے جو بہشت کے آسمانوں سے گر رہی ہے۔ حقیقت میں جنت کی شراب کئی قسم کی ہے۔ بعض تو نہروں کی صورت میں بہہ رہی ہے جن کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارہ ہوا ہے[4]

---

[1] جو کچھ آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذالک کا اشارہ جنت کی سات نعمتوں کی طرف ہے خصوصاً مخصوص شراب طہور جس کے پرکشش اوصاف آیت میں آئے ہیں۔

[2] چونکہ "واو" اور "فا" (وفی ذالك فلیتنافس المتنافسون) کے جملہ میں دونوں عطف کے لیے ہیں تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو حروف عطف یکے بعد دیگرے کیوں آئے ہیں۔ زیادہ مناسب جواب یہ ہے کہ یہاں حرفِ شرط محذوف ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے (وان اردت تنافس فی شئی فلیتنافس فی ذالك المتنافسون)۔ اگر کسی چیز میں رغبت ہے تو رغبت کرنے والے اس میں رغبت محسوس کریں۔ اس طرح حرفِ شرط اور جملہ شرطیہ دونوں محذوف ہیں اور ذالک بھی مقدم رکھا گیا ہے۔ (غور فرمایئے)

[3] یہ کہ عیناً کیوں منصوب ہے اس کے لیے بہت سی وجوہ بیان ہوئی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ کہ تسنیم کے لیے حال یا اس کی تمیز ہے یا مدح و اختصاص کے عنوان کے ماتحت ہے اور تقدیر اعنی (میری مراد ہے) اور "بھا" کی با یا تو زائدہ ہے یا "من" کے معنی میں ہے اور دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں۔

[4] سورہ محمد، آیت ۱۵۔

ان میں سے بعض منہ بند برتنوں میں مُہر زدہ صورت میں ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے۔ سب سے زیادہ اہم وہ شراب ہے جو بہشت کے آسمان یا اور اوپر والے طبقوں سے گرتی ہے اور یہ وہی شرابِ تسنیم ہے کہ جنت کا کوئی مشروب اس کا ہم پلہ نہیں ہے اور جنتیوں کے جسم و جان میں جو تاثیر فطری طور پر وہ کرتی ہے وہ سب سے بہتر پرکشش اور عمیق ہے۔ اس کے پینے سے جو نشہ حاصل ہوتا ہے وہ تعریف و توصیف سے بالا ہے۔

البتہ اس حقیقت کو ہمیں دوبارہ بیان کرنا چاہیئے کہ یہ سب دھندلے نقوش ہیں جو دُور سے نظر آتے ہیں ورنہ جنت کی گراں قدر اور بے نظیر نعمتوں کی تعریف و توصیف زبان و قلم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود قرآن کے بقول اس کی طرف کسی شخص کی فکر اور اس کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ (فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین) (الم سجدہ۔ ۱۷)۔ کوئی نفس نہیں جانتا کہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی کونسی چیزیں ان کے لیے رکھی گئی ہیں۔

چند نکات

ابرار اور مقربین کون لوگ ہیں؟

قرآن مجید کی آیات میں ابرار، مقربین اور ان کے عظیم اجر و ثواب کے بارے میں بارہا گفتگو ہوئی ہے یہاں تک کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۳ کے مطابق اولوالالباب (قوی عقل و فکر والے) تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کا اختتام ابرار کے ساتھ ہو۔ (و توفنا مع الابرار) اور سورہ دہر کی آیات میں بھی ان کے لیے بہت اجر و ثواب بیان ہوئے ہیں، (دھر آیت ۵ تا ۲۲) اور سورۂ انفطار کی آیت ۱۳ اور سورہ مطففین کی زیرِ بحث آیت بھی ان کے بارے میں بار بار خدا کی مہربانیوں کو بیان کرتی ہے۔

ابرار، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "بر" کی جمع ہے یہ وہی لوگ ہیں جو وسیع روح، بلند ہمت، اچھے اعتقاد اور نیک عمل کے حامل ہیں اور مقربین وہ ہیں جو بارگاہِ خدا میں قربِ مقام کے حامل ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ظاہری طور پر عام و خاص مطلق کی نسبت ہے یعنی سب مقرب افراد ابرار ہیں، لیکن سب ابرار مقرب نہیں ہیں۔

ایک حدیث امام حسن مجتبیٰ سے منقول ہے کہ (کلما فی کتاب اللہ عزوجل من قولہ ان الابرار فواللہ ما اراد بہ الا علی بن ابی طالب و فاطمۃ و انا والحسین) جہاں کہیں قرآن میں انّ الابرار آیا ہے خدا کی قسم اس سے پروردگار کی مراد علیؑ ابن ابی طالب، فاطمہؑ زہرا، میںؑ اور حسنینؑ ہیں [1]

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۳ حدیث ۳۳۔

اس میں شک نہیں کہ خمسہ نجباوہ پانچ مقدس نورِ ابرار و مقربین کے سب سے زیادہ مصداق ہیں اور جیسا کہ ہم نے سورہ دھر میں کہا ہے کہ یہ عظیم سورہ امیر المومنین حضرت علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی اٹھارہ آیات ان کے فضائل کی بحث میں ہیں اگرچہ ان کے بارے میں آیات کا نزول آیات کے مفہوم کی وسعت کی راہ میں مانع نہیں ہے۔

۲۔ جنت کی شرابیں

قرآن کی مختلف آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں کئی قسم کی شراب ہائے طہور کئی ناموں اور کیفیتوں کے ساتھ موجود ہیں جو ہر لحاظ سے دنیا کی ناپاک شرابوں سے مختلف ہیں۔ دنیا کی شرابیں عقل کو ختم کرتی ہیں، جنون پیدا کرتی ہیں اور عداوت و خونریزی اور فتنہ و فساد کا سرچشمہ بنتی ہیں۔ بدبودار و بدذائقہ اور نجس و ناپاک ہوتی ہیں۔

لیکن جنت کی شرابیں عقل، نشاط اور عشق پیدا کرتی ہیں۔ خوشبودار معطر اور پاک ہیں اور جو لوگ انہیں پیتے ہیں وہ ناقابلِ بیان روحانی نشہ سے سرور حاصل کرتے ہیں جس کی دو قسمیں اس سورت میں آچکی ہیں۔ رحیق مختوم اور تسنیم اور اس کی دوسری اقسام سورۂ دھر اور قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک کی اس جگہ ہم نے تصریح کی ہے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ متعدد روایات میں یہ جنت کی شراب ان لوگوں کا اجر قرار دی گئی ہے جو دنیا کی شراب کی طرف توجہ نہ کریں، پیاسوں کو سیراب کریں اور مومنین کے دلوں میں جو غم و اندوہ کی آگ جل رہی ہے، اسے بجھا دیں۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: (یا علی من ترک الخمر للہ سقاہ اللہ من الرحیق المختوم) اے علیؑ! جو شخص خدا کی خاطر شراب کو ترک کرے تو خدا اُسے جنت کی منہ بند مُہر شدہ شرابِ زُلال سے سیراب کرے گا۔[1]

زیادہ جاذب توجہ یہ بات ہے کہ ایک اور حدیث میں انہی جناب سے آیا ہے کہ اگر دنیا کی شراب، خدا نہیں، بلکہ غیر خدا کی خاطر بھی ترک کرے تو بھی خدا اسے اس شراب سے سیراب کرے گا۔

حضرت علیؑ کہتے ہیں "میں نے عرض کیا غیرِ خدا کے لیے؟"

فرمایا ہاں! جو شخص اپنی جان کی حفاظت کے لیے بھی دنیا کی شراب کو چھوڑے تو خدا اسے رحیق مختوم سے سیراب کرے گا۔[2]

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۴ حدیث ۳۷، ۴۰۔

[2] ایضاً " " " " " " " "

جی ہاں وہ افراد جو شراب کو اپنی سلامتی کی حفاظت کی خاطر ترک کریں وہ حقیقت میں اولوالالباب ہیں اور جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۹۳ سے معلوم ہوتا ہے اولوالالباب بھی ابرار کے زمرہ میں ہیں جو جنت کی شراب ہائے طہور سے بہرہ مند ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں علیؑ بن حسینؑ سے منقول ہے (من سقی مؤمناً من ظمأ سقاہ اللہ من الرحیق المختوم) جو شخص کسی پیاسے مومن کو سیراب کرے خدا اسے رحیق مختوم سے سیراب کرے گا۔[1]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے: (من صام للہ فی یوم صائف سقاہ اللہ من الظمأ من الرحیق المختوم) جو شخص موسم گرما کے دنوں میں روزہ رکھے تو خدا اسے قیامت کی تشنگی کی حالت میں رحیق مختوم سے سیراب کرے گا۔[2]

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۴ (حدیث ۳۵)۔

[2] مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث (جلد ۱۰ ص ۴۵۶)۔

(۲۹) اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ ۝
(۳۰) وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ۝
(۳۱) وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَکِهِیْنَ ۝
(۳۲) وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝
(۳۳) وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ ۝
(۳۴) فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ ۝
(۳۵) عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ ۝
(۳۶) هَلْ ثُوِّبَ الْکُفَّارُ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝

ترجمہ

(۲۹) بدکار دنیا میں ہمیشہ مومنین پر ہنستے تھے۔
(۳۰) اور جب مومنین کے پاس سے گزرتے تو اشاروں سے ان کا مذاق اڑاتے۔
(۳۱) اور جب اپنے خاندان کی طرف پلٹتے تو مسرور پلٹتے۔
(۳۲) اور جس وقت مومنین کو دیکھتے تو کہتے یہ گمراہ ہیں۔
(۳۳) حالانکہ وہ مومنین کی نگرانی پر کبھی مامور نہیں رہے اور نہ ان کے متکفّل تھے۔
(۳۴) لیکن آج مومنین کفار پر ہنستے ہیں۔
(۳۵) جبکہ جنت کے مزیّن تختوں (اور پلنگوں) پر بیٹھے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔
(۳۶) کیا کفار نے اپنے اعمال کا اجر لے لیا ہے؟

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کے لیے دو شان ہائے نزول نقل کی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک دن حضرت علیؑ اور مومنین کی ایک جماعت کفارِ مکہ کے قریب سے گزری تو وہ حضرت علیؑ اور ان مومنین پر ہنسنے لگے اور ان کا مذاق اڑایا، تو مندرجہ بالا آیتیں نازل ہوئیں اور ان مذاق اڑانے والے کافروں کی جو قیامت میں حالت ہوگی اس کو واضح کیا۔

حاکم ابوالقاسم حسکانی شواہد التنزیل میں ابن عباس سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ "ان الذین اجرموا" سے مراد قریش کے منافقین ہیں اور "الذین اٰمنوا" سے مراد علی بن ابی طالبؑ اور ان کے یار و انصار ہیں [1]

دوسری شانِ نزول یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات عمار، صہیب، جناب بلال اور اسی قسم کے دوسرے غریب مومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل جیسے مشرکین قریش کے تمسخر کا نشانہ بنے تھے۔

تفسیر

اس دن وہ مومنین کا مذاق اڑاتے تھے لیکن آج ....

گزشتہ آیات کے بعد، جو نیک لوگوں کو ملنے والی نعمتوں اور ثواب کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں، زیرِ بحث آیات میں ان مصائب اور زحمتوں کے ایک گوشہ کی طرف، جس سے اس جہان میں ایمان و تقویٰ کی بنا پر ان کا واسطہ پڑا تھا، اشارہ کرتا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ عظیم اجر و ثواب حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے۔

ان آیات میں کفار کی قبیح اور دل دُکھانے والی تنقید اور ان سے آمنا سامنا ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور کفار کے چار قسم کے ردِ عمل کو بیان کرتا ہے پہلے فرماتا ہے:

بدکار اور کفار ہمیشہ مومنین پر ہنستے تھے" (ان الذین اجرموا کانوا من الذین اٰمنوا یضحکون)۔

تمسخر آمیز اور مبنی بر حقارت ہنسی، ایسی ہنسی جو سرکشی و تکبر اور غرور و غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور ہمیشہ چھوٹے دماغ کے مغرور افراد متقی مومنین کے مقابلہ میں اس قسم کی بے وقوفانہ ہنسی سے کام لیتے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۷۔ حضرت علیؑ اور مشرکین مکہ کے بارے میں ان آیات کا نازل ہونا بہت سی کتب تفسیر مثلاً قرطبی، روح المعانی، کشاف اور تفسیر فخر رازی میں آیا ہے۔

ضمنی طور پر "کفروا" کی بجائے "اجرموا" کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ کافر و بے ایمان افراد اپنے گناہ آلود اعمال سے پہچانے جاتے ہیں اس لیے کہ کفر ہمیشہ سے عصیان و جرم کا سرچشمہ ہے۔

بعد والی آیت میں ان کے قبیح طرزِ عمل کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"جس وقت کفار مومنین کی جماعت کے قریب ہوں تو اشاروں سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں" (واذا مرّوا بھم یتغامزون)، اور اشاروں اشاروں میں کہتے ہیں کہ ان بے سروپا افراد کو دیکھتے ہو کہ یہ مقربین بارگاہِ خدا ہو گئے ہیں ان ننگے پاؤں اور بُرے حال لوگوں کو دیکھو کہ یہ اپنے اوپر وحی کے نزول کے مدعی ہیں اور نادان لوگوں کو دیکھو کہ یہ کہتے ہیں کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیاں دوبارہ زندگی کی طرف پلٹ آئیں گی اور یوں وہ اسی قسم کی دوسری کھوکھلی باتیں کرتے ہیں۔

ایسا نظر آتا ہے کہ مشرکین واضح طور پر اس وقت ہنسی اڑاتے تھے جب مومنین کی کوئی جماعت ان کے پاس سے گزرتی تھی اور ان کے تمسخر آمیز اشارے اس وقت ہوتے جب وہ مومنین کی جماعت کے نزدیک سے گزرتے اور چونکہ مومنین کی جماعت کے قریب رہ کر آسانی سے ان کا مذاق نہیں اڑا سکتے تھے، لہٰذا آنکھوں کے اشاروں سے کام لیتے تھے لیکن جہاں خود ان کا جھگڑا ہوتا اور مومنین ان کے پاس سے گزرتے وہاں وہ زیادہ آزادی اور جسارت سے کام لیتے[1]

"یتغامزون" "غمز" (بروزن طنز) کے مادہ سے آنکھ اور ہاتھ سے ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے معنی میں ہے جس سے عیب جوئی کا پہلو نکلتا ہو اور بعض اوقات یہ لفظ ہر قسم کی عیب جوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، خواہ زبان ہی سے کیوں نہ ہو۔

اور تغامز (باب تفاعل سے) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر یہ حرکت کرتے تھے اور ہر کوئی اشارہ کر کے دوسرے کو کچھ بتاتا، جس میں مذاق کا پہلو ہوتا۔ یہ تو مومنین سے آمنا سامنا ہونے پر ہوتا تھا۔ خصوصی جلسوں میں بھی یہی طریق کار اختیار کیے رکھتے اور علیحدگی میں بھی اس سلسلہ کو جاری رکھتے، جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے:

"جس وقت وہ اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاتے تو خوش ہوتے اور جو کچھ انجام دیا ہوتا اس پر پھولے نہ سماتے" (واذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین)۔ گویا انہیں فتح و کامیابی نصیب ہوئی ہے جس کی وجہ سے فخر و مباہات کر رہے ہیں اور پھر مومنین سے علیحدگی کی صورت میں بھی اس مذاق

---

[1] "مرّوا" اور "بھم" کی ضمیروں کے مرجع کے بارے میں مفسرین نے دو احتمال تجویز کیے ہیں بعض نے پہلی ضمیر پر مشرکین کی طرف اور دوسری مومنین کی طرف پلٹائی ہے اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے لیکن ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس کے مطابق پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

کو جاری رکھتے۔

"فکھین" جمع ہے "فکہ" کی، یہ صفت ہے مشبہ (اور بروزن خشن ہے) "فکاھہ" (بروزن قبالہ) مذاق اڑانے کے معنی میں ہے اور اصل میں فاکھہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی پھل کے ہیں، گویا یہ شوخیاں پھلوں کے مانند ہیں جن سے وہ لذت حاصل کرتے ہیں اور شیریں اور دوستانہ گفتگو کو فکاھہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اہل کا لفظ عام طور پر خاندان اور قریبی رشتہ داروں کے معنی میں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہاں زیادہ وسیع معنی رکھتا ہو اور قریبی دوستوں کا بھی احاطہ کرے۔

مومنین کے مقابلہ میں ان کا چوتھا شرارت آمیز طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ جب انہیں دیکھتے تو کہتے یہ گمراہ ہیں (واذا رأوھم قالوا ان ھٰؤلاء لضالّون)، اس لیے کہ وہ بت پرستی اور خرافات، جو کفار میں رائج تھیں، انہیں یہ گمراہ راہِ ہدایت خیال کرتے تھے جبکہ مومنین نے انہیں چھوڑ دیا تھا اور توحید کی طرف پلٹ آئے تھے اور کفار کے گمان میں نقدِ دنیا کی لذت کو مومنین نے آخرت کی خاطر ادھار بیچ دیا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ تعبیر ان مراحل میں ہو جہاں بات مذاق سے آگے بڑھ چکی ہو اور کفار اپنے آپ کو ناچار و مجبور دیکھتے ہوں کہ زیادہ سے زیادہ شدتِ عمل دکھائیں اس لیے کہ ہمیشہ عظیم پیغمبروں اور نئے دین و آئین کے ظہور کے وقت دشمنوں اور مخالفوں کا یہی طرزِ عمل ہوتا ہے کہ وہ مذاق اڑاتے تھے۔ گویا وہ نئے دین کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ سنجیدگی سے اس کا سامنا کریں۔ لیکن جب دینِ خدا آمادہ افراد کے دلوں میں نفوذ کر جاتا اور اس کے بہت سے پیروکار ہو جاتے تو کفار خطرہ محسوس کرکے اس پر سنجیدگی سے اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے اور لڑائی پر شدت سے آمادہ رہتے اور مرحلہ بہ مرحلہ زیادہ شدت اختیار کرتے۔

مندرجہ بالا آیت ان کی انتہائی کوشش کا پہلا مرحلہ ہے جس کی بعد نوبت خوں ریز جنگوں تک پہنچ گئی۔ چونکہ مومنین عام طور پر ایسے افراد میں سے تھے جن کی کوئی اجتماعی حیثیت نہ تھی اور وہ دولت مند بھی نہیں تھے، اس بنا پر کفار انہیں چشمِ حقارت سے دیکھتے تھے اور ان کے ایمان کو بے قیمت شمار کرتے تھے اور ان کے دین کا مذاق اڑاتے تھے۔ بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے:

"یہ گروہِ کفار ان کی زندگی کا (مومنین کی) کبھی بھی محافظ و نگہبان اور متکفل نہیں تھا" (وما ارسلوا علیھم حافظین)، تو پھر کس حق کی بنا پر اور کون سی منطق کی رُو سے ان پر تنقید اور اعتراض کرتے تھے؟

سورہ ہود کی آیت ۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں کہ قومِ نوح کے دولتمندوں اور متکبر لوگوں نے آپ سے کہا (وما نراک اتبعک الّا الذین ھم اراذلنا بادی الرأی) "ہم ان لوگوں کو جنہوں نے تیرا اتباع کیا ہے ذلیل اور سادہ لوح ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتے"، تو اُن جناب نے

کفار کے جواب میں کہا: (ولا اقول للذین تزدری اعینکم لن یؤتیھم اللہ خیرًا اللہ اعلم بما فی انفسھم) "میں بالکل نہیں کہتا کہ وہ لوگ جو تمہاری نظر میں ذلیل وخوار ہیں، خدا انہیں خیر نہیں دے گا خدا ان کے دلوں سے زیادہ آگاہ ہے۔" (ہود - ۳۱)۔

یہ حقیقت میں ان خود پرست اور متکبر افراد کا جواب ہے اور انہیں بتایا جارہا ہے کہ اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ مومنین کس گروہ سے وابستہ ہیں، تم اپنے طور پر روحِ دعوتِ دین اور پیغمبر اسلامؐ کے آئین اور ان کے مجموعہ قوانین کو دیکھو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

قیامت میں صورتِ حال بالکل برعکس ہو جائے گی جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

"آج مومنین کفار پر ہنسیں گے۔" (فالیوم الذین اٰمنوا من الکفار یضحکون)۔ چونکہ قیامت انسان کے دنیاوی اعمال کا ردِعمل ہے اور وہاں عدالتِ الٰہی کا اجرا ہونا ہے اور عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں پاک دل مومن، ہٹ دھرم اور مذاق اڑانے والے کافروں پر ہنسیں، یہ ان مغرور لوگوں پر ایک قسم کا دردناک عذاب ہے۔

بعض روایات میں رسولِ خداؐ سے منقول ہے کہ اس روز جنت کا ایک در کفار کے سامنے کھلے گا اور وہ اس خیال سے کہ جہنم سے آزادی اور جنت میں ورود کا حکم انہیں دے دیا گیا ہے، اس دروازے کی طرف چل پڑیں گے۔ جس وقت اس کے قریب پہنچیں گے وہ دروازہ اچانک بند ہو جائے گا۔ اور یہ کئی مرتبہ ہوگا اور وہ مومنین جو جنت سے ان کا نظارہ کر رہے ہوں گے ان پر ہنسیں گے[1] لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

وہ مزین پلنگوں اور تختوں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے اور ان مناظر کو دیکھیں گے (علی الارائک ینظرون)۔ وہ کن چیزوں کی طرف دیکھیں گے؟ خدا کی لامحدود نعمتوں کی طرف، جی ہاں! بے کراں الطاف وکرم کو دیکھیں گے، اس آرام وسکون وعظمت واحترام کو دیکھیں گے (جو انہیں حاصل ہوگا) اور ان دردناک عذابوں کی طرف دیکھیں گے جن میں مغرور وخود پرست کفار انتہائی ذلت اور زبوں حالی کے ساتھ گرفتار ہوں گے۔

اور پھر اس سورہ کی آخری آیت میں ایک استفہامیہ جملے کی شکل میں فرماتا ہے:

"کیا کفار نے اپنے اعمال کا اجر اور کاموں کا ثواب لے لیا ہے۔" (ھل ثوب الکفار ما کانوا یفعلون)[2]

---

[1] درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۸ (مختصر سے فرق کے ساتھ)۔

[2] اس آیت میں استفہام تقریری ہے۔

یہ بات چاہے خدا کی جانب سے ہو، یا فرشتوں کی طرف سے، یا مومنوں کی طرف سے، یہ ایک قسم کا طعن و استہزا ہے ان مغرور و متکبر افراد کے افکار اور دعووں پر جنہیں توقع تھی کہ اپنے بُرے اعمال کے بدلے میں خدا کی طرف سے انعام و اکرام انہیں ملے گا۔ اس غلط گمان اور خیالِ خام کے مقابلہ میں فرماتا ہے:

"کیا انہوں نے اپنے اعمال کا ثواب اور اجر لے لیا ہے"، بہت سے مفسرین نے اس جملے کو ایک مستقل جملہ سمجھا ہے جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ گزشتہ آیت کا حصہ ہے یعنی مومنین مزین تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ کیا کفار نے اپنے غلط اعمال کا اجر لے لیا ہے۔

جی ہاں! وہ اگر اجر لیں تو شیطان سے لیں، کیا وہ بے نوا گرفتار انہیں کوئی اجر دے سکتے ہیں۔

"ثوب" (بروزن جوف) ثوب کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کا اپنی پچھلی حالت کی طرف پلٹنا ہے اور ثواب اس اجر کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اس کے اعمال کے مقابلہ میں دیتے ہیں، اس لیے کہ اس کے اعمال کا نتیجہ اس کی طرف لوٹتا ہے۔ یہ لفظ اچھی یا بری جزا کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگرچہ عام طور پر موردِ خیر میں استعمال ہوتا ہے[1]

اس لیے اوپر والی آیت ایک قسم کا کفار پر طنز کرتی ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے اس لیے کہ وہ ہمیشہ مومنین اور آیاتِ خدا کا مذاق اڑاتے تھے لہٰذا ضروری ہے کہ اس دن اپنے مذاق کی سزا بھگتیں۔

ایک نکتہ

دشمنانِ حق کا مذاق اڑانے کا بزدلانہ حربہ

انبیاء کی طویل تاریخ میں ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ دشمنانِ خدا کا ایک حربہ مومنین کے مقابلہ میں تمسخر و استہزا رہا ہے اور آیاتِ قرآنی نے اس موضوع کو بارہا پیش کیا ہے اور چونکہ تمسخر و استہزا عام طور پر ایسے لوگوں سے صادر ہوتا ہے جو مغرور ہوتے ہیں اور خود کو دوسروں سے بہتر و برتر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو چشمِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کافر، ظالم، ہٹ دھرم اور خود پرست اہلِ ایمان کے مقابلہ میں اس قسم کا حربہ استعمال کریں۔

---

[1] "مفردات" راغب مادہ "ثوب"

موجودہ زمانے میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ دنیا کے افسوس ناک گروہی معاملات میں کئی شکلوں میں طعن وطنز اور مذاق کی صورتِ حال کو جاری رکھا جاتا ہے۔ اب بھی کوشش کی جاتی ہے کہ حق کے طرفداروں کو اس قدیمی حربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدان چھوڑنے پر مجبور کریں۔ لیکن مومنین ان کے مقابلہ میں خدائی وعدوں کی طرف توجہ کرکے، جن کا ایک نمونہ اوپر والی آیت میں آیا ہے، آرام وسکون محسوس کرتے ہیں اور تاریک دل مخالفوں کے مقابلہ میں مومنین کے دلوں میں روحِ مقاومت پیدا ہوتی ہے۔

اصولی طور پر استہزا، تمسخر، غمز" (اشارے) ضحک اور ہنسنا، حق کے مقابلہ میں، جس کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے، یہ سب گناہانِ کبیرہ میں سے ہیں اور جہالت وغرور کی علامت ہیں ایک فہیم، عاقل اور ہشیار انسان بفرضِ محال کسی مکتب فکر سے متعلق نہ بھی ہو کبھی اپنے آپ کو اجازت نہیں دیتا کہ اس قسم کے حربوں سے کام لے وہ مقابل سے صرف منطقی حربوں سے مقابلہ کرتا ہے۔

خداوندا! ہم سب کو غرور وجہالت اور کبر ونخوت سے محفوظ فرما۔

پروردگارا! ہمیں حق طلبی، حق جوئی اور تواضع کی روح مرحمت فرما۔

بارالٰہا! ہمارا نامۂ اعمال علیین میں قرار دے اور سجینوں کے زمرہ سے خارج کردے۔

آمین یارب العالمین

سورہ مطففین کا اختتام

سُورۂ انشقاق

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہُوا
اس کی ۲۵ آیتیں ہیں

تاریخِ ابتدا ۳ شعبان المعظم ۴۰۷ھ بروز ولادت امام حسینؑ

سورۂ انشقاق کے مضامین اور اس کی تلاوت کی فضیلت

یہ سورہ قرآن مجید کے آخری پارے کی بہت سی دوسری سورتوں کے مانند معاد و قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ شروع میں دنیا کے اختتام اور قیامت کے شروع ہونے کے ہولناک اور دل ہلا دینے والے حوادث کی طرف کچھ اشارے کرتا ہے اور بعد والے مرحلہ میں قیامت، نیکوکاروں اور بدکاروں کے اعمال کا حساب اور ان کی سرنوشت کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے۔

تیسرے مرحلہ میں چند ایسے اعمال و عقائد جو موجبِ عذابِ الٰہی ہیں، اُن کو پیش کرتا ہے اور چوتھے مرحلہ میں چند قسموں کے بعد انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے مرحلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور آخرکار پانچویں مرحلہ میں دوبارہ نیک و بد اعمال اور ان کی سزا و جزا کے بارے میں بات کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلام سے منقول ہے (من قرأ سورة انشقت اعاذه الله ان یؤتیه کتابه وراء ظهره)، جو شخص سورہ انشقاق کو پڑھے تو خدا قیامت میں اس شر سے اس کو امان میں رکھے گا کہ اس کا نامہ اعمال پس پشت سے دیا جائے[1]

کتاب ثواب الاعمال میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جو شخص ان دونوں سورتوں (انفطار و انشقاق) کو پڑھے اور نمازِ فریضہ و نافلہ میں اپنا نصب العین بنالے تو خدا اس کو اس کی خواہشات تک پہنچائے گا، کوئی چیز اس کے اور خدا کے درمیان حائل نہیں ہوگی، وہ ہمیشہ لطفِ خدا پر نظر رکھے گا اور خدا اس پر نظر رکھے گا، یہاں تک کہ لوگوں کے حساب سے فارغ ہوگا۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۸۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۙ
(۲) وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ ۙ
(۳) وَ اِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۙ
(۴) وَ اَلۡقَتۡ مَا فِیۡہَا وَ تَخَلَّتۡ ۙ
(۵) وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ ۟
(۶) یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ ۚ
(۷) فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیۡنِہٖ ۙ
(۸) فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیۡرًا ۙ
(۹) وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَہۡلِہٖ مَسۡرُوۡرًا ۟

ترجمہ

(۱) جس وقت آسمان پھٹ جائے گا۔
(۲) اور اپنے پروردگار کے فرمان کو تسلیم کرے گا اور سزاوار ہے کہ ایسا ہی ہو۔
(۳) اور جب زمین میں وسعت پیدا ہو گی۔
(۴) اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔

۵ اور اپنے پروردگار کے حکم کو تسلیم کرے گی اور ایسا ہی ہونے کے لائق ہے۔

۶ اے انسان! تو رنج و تکلیف اور سعی و کوشش کے ساتھ اپنے پروردگار کے طرف جائے گا اور اس سے ملاقات کرے گا۔

۷ لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے۔

۸ عنقریب اس کے لیے آسان حساب ہوگا۔

۹ اور وہ خوشحالی کے ساتھ اپنے گھر والوں کی طرف پلٹ جائے گا۔

تفسیر

کمالِ مطلق کی طرف رنج آمیز سعی و کوشش

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے مضامین کی تشریح میں کہا ہے اس سورہ کے آغاز میں ہی عظیم اور عجیب دنیا کے اختتام کے حوادث کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"جب آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے اور آسمانی اجرام پراگندہ ہو جائیں گے اور نظام کواکب درہم و برہم ہو جائے گا" (اذا السماء انشقت) [1]

اس کی نظیر جو سورۂ انفطار میں آئی ہے، اس میں فرماتا ہے: (اذا السماء انفطرت واذا الکواکب انتثرت)۔ جس وقت آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے اور ستارے پراگندہ ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے (انفطار۔ ۱، ۲)۔ اور یہ اختتام دنیا اور اس کی خرابی و فنا کا اعلان ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"اور اس کے پروردگار کا حکم تسلیم کیا جائے گا اور حقیقت میں ایسا ہی ہونا چاہیئے" (واذنت لربھا وحقت)، مبادا یہ تصور ہو کہ انسان اس عظمت کے باوجود حکمِ الٰہی کا معمولی سا مقابلہ بھی کرے، وہ مطیع و فرمانبردار بندے کی طرح ہے جس کا اس کے حکم کے سامنے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم ہے۔

"اذنت" اصل میں "اذن" (بروزن افق) سے جو کان کے معنی میں ہے، لیا گیا ہے اور اس کے

---

[1] اذا حرف شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: اذا السماء انشقت .... لاقی الانسان ربہ فحاسبہ وجازاہ۔

معنی کان لگا کر سننا ہیں اور یہاں اطاعتِ فرمان کا کنایہ ہے۔ "حقت" حق کے مادہ سے شائستہ لائق اور سزاوار کے معنی میں ہے۔ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ سرِ تسلیم خم نہ کرے جبکہ لحہ بہ لحہ وجودِ خدا ہی سے اس کو فیض پہنچ رہا ہو۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی یہ رابطہ منقطع ہو جائے تو یہیں ختم ہو کر رہ جائے۔

جی ہاں! آسمان و زمین نہ صرف آغازِ خلقت میں، سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۱ (قالتا اتینا طائعین) کے مطابق، حق تعالیٰ کے فرمان کے مطیع تھے بلکہ عمر کے اختتام میں بھی ایسے ہی ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "حقت" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ قیامت کی وحشت اور اس کا خوف ایسا ہے کہ سزاوار ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور شگافتہ ہو جائیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اور بعد والے مرحلہ میں زمین کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور جس وقت زمین کھینچی جائے گی اور وسیع کی جائے گی" (واذا الارض مدت)۔ پہاڑ قرآن کی بہت سی آیات کی شہادت کے مطابق مکمل طور پر پراگندہ ہو جائیں گے اور تمام بلندیاں اور پستیاں ختم ہو جائیں گی، زمین صاف و شفاف، وسیع و عریض اور اپنے صحن میں تمام بندوں کے حضور کے لیے آمادہ ہو جائے گی۔

جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۰۵ تا ۱۰۷ میں فرماتا ہے: (ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفها ربی نسفًا فیذرها قاعًا صفصفًا لا ترٰی فیها عوجًا ولا امتًا)۔ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دے میرا پروردگار انہیں ہوا میں اڑائے گا اور برباد کر دے گا پھر زمین کو ہموار اور صاف کرے گا، اس طرح کہ تو اس میں کوئی بلندی و پستی نہیں دیکھے گا اور اس قسم کی دادگاہ و عدالت جس میں اولین و آخرین جمع ہوں، اس کے لیے ایسے میدان کی ضرورت ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا اسی زمین کو قیامت میں اس سے کہیں زیادہ وسیع کر دے گا کہ جس حالت میں اب ہے تاکہ مخلوق کے حشر کے لیے اس میں زیادہ سے زیادہ آمادگی ہو۔[1]

تیسرے مرحلہ میں مزید کہتا ہے: "زمین اس چیز کو جو اس کے اندر ہے، باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی" (والقت ما فیها و تخلت)۔ مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام وہ مُردے جو مٹی اور قبروں میں آرام کر رہے ہیں، اچانک باہر پھینک دیئے جائیں گے اور وہ لباسِ زندگی زیبِ تن کریں گے۔

یہ اس کے مشابہ ہے جو سورہ زلزال میں آیا ہے (واخرجت الارض اثقالها)۔ زمین اپنے

---

[1] تفسیر فخر رازی در ذیلِ آیات زیرِ بحث۔

وزنی بوجھ باہر نکالے گی۔ یا جو کچھ سورہ نازعات کی آیہ ۱۳، ۱۴ میں آیا ہے (فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذا ھم بالساھرۃ)۔ صرف ایک صیحہ ہوگا اور اس کے بعد سب کے سب صفحۂ زمین پر ظاہر ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انسانوں کے علاوہ معدنیات اور خزانے جو زمین میں پوشیدہ ہیں، سب کے سب زمین سے باہر آجائیں گے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ زمین کے اندر پگھلا ہوا مواد ہولناک اور وحشت ناک زلزلوں کی وجہ سے کلّی طور پر باہر آکر گرے گا اور وہ تمام پستیوں کو پُر کر دے گا اس کے بعد زمین کے اندر کا حصہ بالکل خالی اور ساکن ہو جائے گا۔

ان معانی کے درمیان جمع میں بھی کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"اس کے بعد زمین اپنے پروردگار کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گی اور شائستہ و لائق ہے کہ سرِ تسلیم خم کرے" (واذنت لربھا وحقت)۔ یہ عظیم حوادث جو تمام موجودات کے سرِ تسلیم خم کرنے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، ایک طرف تو اس دنیا کے فنا ہونے کو بیان کرتے ہیں، زمین و آسمان، انسانوں، خزانوں اور گنجینوں کی فنا، اور دوسری طرف عالمِ آفرینش میں نئے عالم ہستی کے ایجاد کی دلیل ہیں۔ اور تیسرے خداوندِ عظیم و بزرگ کی ہر چیز پر خصوصاً معاد و قیامت پر قدرت کی نشانی ہیں۔

جی ہاں! جب یہ حوادث واقع ہوں تو انسان اپنے نیک و بد اعمال کا نتیجہ دیکھ لیتا ہے۔ (یہ ایسا جملہ ہے جو تقدیر میں ہے)۔ اس کے بعد انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اور اس راہ میں جو ان کی سرنوشت ہے، ان کے لیے واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے انسان تُو سعی و کوشش اور رنج و تکلیف کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے اور آخرکار اس سے ملاقات کرے گا" (یا ایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملاقیہ)۔

"کدح" (بروزن مدح) سعی و کوشش کے معنی میں ہے جو رنج و تعب کے ہمراہ ہو اور جسم و جان پر اثر انداز ہو۔ اسی لیے سخت محنت کرنے والے بیل کو جس میں کام کرنے کے آثار ظاہر ہوں، "ثورینہ کدوح" کہتے ہیں۔

تفسیر کشاف، فخر رازی اور روح المعانی میں آیا ہے کہ یہ لفظ اصل میں اس خراش کے معنی میں ہے جو کھال پر لگ جاتی ہے۔ اسی مناسبت سے ان کوششوں پر جو روحِ انسانی پر اثر انداز ہوں، اس کا اطلاق ہوا ہے۔

یہ آیت ایک بنیادی اصل کی طرف اشارہ ہے جو تمام انسانوں کی حیات میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی ہمیشہ زحمت اور رنج و تعب اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اگر مقصود صرف متاعِ دنیا تک

پہنچنا ہی ہو تب بھی، چہ جائیکہ مقصود آخرت، سعادتِ جاوداں اور قربِ پروردگار ہو۔

دنیاوی زندگی کی یہ طبیعت اور اس کا یہ مزاج ہے۔ یہاں تک کہ وہ افراد جو انتہائی خوش حالی سے عمر گزارتے ہیں وہ بھی رنج و زحمت اور درد و تکلیف سے بچے ہوئے نہیں۔

پروردگار کی ملاقات کی تعبیر سے یہاں مراد چاہے قیامت کے منظر کا دیکھنا ہو، جو اس کی حاکمیتِ مطلقہ کا مظہر ہے، یا اس کی جزا و سزا کا آمنا سامنا ہو، یا شہود باطن کے طریقہ سے خود اس کی ملاقات ہو۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ رنج و تعب اس دن تک جاری رہے گا اور اس وقت ختم ہوگا جب اس دنیا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور انسان پاکیزہ عمل کے ساتھ اپنے خدا سے ملاقات کرے گا۔

جی ہاں! رنج و تعب کے بغیر راحت و آرام صرف وہم ہے۔ "انسان" کے لفظ سے خطاب جو ساری نوعِ انسانی پر حاوی ہے، (انسان کی انسانیت پر انحصار کی طرف توجہ کرتے ہوئے) اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ خدا نے ضروری یہ توانائیاں اس اشرف المخلوقات میں پیدا کی ہیں اور عنوانِ رب پر انحصار اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سعی و کوشش انسانیت کے تکامل و تربیت کے نظام الاوقات کا ایک جز ہے۔

جی ہاں ہم سب مسافر ہیں جنہوں نے سرحدِ عدم سے رختِ سفر باندھا ہے اور اقلیمِ وجود میں قدم رکھا ہے۔ ہم سب اس کی راہِ عشق کے راہ رو ہیں اور دوست کے رُخِ انور کی مقناطیسی کشش کی بنا پر آئے ہیں۔

اس تعبیر کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی آئی ہے، مثلاً (وان الی ربك المنتهٰی) اور یہ کہ تمام امور تیرے پروردگار کی طرف لوٹتے ہیں اور تمام خطوط اسی پر منتہی ہوتے ہیں (نجم - ۴۲) نیز فرماتا ہے:

(والی اللہ المصیر) "سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے" (فاطر - ۱۸)۔ اور دوسری آیات سب یہ بتاتی ہیں کہ موجودات کے تکامل کا یہ راستہ خداوند متعال کی طرف جاتا ہے لیکن یہاں تمام انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے:

"لیکن یہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا عنقریب اس کا آسان حساب کتاب ہوگا" (فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا)۔ اور وہ مسرور ہو کر اپنے اہلِ خانہ کی طرف پلٹ جائے گا (وینقلب الی اهله مسرورًا)۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو آفرینش کے مدارِ اصلی میں، وہی مدار جو خدا نے اس انسان کے لیے اس کے سرمایوں، طاقتوں اور توانائیوں کے لیے معین کیا ہے، حرکت کرتے ہیں اور ان کی سعی و کوشش ہمیشہ خدا کے لیے ہے اور ان کی حرکت خدا کی طرف ہے۔

وہاں ان کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیں گے۔ ان کے اعمال کی پاکیزگی، ایمان کی صحت اور قیامت میں نجات کی علامت ہے اور اہلِ محشر کے مقابلہ میں سرفرازی و سربلندی کا سبب ہے۔

جس وقت میزانِ عدل کے نیچے کھڑے ہوں گے، وہ میزان جو کم سے کم میزان کو تولتی ہے، تو خدا ان کا حساب کتاب آسان کر دے گا، ان کی لغزشوں سے درگزر کرے گا اور ایمان و عملِ صالح کی وجہ سے ان کی سیئات کو حسنات میں تبدیل کر دے گا۔

یہ کہ "حساب یسیر" سے کیا مراد ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد سہل و آسان حساب ہے جس میں سخت گیری و دقت نہ ہو، برائیوں سے درگزر اور حسنات کا اجر ہو۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے: (ثلاث من کن فیه حاسبه الله حسابًا یسیرًا و ادخله الجنة برحمته قالوا وما هی یا رسول الله؟ قال تعطی من حرمك و تصل من قطعك و تعفو عمن ظلمك) تین چیزیں جس شخص میں موجود ہوں خدا اس کے حساب کو آسان کر دے گا اور اس کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ وہ کونسی چیزیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا تو اس کو عطا کرے جو تجھے محروم کرے، اس سے صلۂ رحم کرے جو تجھ سے قطع رحم کرے اور اس کو معاف کرے جو تجھ پر ظلم کرے۔[1]

یہ مفہوم روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت میں حساب و کتاب میں دقّت و سخت گیری انسانوں کی عقل و دانش کی میزان سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ امام محمد باقرؑ ارشاد فرماتے ہیں (انما یداق الله العباد فی الحساب یوم القیامة علی ما اٰتاهم من العقول فی الدنیا) خدا قیامت میں بندوں کے حساب کتاب میں اس عقل کی مقدار کے مطابق جو دنیا میں بندہ کو دی گئی ہے، سخت گیری کرے گا۔[2]

لفظ اہل کے لیے مندرجہ بالا آیات میں مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس کی بیوی اور ایمان دار اولاد ہے۔ مومنین جنت میں ان کے پاس پہنچیں گے اور یہ خود ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ انسان جن سے محبت رکھتا ہے انہیں جنت میں دیکھے اور ان سے قریب رہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے اہل کو جنت کی حوروں کے معنی میں لیا ہے جو مومنین کے لیے معیّن

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۷۔

ہوئی ہیں بعض نے اسے صاحبانِ ایمان افراد کے معنی میں لیا ہے جن سے وہ دنیا میں محبت کرتا تھا۔ ان تمام معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

چند نکات

۱۔ ایک ایسی حدیث جس میں اعجاز ہے

ایک حدیث میں اذا السماء انشقت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا (انها تنشق من المجرة) (ستارے) کہکشاؤں سے الگ ہو جائیں گے[1]

یہ حدیث پر معنی اور قابلِ وقعت ہے اور علمی معجزات میں شمار ہوتی ہے اور ایسی حقیقت پر سے پردہ اٹھاتی ہے کہ اس زمانہ کے ماہرین و علماء میں سے کوئی اس تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانے کے ماہرین فلکیات نے اپنے نجوم سے متعلق مشاہدات اور دوربینوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ عالم کہکشاؤں کا مجموعہ ہے اور ہر کہکشاں شمسی نظاموں اور ستاروں کا مجموعہ ہے اسی بنا پر انہیں ستاروں کے شہر کا نام دیتے ہیں۔

کہکشاں مشہور شہر کا راستہ ہے جو آنکھ سے نظر آسکتا ہے اور نظام ہائے شمسی اور ستاروں کے عظیم مجموعہ اور دائرہ کی مانند ہے۔ اس کی ایک سمت ہم سے اس قدر دور ہے کہ اس کے ستارے ہم کو سفید بادل کی شکل میں نظر آتے ہیں لیکن وہ درحقیقت ایک دوسرے سے نزدیک نورانی نقطوں کا مجموعہ ہیں۔

وہ سمت جو ہم سے نزدیک ہے اس کے ستارے قابلِ رویت ہیں۔ یہ وہی ستارے ہیں جو رات کے وقت ہم آسمان پر دیکھتے ہیں اور اس طرح ہمارا نظامِ شمسی سوائے اس کہکشاں کے اور کچھ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا روایت کے مطابق حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ قیامت کے برپا ہونے کے وقت یہ ستارے جنہیں تم دیکھتے ہو کہکشاں سے جدا ہو جائیں گے اور سب کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اس زمانے میں کون جانتا تھا کہ یہ ستارے جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں واقعی اس کہکشاں کا جز ہیں سوائے اس شخص کے جس کا دل عالمِ غیب سے مربوط ہو اور علمِ خدا کے سرچشمے سے سیراب ہوا ہو۔

۲۔ دنیا رنج و تکلیف اور دکھ درد کا گھر ہے

"کادح" کی تعبیر جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہے اور اس سعی و کوشش کی طرف اشارہ ہے جس

---

[1] روح المعانی، جلد ۳۰ ص ۸۷ و درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۹۔

میں رنج و زحمت کی آمیزش ہو، اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ اس کے مخاطب تمام انسان ہیں، اس واقعیت کو پیش کرتی ہے کہ اس جہان کی زندگی کی طبیعت کسی مرحلہ میں بھی مشکلات، تکالیف اور رنج و مشقت سے خالی نہیں ہے۔

چاہے یہ مشکلات و تکالیف جسمانی ہوں چاہے روحانی اور فکری یا دونوں، کسی فرد کو اس سے مفر نہیں ہے۔ حضرت علیؑ ابن الحسینؑ کی ایک بہت ہی پُرمعنی حدیث ہے: (الراحة لم تخلق فی الدنیا ولا لاهل الدنیا انما خلقت الراحة فی الجنة ولاهل الجنة والتعب والنصب خلقا فی الدنیا ولاهل الدنیا وما اعطی احد منها جفنة الا اعطی من الحرص مثليها ومن اصاب من الدنیا اکثر کان فيها اشد فقرا لانه يفتقر الی الناس فی حفظ امواله وتفتقر الی کل آلة من آلات الدنیا فليس فی غنی الدنیا الراحة) راحت و آرام دنیا میں اہل دنیا کے لیے نہیں ہے۔ راحت و آسائش صرف جنت میں ہے اور اہلِ جنت کے لیے ہے۔ رنج و تعب دنیا میں ہیں اور اہلِ دنیا کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے جو ایک پیمانہ اس میں سے حاصل کر لیتا ہے تو دُگنا لالچ اس کے نصیب میں شامل ہو جاتا ہے اور جس کے پاس مالِ دنیا کافی ہے وہ زیادہ فقیر ہے کیونکہ وہ اپنے مال کی حفاظت کے سلسلہ میں دوسروں کا محتاج ہے اور زیادہ وسائلِ حفاظت کا محتاج ہے۔ لہٰذا دنیا کے مال و دولت میں کوئی راحت و آرام نہیں ہے۔

اس کے بعد امامؑ نے اس حدیث کے ذیل میں فرمایا: (کلا ما تعب اولیاء الله فی الدنیا للدنیا بل تعبوا فی الدنیا للآخرة) اولیائے خدا دنیا میں دنیا کی خاطر رنج و تعب میں نہیں مبتلا ہوتے بلکہ دنیا میں ان کا رنج و تعب آخرت کے لیے ہے[1]

---

[1] خصال صدوق جلد ۱ باب الدنیا والاخرة کلفق المیزان، حدیث ۹۵۔

(۱۰) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ
(۱۱) فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ
(۱۲) وَّیَصْلٰى سَعِیْرًا ؕ
(۱۳) اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ
(۱۴) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ۚ
(۱۵) بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا ؕ

ترجمہ

(۱۰) اور رہا وہ شخص جس کو اس کا نامۂ اعمال اس کے پیچھے کی طرف سے دیا گیا۔
(۱۱) تو عنقریب اس کی فریاد بلند ہو گی کہ وائے ہو مجھ پر میں ہلاک ہو گیا۔
(۱۲) اور وہ جہنم کی آگ کے جلانے والے شعلوں میں جلے گا۔
(۱۳) وہ اپنے گھر والوں کے درمیان (کفر و گناہ کے سبب) مسرور تھا۔
(۱۴) وہ گمان کرتا تھا کہ کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔
(۱۵) جی ہاں! اس کا پروردگار اس کے مقابلہ میں بینا تھا۔

تفسیر

وہ جو شرم و حیا کے باعث اپنا نامۂ اعمال پشت کی طرف سے لیں گے

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں اصحاب الیمین (وہ مومنین جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا) کے بارے میں گزر چکی ہے، ان آیات میں کفار مجرمین اور ان کے نامۂ اعمال کی کیفیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"باقی رہا وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کی پشت کی طرف سے دیا جائے گا" (واما من اوتی کتابہ وراء ظھرہ)۔ عنقریب وہ فریاد کرے گا کہ وائے ہو مجھ پر کہ میں ہلاک ہوگیا (فسوف یدعوا ثبورًا)۔ "اور آگ کے جلانے والے شعلوں میں جلے گا" (ویصلیٰ سعیرًا)۔

یہ کہ ان کے نامہ اعمال کس طرح ان کے پسِ پشت سے دیں گے اور کس طرح یہ آیت اور وہ آیات جو کہتی ہیں کہ ان کے بائیں ہاتھ میں دیں گے، ایک جگہ جمع ہوں گی، اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ گردن کے ساتھ زنجیر سے بندھے ہوں گے اور ان کے نامہ ہائے اعمال بائیں ہاتھ اور پشت کے پیچھے سے ملیں گے جو ذلت وخواری سر نیچے رکھنے اور شرمساری کی علامت ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ قیدیوں کی طرح پیچھے باندھ دیئے جائیں گے۔ بعض دوسروں نے کہا ہے کہ سورہ نساء کی آیت ۴۷ کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو کہتی ہے: (من قبل ان نطمس وجوھًا فنردھا علیٰ ادبارھا)۔ "اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور پشت کی طرف پھیر دیں"۔ اس طرح گروہ مجرمین کے منہ عقب کی جانب مڑ جائیں گے اور ضروری ہے کہ وہ اپنے نامہ ہائے اعمال خود پڑھیں۔ لہٰذا وہ ان کے بائیں ہاتھ میں پشت کی جانب انہیں دیں گے۔

لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ اصحاب الیمین سرفرازی اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں لیے ہوئے پکار کر کہیں گے (ھاؤم اقرء واکتابیہ) "اے اہل محشر آؤ اور میرا نامہ اعمال لے کر پڑھو" (حاقہ - ۱۹)۔ لیکن جب گنہگاروں کو ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیں گے تو وہ شرمساری اور ذلت سے اپنا ہاتھ پشت کے پیچھے کر لیں گے تاکہ جرم کی سند کم تر دیکھی جائے۔

لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوگا اس لیے کہ وہاں کوئی چیز پوشیدہ رہنے والی نہیں ہے (یدعوا ثبورًا)، اس تعبیر کی طرف اشارہ ہے جو عرب کسی خطرناک حادثہ کے موقعہ پر کرتے ہیں اور فریاد بلند کرتے ہیں (واثبورا)، یعنی اے وائے کہ میں ہلاک ہوگیا۔

توجہ فرمائیں کہ "ثبور" ہلاکت کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ آہ و نالہ و فریاد کسی کے کان تک نہیں پہنچے گی۔ اس کے بعد (ویصلیٰ سعیرًا) ہے یعنی وہ جہنم کی جلانے والی آگ میں داخل ہوگا۔ اس کے بعد اس منحوس سرنوشت کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ اس بناء پر ہے کہ وہ اپنے گھر والوں میں ہمیشہ اپنے (کفر و گناہ کی وجہ سے) خوش رہتا تھا (انہ کان فی اھلہ مسرورًا)، ایسا سرور جس میں غرور کی آمیزش تھی اور ایسا غرور جو غفلت اور خدا سے بے خبری کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا، ایسا غرور جو دنیا کے ساتھ شدید دلبستگی اور موت کے

بعد والے جہان سے بے پرواہی کی نشانی تھا۔

واضح رہے کہ ذاتی طور پر سرور و خوش حالی مذموم چیز نہیں ہے بلکہ مومن کو چاہیئے کہ لطفِ خدا سے مسرور ہو اور رہنے سہنے کے انداز میں ہشاش بشاش ہو۔ وہ سرور و خوشی مذموم ہے جو انسان کو یادِ خدا سے غافل کر دے اور خواہشات کا اسیر بنا کر رکھ دے۔

اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "یہ اس بنا پر ہے کہ وہ گمان کرتا تھا کہ کبھی واپس نہیں لوٹے گا اور معاد و قیامت کا کوئی امکان نہیں ہے" (انہ ظن ان لن یحور) حقیقت میں اس کی بدبختی کا سبب اصلی اس کا اعتقادِ فاسد اور گمانِ باطل تھا، جس کا دارو مدار انکارِ قیامت پر تھا۔ یہی اعتقاد اس کے غرور و سرور کا باعث ہوا۔ اس نے اس کو خدا سے دور کیا اور خواہشات کا اسیر بنا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ وہ انبیاء کی دعوتِ فکر کا مذاق اڑاتا اور جب اپنے گھر والوں کے پاس آتا تو اس مذاق سے خوش ہوتا۔

یہی مفہوم سورہ مطففین کی آیت ۳۱ (واذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین) میں بھی آیا ہے۔ اسی طرح قارون، اس مغرور دولت مند اور خدا سے بے خبر انسان کی داستان میں بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے باخبر افراد اس سے کہتے تھے (لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین) اس قدر متکبرانہ طور پر خوش نہ ہو کیونکہ خدا خوش ہونے والے مغروروں کو دوست نہیں رکھتا (قصص۔ ۷۶)

"لن یحور" کبھی واپس نہیں لوٹے گا" "یحور" "حور" (بروزن غور) کے مادہ سے تردد اور آمد و رفت کے معنی میں ہے، خواہ یہ آمد و رفت عمل میں ہو یا فکر و نظر میں۔ اسی لیے پانی کے حوض اور تالاب میں گردش کرنے کے سلسلہ میں اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور محور اس لٹھ کو کہتے ہیں جس کے گرد چرخہ گھومتا ہے۔ محاورہ بحث کی آمد و رفت اور ردّ و بدل کے معنی سے ہے اور "حوار" بھی انہی معانی میں ہے اور کبھی اس داد کے معنی میں بھی آتا ہے جو بحث کے دوران بلند ہوتی ہے اور تحیر بھی کسی مسئلہ میں فکر کی آمد و رفت کا نتیجہ ہے جس کا لازمہ عمل میں سرگردانی ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کی اصل حبشی ہے۔ اور ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ میں قرآن کے اس جملے کے معنی نہیں جانتا تھا یہاں تک کہ ایک بیابانی عرب سے میں نے سنا کہ وہ اپنی لڑکی سے کہہ رہا تھا "حوری" یعنی واپس آجا[1]

حواری کی تعبیر حضرت عیسیٰؑ کے نزدیک رہنے والوں کے بارے میں ہے، یا ہر شخص کے قریب بیٹھنے والوں کے متعلق بھی شاید اسی مناسب سے ہے کہ وہ اس کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں۔ بعض نے

---

[1] مفردات راغب، تفسیر فخر رازی، ابوالفتوح اور دوسری کتب۔

اسے "حور" کے مادہ سے دھونے اور سفید کرنے کے معنی میں سمجھا ہے کیونکہ وہ لوگوں کے دلوں کو شرک و گناہ کے زنگ سے پاک و صاف کرتے تھے، اور جنت کی حوروں کو اسی لیے یہ نام دیا گیا ہے کہ ان کا رنگ سفید ہے، یا ان کی آنکھوں کی سفیدی بہت زیادہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ جنت کی حوروں کے لیے اس لیے بولا جاتا ہے کہ وہ اس قدر خوبصورت ہیں کہ آنکھ انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ لیکن بہرحال یہ لفظ زیرِ بحث آیت میں بازگشت اور معاد کے معنی میں ہے۔

یہ آیت ضمنی طور پر یہ بھی بتاتی ہے کہ قیامت پر ایمان نہ رکھنا، غفلت، غرور اور انواع و اقسام کے گناہوں میں آلودہ ہونے کا سرچشمہ ہے اور آخری زیرِ بحث آیت میں ان کے باطل عقائد کی نفی میں فرماتا ہے:

"جی ہاں! اس کا پروردگار اس کے بارے میں بینا تھا" (بلیٰ ان ربہ کان بہ بصیرا)۔ اس کے تمام اعمال کو لکھوایا اور روزِ حساب کے لیے ایک نامۂ اعمال میں انہیں محفوظ کیا۔ اس آیت کی تعبیر گزشتہ آیت (یا ایھا الانسان انک کادح الیٰ ربک کدحًا فملاقیہ) کی مانند عقیدہ و معاد پر دلیل و حجت شمار ہو سکتی ہے۔

خصوصاً دونوں آیات میں رب یعنی پروردگار کے عنوان پر انحصار ہوا ہے، اس لیے کہ انسان کی سیرِ ارتقا یعنی پروردگار تک پہنچنے کا عمل موت کے آنے پر منقطع نہیں ہوتا اور دنیاوی زندگی ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ خود مقصودِ تکامل ہو نیز انسان کے اعمال کے بارے میں خدا کا بصیر ہونا اور ان اعمال کو تحریر کیا جانا حساب و سزا و جزا کی تمہید ہی بن سکتا ہے، ورنہ فضول ہے۔

(۱۶) فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ
(۱۷) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ
(۱۸) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ
(۱۹) لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝
(۲۰) فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ
(۲۱) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝ سجدہ
(۲۲) بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝ صلے
(۲۳) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝ صلے
(۲۴) فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ
(۲۵) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ع

ترجمہ

(۱۶) شفق کی قسم۔
(۱۷) اور رات کی قسم اور جسے وہ جمع کرتی ہے۔
(۱۸) اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ بدرِ کامل ہوتا ہے۔
(۱۹) تم سب ہمیشہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہو۔
(۲۰) پس وہ کیوں ایمان نہیں لاتے؟
(۲۱) اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جائے تو سجدہ نہیں کرتے۔

(۲۲) بلکہ کفار ہمیشہ آیاتِ الٰہی کی تکفیر کرتے ہیں۔

(۲۳) خدا اس چیز کو جسے وہ دل میں چھپائے رکھتے ہیں، اچھی طرح جانتا ہے۔

(۲۴) پس انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے۔

(۲۵) مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے ہیں تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔

تفسیر

تم ہمیشہ دگرگوں ہوتے رہتے ہو

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں خدا کی طرف سے انسان کی سیرِ تکامل کے بارے میں آئی تھی، ان آیات میں اس مفہوم کی تاکید اور مزید توضیح کے لیے فرماتا ہے:

"قسم ہے شفق کی" (فلا اقسم بالشفق)۔ اور قسم ہے ان پراگندہ امور کی جنہیں وہ اکٹھا کرتی ہے (واللیل وما وسق)۔ اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ کامل ہوتا ہے اور چودھویں کے چاند کی صورت اختیار کرلیتا ہے (والقمر اذا اتسق)، کہ تم سب ہمیشہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہو (لترکبن طبقًا عن طبق)۔

فلا اقسم کے جملے میں لا کا لفظ، جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے، زائد ہے اور تاکید کے لیے ہے۔ اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ نفی کے لیے ہو یعنی میں قسم نہیں کھاتا اس بنا پر کہ مفہوم عیاں ہے، قسم کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ کہ مطلب اس قدر اہم ہے کہ ان قسموں کی ضرورت نہیں ہے یا یہ کہ یہ امور جن کی قسم کھائی گئی ہے اس قدر اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان کی قسم کھائی جائے لیکن پہلے معنی (زائد اور تاکید کے لیے ہونا) زیادہ مناسب ہیں۔

"شفق" مفردات میں راغب کے بقول دن کی روشنی کا رات کی تاریکی سے آمیختہ ہونا ہے۔ اس لیے لفظ اشفاق اس توجہ اور عنایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس میں خوف کا عنصر پایا جاتا ہو۔ مثلاً اگر کوئی فرد کسی شخص کے لیے محبت کے جذبات رکھتا ہو اور اس کے بارے میں کچھ حوادث سے ڈرتا ہو تو اس حالت کو اشفاق اور ایسے شخص کو مشفق کہتے ہیں۔

لیکن فخر رازی کا نظریہ ہے کہ شفق کا لفظ اصل میں رقّت اور نازک ہونے کے معنی میں ہے۔ رقّت

کے معنی پتلا ہونا ہے اسی لیے بہت ہی نازک اور پتلے لباس کو شفق کہتے ہیں اور شفقت کا لفظ رقتِ قلب کی حالت کے لیے بولا جاتا ہے (لیکن راغب کا قول زیادہ صحیح نظر آتا ہے)۔

بہرحال شفق سے مراد وہی روشنی ہے جو آغازِ شب کی تاریکی کی آمیزش رکھتی ہو اور چونکہ ابتدائے شب میں ایک کم رنگ کی سرخی افقِ مغرب پر پیدا ہوتی ہے اور پھر اس کی جگہ سفیدی لے لیتی ہے تو اس میں اختلاف ہے کہ شفق کا اطلاق اس سرخی پر ہے یا سفیدی پر۔

علماء و مفسرین کے درمیان مشہور و معروف وہ پہلے ہی معنی ہیں اور اشعارِ عرب میں بھی اسی پر انحصار کیا گیا ہے اور شفق کو شہیدوں کے خون سے تشبیہ دیتے ہیں اور (دماء الشہداء) کہتے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین نے دوسرے معنی کو منتخب کیا ہے جو بہت ضعیف نظر آتے ہیں خصوصاً یہ کہ اگر اس کی لغوی اصل کے معنی ہم رقت سمجھیں تو پھر اس کم رنگ کی سرخی سے مناسبت رکھتے ہیں جو سورج کی رقیق اور پتلی روشنی اور نور ہے۔

بہرحال چونکہ شفق کا ظہور دنیا میں ایک گہری تبدیلی اور دگرگونی کی حالت کی خبر دیتا ہے اور دن کے اختتام اور رات کے آغاز کا اعلان کرتا ہے، اس کے علاوہ اس میں ایک خاص قسم کا جلوۂ زیبائی اور خوبصورتی ہے، اور ان سب سے قطع نظر نمازِ مغرب کا وقت ہے لہٰذا خدا نے نمازِ مغرب کے وقت کی قسم کھائی ہے تاکہ سب لوگوں کو خبردار اور آمادہ کرے کہ وہ اس خوبصورت آسمانی وجود کے بارے میں غور و فکر کریں۔

باقی رہا رات کی قسم کھانا تو وہ ان بہت سے آثار و اسرار کی بنا پر ہے جو اس میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس پر ہم پہلے مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔[1]

"ما وسق" کی تعبیر[2] اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "وسق" بکھری ہوئی چیزوں کے جمع کرنے کے معنی میں ہے[3] اور مختلف قسم کے جانوروں، پرندوں، یہاں تک کہ انسانوں کے اپنے گھروں، آشیانوں اور گھونسلوں کی طرف رات کے وقت لوٹنے کی طرف اشارہ ہے جس کا نتیجہ جانوروں کا عمومی آرام و سکون اور آسائش ہے اور یہ رات کے اہم آثار و اسرار میں سے ایک شمار ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ مؤمن کی

---

[1] تفسیر نمونہ، جلد ۱۶ ص ۱۴۶ سورہ قصص کی آیت ۷۱ تا ۷۳ سے رجوع فرمائیں۔

[2] "ما وسق" میں ما موصولہ ہے اور اس کے مصدریہ ہونے کا احتمال ضعیف ہے اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر بھی محذوف ہے اور تقدیر میں "وما وسقہ" ہے۔

[3] "وسق" (بروزن غضب) اونٹ کے ایک بار یا ساٹھ صاع جس کا ہر صاع تقریباً تین کلو ہے کے معنی میں آیا ہے اور وہ بھی ان سب کے مجتمع ہونے کے معنی میں ہے۔

آیت ۶۱ میں ہم پڑھتے ہیں (اللہ الذی جعل لکم اللیل لتسکنوا فیہ)، خدا وہ ہے جس نے رات کو تمہارے لیے خلق کیا ہے تاکہ تم اس میں آرام وسکون حاصل کرو۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اذا اتسق کی تعبیر اسی مادہ سے ہے اور مختلف وجودوں کے جمع ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں چودھویں رات کے چاند کی روشنی کے کمال کے معنی میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ چاند اس حالت میں بہت ہی خوبصورت لگتا ہے اور ہر دیکھنے والی آنکھ کو دل کش نظر آتا ہے۔ اس کا نور صفحۂ زمین کو روشن کرتا ہے۔ اس کے ہلکے رنگ کی روشنی جو رات کے آرام وسکون کو خراب نہیں کرتی، رات کے مسافروں کو راستہ دکھاتی ہے اسی لیے وہ خدا کی عظیم آیات میں سے ایک آیت ہے۔ اسی بنا پر اس کی قسم کھائی گئی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ چاروں موضوعات جن کی ان آیات میں قسم کھائی گئی ہے (شفق، رات اور وہ موجودات جنہیں رات جمع کرتی ہے اور چودھویں رات کا چاند)۔

یہ سب ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک ایسے خوبصورت مجموعہ کو تشکیل دیتے ہیں جو انسانی فکر میں تحریک پیدا کرتا ہے تاکہ وہ تخلیق کی عظیم قوت پر غور وفکر کرے اور ان تیز تبدیلیوں سے وقوعِ قیامت اور قدرتِ خدا کے بارے میں آشنائی حاصل کرے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مختلف امور کا یہ حصہ ایسے حالات اور تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جو عالمِ آفرینش میں ایک دوسرے کے ساتھ رونما ہوتی ہیں۔

سورج چہرہ پر نقاب ڈالتا ہے تو شفق ظاہر ہو جاتی ہے جو اس کے نور کا بقیہ ہے۔ انسان، پرند، چرند بڑی تیزی سے اپنے ٹھکانوں اور آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں اور چاند بدرِ کامل کی شکل میں بلند ہوتا ہے۔

توجہ فرمائیں کہ چودھویں کا چاند رات کے اسی ابتدائی حصے میں طلوع ہوتا ہے اور ان قسموں کو "لترکبن طبقاً عن طبق" کے اس جملے کی تمہید قرار دیتا ہے جو مختلف ایسے حالات کو بیان کرتا ہے جو انسان اپنی راہ حیات میں یکے بعد دیگرے پیدا کرتا ہے۔ اس جملے کے لیے مفسرین نے مختلف تعبیریں بیان کی ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے۔

۱۔ مراد وہ گوناں گوں حالات ہیں جو انسان، خدا اور کمالِ مطلق کی جانب سفر کرنے کے پُرمشقت راستے میں پیدا کرتا ہے۔ پہلے عالمِ دنیا ہے پھر عالمِ برزخ ہے اور پھر قیامت اور اس کے مختلف حالات ہیں۔ (توجہ فرمائیں کہ "طبق"، "مطابقہ" کے مادہ سے ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دینے کے معنی میں ہے اور ان منزلوں کے معنی میں ہے جنہیں انسان اپنی سیرِ صعودی میں طے کرتا ہے)۔

۲۔ مراد وہ حالات ہیں جنہیں انسان کو نطفہ سے لے کر موت تک کے سفر میں سامنا کرنا ہوتا ہے۔

بعض محققین نے ایسی ۳۷ حالتیں شمار کی ہیں۔

۳۔ مراد وہ مختلف حالات و شدائد ہیں جن سے انسان دنیاوی زندگی میں صحت و بیماری، غم واندوہ، سرور و مسرت، سختی و آرام اور صلح و جنگ کی صورت میں دوچار ہوتا ہے۔

۴۔ مراد وہ مختلف حالات و شدائد ہیں جن سے انسان قیامت میں دوچار ہوگا یہاں تک کہ حساب سے فارغ ہو کر ہر شخص اپنے اعمال کے نتیجے میں دوزخ اور جنت کی طرف جائے گا۔

۵۔ مراد وہ حالات ہیں جو گزشتہ قوموں کو پیش آئے یعنی وہی تلخ و شیریں حوادث اور انواع و اقسام کی تردیدیں اور مخالفین کے انکار اس امت میں بھی واقع ہوں گے۔ یہ مضامین ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل ہوئے ہیں۔

ان تفسیروں کا جمع ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہوسکتا ہے کہ آیت ان تمام تبدیلیوں، تغیرات اور مراحل کی طرف اشارہ کر رہی ہو جنہیں انسان اپنی زندگی میں دیکھتا ہے۔ بعض مفسرین یہاں مخاطب خود پیغمبرؐ کو سمجھتے ہیں اور آیت کو ان آسمانوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جن سے پیغمبر اسلامؐ معراج کی شب گزرے ہیں۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "لترکبن" میں جو "ب" ہے اس پر پیش ہے اور جمع کے معنی دیتا ہے، اس لیے یہ تفسیر مناسب ہے خصوصاً یہ کہ گزشتہ آیات میں بھی مخاطب کُل انسان تھے۔

بہرحال ان حالات کا حدوث اور آدمی کا ایک حالت پر قیام نہ کرنا، ایک تو اس کے مخلوق ہونے اور محتاجِ خالق ہونے کی دلیل ہے، اس لیے کہ ہر متغیر حادث ہے اور ہر حادث کو خالق کی ضرورت ہے، دوسرے اس جہان کے ناپائیدار ہونے کی دلیل ہے۔

تیسرے انسان کی پروردگارِ عالم کی طرف حرکتِ مستمر مسئلہ معاد و قیامت کی نشانی ہے جیسا کہ گزشتہ آیات میں آیا تھا (یا ایھا الانسان انک کادح الیٰ ربک کدحًا فملاقیہ)

اس کے بعد گزشتہ مباحث سے ایک نتیجہ کلی اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایمان کیوں نہیں لاتے" (فما لھم لا یؤمنون)، اس کے باوجود کہ حق کے دلائل واضح و آشکار ہیں، توحید و خداشناسی کے بھی اور معاد و قیامت کے بھی۔

آیاتِ آفاقی بھی جو رات دن کی خلقت اور چاند سورج، نور و ظلمت، طلوع و غروب، آفتاب و شفق، رات کی روشنی اور رات کی روشنی کے تکامل میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور آیات انفسی بھی — اس لمحے سے لے کر جب انسان کا نطفہ رحم میں قرار پاتا ہے اور یکے بعد دیگرے مختلف مراحل طے کرتا ہے یہاں تک کہ عالمِ جنین میں اپنے اوج کمال کو پہنچتا ہے، اس کے بعد ولادت کے لمحے سے لے کر موت تک دوسرے مراحل طے کرتا ہے، تو ان واضح نشانیوں کے باوجود نوع بشر ایمان کیوں نہیں لاتی۔

اس کے بعد کتاب تکوین سے کتاب حق کی طرف رُخ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ خضوع اختیار کیوں نہیں کرتے" (واذا قرئ علیھم القراٰن لا یسجدون)۔

قرآن جو آفتاب کے مانند اپنی دلیل آپ ہے، نورِ اعجاز اس کے مختلف پہلوؤں سے عیاں ہے، پھر اس کے مضامین و مشمولات یہ سب اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اسے وحی کے سرچشمہ سے لیا گیا ہے۔

قرآن کے بارے میں ہر غیر جانبدار یہ جانتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ قرآن کسی انسان کے دماغ کی تخلیق ہو۔ پھر انسان بھی ایسا جس نے کبھی کوئی سبق نہ پڑھا ہو اور ایک ایسے ماحول میں اس نے زندگی بسر کی ہو جو خرافات و ظلمات سے پُر ہو۔ یہاں سجدہ سے مراد خضوع تسلیم اور اطاعت ہے[1]

اور وہ مشہور سجدہ جس میں پیشانی کو زمین پر رکھتے ہیں، اس مفہوم کلی کا ایک مصداق ہے۔ اور شاید اسی بنا پر بعض روایات میں آیا ہے کہ جب پیغمبرؐ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی تو سجدہ کیا۔

البتہ فقہائے اہلبیت کے مشہور فتوے کے مطابق یہ سجدہ قرآن کے مستحب سجدوں میں سے ہے اور اہل تسنن کے چاروں مذاہب اس آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ کرنا واجب سمجھتے ہیں، سوائے امام مالک کے جن کا نظریہ ہے کہ سورہ کے ختم ہونے کے بعد سجدہ کرنا چاہیئے[2]

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "بلکہ کفار ہمیشہ آیاتِ الٰہی اور معاد و قیامت کی تکذیب کرتے ہیں" (بل الذین کفروا یکذبون)۔ یہاں فعل مضارع کا استعمال جو عام طور پر استمرار کے لیے ہوتا ہے، ان معانی کا گواہ ہے کہ وہ اپنی تکذیب پر مُصر تھے اور یہ ایسا اصرار تھا جو محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے تھا۔ ان کی تکذیب ایسی نہیں تھی کہ انہیں اس کے لیے دلیلیں نہیں مل سکی تھیں، بلکہ تعصب، اندھی تقلید، مادی منفعتوں کی حفاظت اور شیطانی خواہشات کی تسکین کے لیے تھی۔

اس کے بعد تہدید آمیز لہجے میں فرماتا ہے: "خدا اسے اچھی طرح جانتا ہے جسے وہ اپنے دل کے اندر پنہاں رکھتے ہیں" (واللہ اعلم بما یوعون)۔ خدا ان کی نیتوں، مقاصد اور ایسی ترغیبات سے، جو مسلسل تکذیبوں کا سبب بنتی ہیں، باخبر ہے۔ وہ چاہے کتنی ہی پردہ پوشی کیوں نہ کریں، انجام کار انہیں

---

[1] ان معانی کے شواہد میں سے گزشتہ اور آئندہ آیات کی شہادت کے علاوہ ایک یہ ہے کہ سجدہ جس کے معنی تلاوتِ قرآن کے وقت زمین پر پیشانی رکھنا ہے سوائے چند آیات کے نہ واجب ہے نہ مستحب، اس لیے یہ جو کہہ رہا ہے کہ قراءتِ قرآن کے وقت وہ سجدہ کیوں نہیں کرتے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سجدہ سے مراد سارے قرآن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔

[2] روح البیان، جلد ۱ ص ۱۳۸۲۔

اس کی سزا ملے گی۔

"یوعون" "وعاء" کے مادہ سے ظرف اور برتن کے معنی میں ہے، جیسا کہ حضرت علیؑ کی مشہور عبارت سے نہج البلاغہ میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(ان هذه القلوب اوعية فخيرها اوعاها) یہ دل ظروف ہیں اور ان میں سے بہترین دل وہی ہے جس کی حفاظت اور ظرفیت زیادہ ہو۔

بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "پس انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے" (فبشرهم بعذاب اليم)۔ بشارت کی تعبیر جو عام طور پر خوشخبری کے لیے استعمال ہوتی ہے، یہاں ایک قسم کے طعن اور سرزنش کے طور پر ہے۔

درحقیقت وہ اس طرح مومنین کو جنت کی وسیع نعمتوں کی بشارت دیتا ہے تاکہ تکذیب کرنے والے دوزخی حسرت واندوہ میں ڈوب جائیں۔ اس سورہ کی آخری آیت میں ایک استثناء کی شکل میں ایک مرتبہ پھر نیک عمل مومنین کی سرنوشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح انجام دیئے، ان کے لیے اجر وثواب ہے، ایسا اجر جو ثابت شدہ اور منقطع نہ ہونے والا اور ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ہے" (الا الذين امنوا وعملوا الصالحات لهم اجر غير ممنون)۔

"ممنون" "من" کے مادہ سے نقصان وانقطاع کے معنی میں آیا ہے اور منت کے معنوں میں بھی۔ (لفظ منون جو موت کے معنوں میں ہے وہ بھی اسی مادہ سے ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب معانی یہاں جمع ہوں، اس لیے کہ آخرت کی نعمتیں دنیاوی نعمتوں کے برعکس، جو ناپائیدار اور نقصان پذیر بھی ہیں اور عام طور پر غیر مطلوب عوارض کی آمیزش رکھتی ہیں، کسی قسم کی منت، نقصان، فنا اور غیر مطلوب عوارض نہیں رکھتیں۔ وہ جاودانی ہیں، نقصان ناپذیر ہیں اور ہر قسم کے نامناسب امور اور منت واحسان سے مبرا ہیں۔ یہ استثناء متصل ہے یا منقطع، مفسرین کے درمیان اس میں اختلاف ہے۔

بعض نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ استثنائے منقطع ہے یعنی کفار کے حالات کی تشریح جو گزشتہ آیات میں تھی اس کو چھوڑ کر مومنین کے جاودانی اجر کی بات کرتا ہے لیکن زیادہ مناسب یہی ہے کہ استثناء متصل ہو اور مقصد یہ ہو کہ کفار کے سامنے بازگشت کی راہ کھولے اور انہیں یہ بتائے کہ جو لوگ توبہ کر کے ایمان لے آئیں اور اعمالِ صالح انجام دیں، ان سے عذابِ دائمی اٹھا لیا جائے گا اور انہیں ایسا اجر دیا جائے گا جو دائمی ہوگا اور جس میں نقصان کا کوئی پہلو نہ ہوگا۔

ایک نکتہ

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس سورہ کی آخری آیات سے پہلے تو اختیار اور ارادہ کی آزادی کی

اصل کا فائدہ اٹھاتے ہیں، اس لیے کہ مجبور افراد کے بارے میں ترکِ سجدہ اور ترکِ ایمان پر ملامت کرنا خداوند حکیم کے لیے ایک امر قبیح ہے، اور وہ جو یہ فرماتا ہے: (فمالھم لا یؤمنون واذا قرئ علیھم القرآن لا یسجدون) مسئلہ اختیار پر واضح دلیل ہے۔ اور پھر ترکِ سجدہ پر ملامت کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ کفار جس طرح اصولِ دین کے مکلف ہیں اسی طرح فروعِ دین کے بھی مکلف ہیں۔ (یہ گفتگو اس صورت میں ہے جب لفظِ سجدہ مذکورہ بالا آیت میں نماز والے سجدے کے معنی میں ہو، یا کم از کم وسیع معانی رکھتا ہو جس میں سجدۂ نماز بھی شامل ہے)۔

خداوندا! جس دن سب لوگ تیری دادگاہِ عدل میں حاضر ہوں گے ہم پر حساب آسان کر دیجو۔

پروردگارا! اس راہ میں جہاں تمام بندے تیری طرف سفر کرتے ہیں صراطِ مستقیم طے کرنے میں ہماری مدد فرما۔

بارالٰہا! ہم تیرے قرآن کریم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوتے ہیں، ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ انشقاق

سورۂ بروج

یہ سورہ مکّے میں نازل ہوا
اس میں ۲۲ آیتیں ہیں

سورہ بروج کے مضامین اور اس کی فضیلت

ابتدائے بعثت کے زمانے میں مومنین (مکہ میں) بہت سخت رنج و تکلیف اور دباؤ کی حالت میں تھے اور ہمیشہ دشمنوں کی طرف سے جسمانی اور روحانی اذیتوں میں گرفتار رہتے تھے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ راہِ ایمان کو خیرباد کہہ دیں۔

اس سلسلہ میں ایک گروہ نے صورتِ حال کا مقابلہ کیا لیکن بعض کمزور افراد دشمنوں کے مقابلہ میں شکستہ دل ہو کر راہِ ایمان سے پلٹ گئے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکی ہے یوں نظر آتا ہے کہ اس کا مقصدِ اصلی مومنین کے قلب و روح میں تقویت پیدا کرنا ہے۔ یہ سورہ ان مومنین کو پامردی اور استقامت کا شوق دلاتا ہے۔

اس صورتِ حال کے حوالے سے پروردگارِ عالم اس سورہ میں اصحاب اخدود کے واقعہ کو نقل کرتا ہے: وہی لوگ جنہوں نے خندق کھودی، اس میں بہت زیادہ آگ جلائی اور مومنین کو اس آگ میں جلانے کی دھمکی دی اور ایک گروہ کو اس آگ میں جلایا لیکن انہوں نے راہِ ایمان کو خیرباد نہیں کہا۔ پھر اس سورہ کے دوسرے حصہ میں ان کافروں کو تنبیہ کرتا ہے جنہوں نے مومنین پر دباؤ ڈال رکھا تھا، اور انہیں جہنم کے جلانے والے عذاب کی خبر دیتا ہے جبکہ جنت کے پُرنعمت باغات کی مومنین کو بشارت دیتا ہے۔

بعد والے حصہ میں انہیں گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور فرعون و ثمود اور دیگر ظالم اقوام کی داستانیں ان کی نگاہوں کے سامنے مجسم کر کے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ عذابِ الٰہی نے انہیں کس طرح نابود کر دیا، تاکہ کفارِ مکہ جو ان کی نسبت بہت کمزور تھے اپنا اندازہ لگا لیں۔ نیز یہ کہ یہ صورتِ حال پیغمبرؐ اور مومنین کے دلوں کی تسلی کا سبب بھی ہو۔

اس سورہ کے آخری حصہ میں قرآن مجید کی عظمت اور وحیِ الٰہی کی سب سے زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اسی مفہوم پر سورہ کو ختم کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ سورہ مومنین کو ظالموں کے مقابلہ میں پامردی، استقامت اور صبر و شکیبائی کا درس دیتا ہے۔ اس کی آیتوں کے اندر نصرتِ الٰہی کا وعدہ بھی چھپا ہوا ہے۔ اس سورہ کا جو بروج نام رکھا گیا ہے وہ اس لفظ کی وجہ سے ہے جو اس کی پہلی آیت میں آیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ:

(من قرأ هٰذه السورة اعطاه الله من الاجر بعدد كل من اجتمع فی جمعة وكل من اجتمع فی يوم عرفة عشر حسنات وقرائها تنجی من المخاوف والشدائد)

"جو شخص اس سورہ کو پڑھے تو خداوندِ عالم اسے ان افراد کی تعداد سے جو نمازِ جمعہ میں جمع

ہوتے ہیں اور ان کی تعداد سے جو یوم عرفہ میں عرفات میں جمع ہوتے ہیں، دس گنا حسنات دیتا ہے اور اس کی تلاوت انسان کو خوف و ہراس اور مصائب سے رہائی بخشتی ہے[1]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "شاہد و مشہود" کی ایک تفسیر روزِ جمعہ اور روزِ عرفہ ہے، نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ سورہ مصیبتوں کے مقابلہ میں مومنین کی مقاومت کو بیان کرتی ہے لہٰذا اس اجر و ثواب کی مناسبت سورہ کے مضامین سے واضح ہو جاتی ہے اور حتمی طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام اجر و ثواب ان لوگوں کے لیے ہے جو اسے پڑھیں، اس میں غور و فکر کریں اور پھر اس پر عمل کریں۔

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۴۵۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ

(۲) وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ

(۳) وَشَاہِدٍ وَّمَشۡہُوۡدٍ ؕ

(۴) قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ

(۵) النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ

(۶) اِذۡ ہُمۡ عَلَیۡہَا قُعُوۡدٌ ۙ

(۷) وَّہُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُہُوۡدٌ ؕ

(۸) وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ

(۹) الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ؕ

ترجمہ

(۱) قسم ہے آسمان کی جس کے بہت سے بروج ہیں۔

(۲) اور قسم ہے اس موعود دن کی۔

(۳) اور شاہد و مشہود کی (شاہد سے مراد پیغمبرؐ اور اعمال کے گواہ ہیں اور مشہود سے مراد اعمال ہیں)۔

۴ موت اور عذاب ہو ایذا دینے والے اصحابِ اخدود پر (آگ کی خندق)۔

۵ شعلہ اور آگ سے پُر خندقیں۔

۶ جس وقت وہ اس کے کنارے پر بیٹھے تھے۔

۷ اور جو کچھ وہ اس کی نسبت انجام دیتے تھے (سرد مہری سے) اسے دیکھ رہے تھے۔

۸ انہیں کوئی اعتراض ان (مومنین) پر نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ خداوند عزیز وحمید پر ایمان لائے تھے۔

۹ وہی خدا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

تفسیر

مومنین انسانوں کو جلانے والی بھٹیوں کے سامنے

ہمیں معلوم ہے کہ مکّے کے مسلمان ابتدا میں سخت فشار اور دباؤ میں تھے اور دشمن ان کے لیے ہر قسم کی تکلیف کو جائز سمجھتے تھے اور جیسا کہ ہم نے سورہ کے مضامین کی تشریح میں کہا ہے اس سورہ کے نزول کا مقصد ان ایذا پہنچانے والے کفار کو خبردار کرنا ہے کہ وہ ماضی کی اپنے سے مشابہت رکھنے والی اقوام کے لوگوں کی سرنوشت کو پیشِ نظر رکھیں، اور ساتھ ہی یہ سورہ موجودہ مومنین کی تسلی، دلداری اور تقویتِ روحانی کا باعث اور تمام مسلمانوں کے لیے ایک درس بھی ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"قسم ہے آسمان کی جس کے ثبت سے بروج ہیں" (والسماء ذات البروج) "بروج" "بُرج" کی جمع ہے جس کے معنی اصل میں قصر اور محل کے ہیں۔

بعض مفسرین نے اسے ظاہر و آشکار شے کے معنوں میں لیا ہے اور بلند و بالا عمارات کو اس نام سے منسوب کرنے کا سبب ان کے ظاہر ہونے کو قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر شہر کے اطراف کی دیوار کے ایک خاص حصّہ کو اور لشکر کے جمع ہونے کی جگہ کو جو نمایاں ہوتی ہے، برج کا نام دیا جاتا ہے اور جب عورت اپنی زینت کا

اظہار کرے تو اسے تبرجت المراۃ کہا جاتا ہے [1]

آسمانی برج یا تو آسمان کے درخشاں اور روشن ستاروں کے معنی میں ہے یا آسمانی شکلوں اور صورتوں کے معنی میں ہے یعنی ستاروں کا ایسا مجموعہ جو ہماری نظروں کے اعتبار سے موجوداتِ زمین میں سے کسی ایک سے مشابہت رکھتا ہے اور بارہ برج بارہ فلکی شکلیں ہیں۔ سورج اپنے سالانہ سفر میں سے ہر ماہ ان میں سے ایک برج کی حدود میں گزارتا ہے، البتہ سورج حرکت نہیں کرتا۔ زمین اس کے گرد گردش کرتی ہے لیکن نظر ایسا آتا ہے کہ سورج حرکت کر رہا ہے اور ان فلکی صورتوں میں سے کسی ایک کے سامنے آگیا ہے [2]

ان معانی میں سے جو بھی ہوں وہ عظیم ہیں اور پھر ان کی عظمت بھی ایسی ہے جو غالباً اس زمانے میں عربوں پر واضح نہیں تھی لیکن موجودہ زمانے میں ہمارے لیے جانی پہچانی ہے۔ اگرچہ زیادہ یہی نظر آتا ہے کہ مراد وہی آسمانی ستارے ہوں۔ ایک حدیث میں منقول بھی ہے کہ لوگوں نے پیغمبرِ اسلامؐ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس سے مراد ستارے ہیں [3]

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد ہوا ہے: "اور قسم ہے اس موعود دن کی" (قیامت کا دن جس کا وعدہ کیا گیا ہے)۔ (والیوم الموعود)۔ وہی دن جس کی تمام انبیاء اور پیغمبروں نے خبر دی ہے اور کئی سو قرآنی آیتیں جس کے ثبوت کے طور پر ہیں، وہی دن جو اولین و آخرین کی وعدہ گاہ ہے اور وہی دن جس میں سب کے حساب کا فیصلہ ہونا ہے۔

تیسری اور چوتھی قسم میں فرماتا ہے: "اور قسم ہے شاہد و مشہود کی" (وشاھد و مشھود)۔ یہ کہ شاہد و مشہود سے کیا مراد ہے، اس کی علماء نے بہت سی تفسیریں کی ہیں جو تعداد میں تیس سے زیادہ ہیں، جن میں سے اہم ترین درج ذیل ہیں:

۱۔ شاہد سے مراد پیغمبرِ اسلامؐ کی ذاتِ گرامی ہے جیسا کہ قرآن مجید کہتا ہے: (یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدًا و مبشرًا و نذیرًا) "اے پیغمبر ہم نے تجھے شاہد، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کی حیثیت سے بھیجا ہے" (احزاب۔ ۴۵)۔ اور مشہود سے مراد قیامت کا دن ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: (ذالک یوم مجموع لہ الناس و ذالک یوم مشھود) قیامت کا دن وہ دن ہے جس میں تمام لوگ جمع ہوں گے وہ مکمل طور پر "مشہود"

---

[1] بعض محققین کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ فارسی لفظ "برز" سے لیا گیا ہے جو بلندی، بزرگی اور شکوہ کے معنی رکھتا ہے، برہان قاطع اور اس کے حاشیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] یہ بارہ صورتیں عبارت ہیں حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت سے جو اسی ترتیب سے گوسفند، بیل، دو بچے جو اخروٹ کھیل رہے ہیں، کیکڑا، شیر، خوشہ، ترازو، بچھو، کمان، بکری، ڈول اور مچھلی کی شکلیں ہیں۔

[3] درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۳۱۔

اور آشکار دن ہے۔ (ہود۔ ۱۰۳)۔

۲۔ شاہد سے مراد انسان کے اعمال کے گواہ ہیں مثلاً اس کے جسم کے اعضاء وجوارح جیسا کہ سورہ نور کی آیت ۲۴ میں ہمیں ملتا ہے (یوم تشھد علیھم السنتھم وایدیھم وارجلھم بما کانوا یعملون) وہ دن جس میں ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ لہٰذا مشہود سے مراد انسان اور اس کے اعمال ہیں۔

۳۔ شاہد کے معنی جمعہ کا دن ہے جو نماز کے بہت ہی اہم مراسم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے اجتماع کا شاہد ہے اور "مشہود" عرفہ کا دن ہے کہ بیت اللہ الحرام کے زائرین اس دن کے شاہد وناظر ہیں۔ ایک روایت میں پیغمبر اسلامؐ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے یہ تفسیر منقول ہے [1]

۴۔ شاہد عیدِ قربان کا دن ہے اور "مشہود" عرفہ کا دن ہے (جو عیدِ قربان سے ایک دن پہلے ہے)۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص مسجدِ نبوی میں داخل ہوا اس نے کسی کو دیکھا کہ بیٹھا ہوا ہے اور رسول اللہؐ سے حدیث نقل کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اس شخص سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو اس نے کہا، شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے اور مشہود عرفہ کا دن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں وہاں سے ہٹ کر ایک دوسرے شخص کے پاس گیا وہ بھی رسول اللہؐ سے حدیث نقل کر رہا تھا تو میں نے اس آیت کی تفسیر اس سے بھی پوچھی تو اس نے کہا کہ شاہد جمعہ کا دن اور مشہود عید قربان کا دن ہے۔ اس سے ہٹ کر میں ایک نوجوان کے پاس گیا، جو خوبصورت تھا اور رسولِ خدا ہی سے حدیث بیان کر رہا تھا۔ میں نے کہا اس آیت کی تفسیر کے بارے میں مجھے بتا، تو اس نے کہا: "شاہد محمدؐ ہیں اور مشہود قیامت کا دن ہے۔ کیا تو نے سنا نہیں کہ خدا کہتا ہے:"

(یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدًا ومبشرًا ونذیرًا) اور یہ بھی نہیں سنا کہ خدا کہتا ہے: (ذالک یوم مجموع لہ الناس وذالک یوم مشھود)

میں نے سوال کیا کہ پہلا شخص کون تھا۔ لوگوں نے بتایا ابن عباس، دوسرے کے متعلق پوچھا تو بتایا عبداللہ بن عمر اور تیسرے کے متعلق پوچھا تو بتایا کہ وہ حسین بن علی علیہ السلام تھے [2]

۵۔ شاہد سے مراد راتیں اور دن ہیں اور مشہود سے مراد اولادِ آدم جن کے اعمال کی وہ گواہی دیں گے جیسا کہ امام زین العابدینؑ کی صبح وشام کی دعا میں ہم پڑھتے ہیں (ھذا یوم حادث جدید وھو علینا شاھد عتید ان احسنّا ودعنا بحمد وان اسأنا فارقنا بذم) یہ نیا دن ہے جو ہمارے اعمال کا شاہد ہے اگر ہم نیکی کریں تو

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۶۶۔

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۴۳۔ یہی مضمون ابوالفتوح رازی اور طبرسی نے بھی اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے۔

حمد و سپاس کے ساتھ ہم کو الوداع کہے گا اور اگر برائی کریں تو مذمت کرتا ہوا ہم سے جدا ہوگا [1]

۶۔ شاہد سے مراد ملائکہ اور مشہود سے مراد قرآن ہے۔

۷۔ شاہد سے مراد حجر الاسود اور مشہود سے مراد حجاج حرم ہیں جو اس کے پاس آتے ہیں اور اس پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

۸۔ شاہد مخلوق اور مشہود حق تعالیٰ ہے۔

۹۔ شاہد سے مراد امت اسلامی اور مشہود سے مراد دوسری امتیں ہیں جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں آیا ہے (لتکونوا شہداء علی الناس) مقصد یہ ہے کہ تم دوسری امتوں پر گواہ بنو۔

۱۰۔ شاہد پیغمبرِ اسلام ہیں اور مشہود باقی تمام انبیاء ہیں۔ سورہ نساء کی آیت ۴۱ میں گواہی ہے (وجئنا بک علی ھٰؤلاء شہیدًا) اس دن ہم تجھے دوسرے انبیاء کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

۱۱۔ شاہد پیغمبرؐ اور مشہود حضرت علیؑ ہیں۔

البتہ اس آیت کی گزشتہ آیتوں سے مناسبت اس کو قبول کرتی ہے کہ روزِ قیامت کے شہود اور گواہوں کی طرف اشارہ ہو عام اس سے کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ ہوں یا باقی انبیا اپنی امتوں کے مقابلہ میں، یا ملائکہ ہوں یا بدنِ انسانی کے اعضاء و جوارح، یا رات دن، یا کچھ امور اور مشہود سے مراد انسان ہوں یا ان کے اعمال۔

اسی طرح بہت سی تفسیریں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گی اور ایک مجموعی مفہوم میں ان کا خلاصہ ہو جائے گا، لیکن روزِ جمعہ، روزِ عرفہ اور روزِ عید جیسی تفسیریں ان معانی سے الگ ہیں، اگرچہ وہ بھی روزِ محشر کے مشہود اور انسانوں کے اعمال کے گواہ ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک ایسا پُر ہجوم دن ہے جو اس دنیا میں قیامت کا ایک منظر شمار ہوتا ہے۔

اس بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ ان تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ شاہد و مشہود کے وسیع مفہوم میں یہ سب شامل ہوں۔ اور یہ قرآن کی عظمت کی ایک نشانی ہے کہ اس میں اس قسم کے وسیع مفاہیم ہیں جو مختلف اور کافی تفسیروں کو اپنے اندر جگہ دیتے ہیں، اس لیے کہ شاہد ہر قسم کے گواہ کو کہتے ہیں اور مشہود ہر اس چیز کو جس کی گواہی دی جائے۔ پھر یہ دونوں نکرہ کی شکل میں بیان ہوئے ہیں جو اس شاہد اور مشہود کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جو اوپر والی تفسیروں میں منعکس ہوا ہے۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ایک لطیف و عمدہ تعلق ان چار حصوں کے درمیان اور اس مطلب کے درمیان، جس کی قسم کھائی گئی ہے، موجود ہے۔ آسمان، درخشاں ستارے اور اس کے موزوں برج سب کے سب نظم و حساب کی نشانی ہیں اور یوم موعود حساب و کتاب کا واضح منظر ہے، شاہد و مشہود بھی اسی حساب کی نکتہ رسی کا ذریعہ ہیں۔

---

[1] صحیفہ سجادیہ، دعائے ششم۔

پھر یہ تمام قسمیں اس لیے ہیں کہ ایذا پہنچانے والے ظالموں کو خبردار کرے کہ سچے مومنین کے ساتھ کیے جانے والے ان کے تمام مظالم ثبت وضبط ہیں اور یوم موعود کے لیے انہیں محفوظ کیا گیا ہے اور وہ مشہود جنہوں نے تمہارے جسم کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے، عام اس سے کہ وہ فرشتے ہوں یا تمہارے جسم کے اعضاء وجوارح یا رات دن یا اور اسی قسم کی اشیاء، وہ سب ان کاموں کو نظر میں رکھے ہوئے ہیں اور قیامت میں وہ گواہی دیں گے[1]

اس لیے ان قسموں کے بعد فرماتا ہے: "موت اور عذاب تشدد کرنے والوں پر ہو" (قتل اصحاب الاخدود)۔ "وہی خندقیں جو آگ اور لکڑیوں سے پُر تھیں جن میں سے بڑے بڑے شعلے نکل رہے تھے" (النار ذات الوقود)۔ "جس وقت وہ اس آگ کی خندق کے پاس بیٹھے ہوئے تھے (سرد مہری سے) (اذھم علیھا قعود)۔ "اور جو کچھ وہ مومنین کے بارے میں انجام دے رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے" (وھم علیٰ ما یفعلون بالمؤمنین شھود)۔

"اخدود" مفردات میں راغب کے بقول زمین وسیع وعمیق اور کھلے ہوئے شگاف کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں بڑی بڑی خندقوں اور گڑھوں کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع "اخادید" ہے اور اصل انسان کے خد سے لی گئی ہے جو انسان کی ناک کے دونوں طرف دائیں اور بائیں دو دھنسی ہوئی جگہوں کے معنی میں ہے۔ (رخسار) اور گریہ کرتے وقت اس پر آنسو جاری ہوتے ہیں۔

اس کے بعد بطور کنایہ اس گڑھے پر اس کا اطلاق ہوا ہے جو زمین پر ظاہر ہو (پھر ایک حقیقی معنی کی شکل اختیار کر گیا ہے)۔ یہ کہ یہ اذیت دینے والا گروہ کون تھا اور کس زمانے میں تھا مفسرین اور ارباب تاریخ اس سلسلہ میں مختلف نظریات کے حامل ہیں جن کی تشریح انشاء اللہ آیات کے ذیل میں نکات کی بحث میں آئے گی۔ لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ انہوں نے آگ کی بہت بڑی بڑی خندقیں بنا رکھی تھیں۔

وہ مومنین کو مجبور کرتے تھے کہ اپنے ایمان سے دستبردار ہو جائیں۔ مومنین جس وقت ان کے سامنے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو وہ انہیں جلانے والی ان بھٹیوں میں ڈال کر آگ لگا دیتے تھے۔

"وقود" اصل میں اس مادہ کے معنی میں ہے جس سے وہ آگ لگاتے تھے (لکڑیاں وغیرہ) اور ذات الوقود کی تعبیر اگرچہ ایندھن کی محتاج ہوتی ہے لیکن یہاں اس سے آگ بھڑکانے والے مواد کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، جسے وہ استعمال کرتے تھے اور جس کی آگ طبعی طور پر بہت زیادہ اور تیز ہوتی تھی۔

---

[1] اس بنا پر جواب قسم یہاں محذوف ہے اور قتل اصحاب الاخدود کا جملہ یا ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات اس پر دلالت کرتے ہیں اور تقدیر میں اس طرح ہے اقسم بھٰذہ الامور ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات معذبون ملعونون کما لعن اصحاب الاخدود۔ میں ان امور کی قسم کھاتا ہوں جن لوگوں نے مومنین مرد وعورت کو مصیبت میں ڈالا وہ ملعون ومعذب ہیں جس طرح خندق والے معذب تھے۔

یہی وجہ ہے، کہ جسے بعض مفسرین نے سمجھا ہے کہ وقود کے دو معنی ہیں، ایک ایندھن اور دوسرے شعلہ اور انہوں نے افسوس کیا ہے کہ مفسرین و مترجمین نے اس نکتہ کی طرف توجہ کیوں نہیں کی۔

اس آیت (اذ ھم علیھا قعود) اور اس کے بعد کی دوسری آیت سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ انتہائی سرد مہری سے بیٹھا ہوا تھا اور اس تشدد کو دیکھ رہا تھا اور لذت حاصل کر رہا تھا جو خود ان کی انتہائی قساوت اور سخت دل ہونے کی نشانی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ گروہ مذہب حق سے مومنین کو روگرداں کرنے پر مامور تھا۔ بعض نے انہیں دو گروہوں پر مشتمل سمجھا ہے، ایک اذیت دینے والا اور دوسرا تماشہ دیکھنے والا۔ اور چونکہ دیکھنے والے تشدد کرنے والوں کے اعمال سے راضی تھے لہٰذا اس فعل کی ان سب کی طرف نسبت دی گئی ہے اور یہ فطری بات ہے کہ اس قسم کے کام میں ایک گروہ ہمیشہ کام کرنے والا ہوتا ہے اور ایک دیکھنے والا۔

علاوہ ازیں ان کے سرغنے عام طور پر حکم دیتے ہیں اور کارندے نچلے طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک گروہ بیٹھا ہوا تھا اور تشدد کے عمال کی نگرانی کر رہا تھا کہ وہ متعلقہ کام سے کسی قسم کی روگردانی نہ کریں اور بادشاہ کے سامنے گواہی دیں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا ہے۔ اس گروہ کی تشکیل ان مختلف گروہوں سے بھی بعید نظر نہیں آتی۔ لہٰذا ان تمام تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بہرحال یفعلون کا جملہ فعل مضارع کی شکل میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عمل ایک مدت تک استمرار رکھتا تھا اور کوئی یک لخت ہونے والا حادثہ نہیں تھا۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ تشدد کرنے والے ان مومنین پر سوائے اس کے اور کوئی اعتراض نہیں رکھتے تھے کہ وہ خداوند عزیز و حکیم پر ایمان لاتے ہوئے تھے" (وما نقموا منھم الا ان یؤمنوا باللہ العزیز الحمید)۔

جی ہاں! ان کا جرم اور گناہ صرف خدائے واحد و یگانہ و یکتا پر ایمان تھا۔ خداوند قادر جو ہر قسم کی ستائش کے لائق اور ہر قسم کے کمال کا جامع ہے، تو کیا اس قسم کے خدا پر ایمان لانا جرم و گناہ ہے یا ہر قسم کے شعور و شائستگی سے محروم بتوں پر ایمان رکھنا کوئی گناہ یا جرم ہے؟

"نقموا"، "نقم" (بروزن قلم) کے مادہ سے کسی چیز کا انکار کرنے یا اسے عیب لگانے کے معنی میں ہے۔ زبانی طور پر عیب لگانا یا کسی قسم کی عملی طور پر سزا دینا، یہ دونوں پہلو اس کے معنی میں داخل ہیں۔ اسی مادہ سے انتقام ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ اس قسم کا کام ایک بڑے اور واضح گناہ کے مقابلہ میں سرانجام پاتا ہے، نہ کہ پروردگار عالم پر ایمان لانے کے سلسلہ میں۔

اس قسم کے اقدام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ قوم جو یہ کام کر رہی تھی اس کا تمدن نہایت پست اور بگڑا ہوا تھا جبھی تو ان کے نزدیک ایک افتخار و اعزاز والا کام عظیم ترین جرم و گناہ تھا۔

بہرحال یہ چیز سورہ مائدہ کی آیت ۵۹ میں آئی ہے کہ جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے اور

فرعون کی طرف سے تشدد اور قتل کی دھمکی کے بعد اس سے کہا کہ (ھل تنقمون منا الا ان امنا باللہ) تُو ہم سے صرف اس وجہ سے انتقام لے رہا ہے کہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں۔

"عزیز" طاقتور اور شکست نہ کھانے والے اور "حمید" ہر قسم کی تعریف و توصیف کے قابل اور ہر قسم کے کمال کے حامل کی تعبیر حقیقت میں ان کے جرائم کا جواب ہے اور ان کے برخلاف ایک دلیل ہے یعنی کیا اس قسم کے خدا پر ایمان لانا جرم و گناہ ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہے کہ یہ بات تشدد کرنے والے کے لیے پورے دورِ تاریخ میں ایک قسم کی تہدید و تنبیہ بھی ہے کہ خداوند عزیز و حمید ان کی کمین گاہ میں ہے۔ اس کے بعد وہ عظیم معبود اپنے دو اور اوصاف کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"وہی خدا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے لیے ہے اور جو ہر چیز کا گواہ ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے (الذی لہ ملک السماوات والارض واللہ علی کل شیء شہید)۔

حقیقت میں یہ چار اوصاف ایسے ہیں جو عبودیت کے لیے قابلیت کو مسلّم کر دیتے ہیں اور یہ بتا دیتے ہیں کہ خدا وہ ہے جو قادر و توانا ہے ہر قسم کے کمال کا حامل ہے وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔ یہ چیز مومنین کے لیے بشارت بھی ہے کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں وہ ان کے صبر و استقامت کو دیکھتا ہے اور ان کے ایثار و قربانی اور فداکاری کا اسے علم ہے۔

ایسی صورتِ حال ان کو قوت، توانائی اور احساسِ نشاط عطا کرتی ہے دوسرے یہ ان کے دشمنوں کے لیے تہدید اور دھمکی ہے کہ اگر خدا ان کے کام میں مانع نہیں ہوتا تو یہ اس کی کمزوری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ آزمائش اور امتحان کی وجہ سے ہے اور انجام کار یہ ظالم اپنے گناہ کے نتیجے میں دردناک عذاب کا تلخ مزہ چکھیں گے۔

چند نکات

۱۔ اصحابِ اُخدود کون لوگ تھے؟

ہم بتا چکے ہیں اُخدود عظیم گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے اور یہاں بڑی بڑی خندقیں مراد ہیں جو آگ سے پُر تھیں تاکہ تشدد کرنے والے اس میں مومنین کو پھینک کر جلائیں۔ یہ حقیقت کہ یہ واقعہ کس قوم سے متعلق ہے اور کس وقت معرضِ وجود میں آیا اور کیا یہ ایک خاص معین و مقرر واقعہ تھا یا دنیا کے مختلف علاقوں کے اسی قسم کے متعدد واقعات کی طرف اشارہ ہے،

مفسرین و مورخین کے درمیان اس موضوع پر اختلاف ہے سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ سرزمین یمن کے قبیلہ حمیر[1] کے ذونواس نامی بادشاہ کے دور کا ہے۔

---

[1] حمیر یمن کے مشہور قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ذونواس جو حمیر نامی قبیلہ سے متعلق تھا یہودی ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پورا قبیلہ بھی یہودی ہوگیا۔ اس نے اپنا نام یوسف رکھا۔ ایک عرصہ تک یہی صورت حال رہی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ کسی نے اسے خبر دی کہ سرزمین نجران (یمن کا شمالی حصہ) میں ابھی تک ایک گروہ نصرانی مذہب پر قائم ہے۔ ذونواس کے ہم مسلک لوگوں نے اُسے اس بات پر ابھارا کہ اہل نجران کو دین یہود کے قبول کرنے پر مجبور کرے۔

وہ نجران کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے وہاں کے رہنے والوں کو اکٹھا کیا اور دین یہود ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے اصرار کیا کہ وہ اس دین کو قبول کریں۔ لیکن انہوں نے انکار کیا اور شہادت قبول کرنے پر تیار ہوگئے۔ انہوں نے اپنے دین کو خیرباد نہ کہا۔ ذونواس کے حکم پر اس کے حامیوں نے ایک بہت بڑی خندق کھودی اس میں لکڑیاں ڈالیں اور آگ لگادی۔ ذونواس اور اس کے ساتھیوں نے ایک گروہ کو پکڑ کر اس آگ میں زندہ جلایا اور ایک گروہ کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ اس طرح آگ میں جلنے والوں اور مقتولین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی [1]

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سلسلۂ دار و گیر سے بچ کر نصاریٰ بنی نجران کا ایک آدمی قیصر روم کے دربار میں جا پہنچا۔ اس نے وہاں ذونواس کی شکایت کی اور اس سے مدد طلب کی۔ قیصر نے کہا تمہاری سرزمین مجھ سے دور ہے۔ بادشاہ حبشہ کو خط لکھتا ہوں جو عیسائی ہے اور تمہارا ہمسایہ ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ تمہاری مدد کرے۔

پھر اس نے خط لکھا اور حبشہ کے بادشاہ سے نصاریٰ نجران کے عیسائیوں کے خون کا انتقام لینے کی خواہش کی۔ وہ نجرانی شخص بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس گیا۔ نجاشی اس سے یہ تمام ماجرا سن کر بہت متاثر ہوا اور سرزمین نجران میں شعلہ دین مسیح کے خاموش ہوجانے کا اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے ذونواس سے شہیدوں کے خون کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

اس مقصد کے پیش نظر حبشہ کی فوج یمن کی طرف روانہ ہوئی اور ایک گھمسان کی جنگ کے نتیجے میں اس نے ذونواس کو شکست فاش دی اور ان میں سے بہت سے افراد کو قتل کیا۔ جلد ہی نجران کی حکومت نجاشی کے قبضہ میں آگئی اور نجران حبشہ کا ایک صوبہ بن گیا [2]

بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اس خندق کا طول چالیس ذراع (ہاتھ) تھا اور اس کا عرض بارہ ذراع تھا۔ (ایک ذراع تقریباً آدھا میٹر ہے اور بعض اوقات گز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو تقریباً ایک میٹر ہے)۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ سات گڑھے تھے جن میں سے ہر ایک کی وسعت اتنی ہی تھی جتنی اوپر بیان ہوئی۔ [3]

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم قمی جلد ۲ ص ۴۱۴۔

[2] قصص قرآن بلاغی، ص ۲۸۸۔

[3] تفسیر روح المعانی اور ابوالفتوح رازی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

مندرجہ بالا واقعہ تاریخ و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں درج ہے۔ منجملہ دیگر کتب کے عظیم مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں، ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں، فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں، آلوسی نے روح المعانی میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں زیر بحث آیات کے ذیل میں، اسی طرح ہشام نے اپنی سیرۃ (جلد اوّل ص ۳۵) میں اور ایک دوسری جماعت نے اپنی کتب میں اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔

جو کچھ ہم نے تحریر کیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ تشدد کرنے والے بے رحم افراد آخرکار عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور ان سے اس خونِ ناحق کا انتقام دنیا ہی میں لیا گیا اور عاقبت کا عذاب جہنم ابھی ان کے انتظار میں ہے۔

انسانوں کو جلانے والی یہ بھٹیاں جو یہودیوں کے ہاتھ سے معرضِ وجود میں آئیں، احتمال اس امر کا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں یہ پہلی آدم سوز بھٹیاں تھیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی قسم کی قساوت اور بے رحمی کا خود یہودی بھی شکار ہوئے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت زیادہ لوگ ہٹلر کے حکم سے آدم سوز بھٹیوں میں جلائے گئے اور اس جہان میں بھی عذابِ حریق کا شکار ہوئے۔

علاوہ ازیں ذونواس یہودی، جو اس منحوس اقدام کا بانی تھا، وہ بھی اپنی بداعمالی کے انجام سے نہ بچ سکا۔

جو کچھ اصحابِ اخدود کے بارے میں درج کیا گیا ہے یہ مشہور و معروف نظریات کے مطابق ہے لیکن اس ضمن میں کچھ اور روایات بھی موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اصحابِ اخدود صرف یمن میں ذونواسی ہی کے زمانے میں نہیں تھے۔ بعض مفسرین نے تو ان کے بارے میں دس قول نقل کیے ہیں۔

ایک روایت حضرت امیرالمومنین علیؑ سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ وہ اہلِ کتاب مجوسی تھے جو اپنی کتاب پر عمل کرتے تھے۔ ان کے بادشاہوں میں سے ایک نے اپنی بہن سے مباشرت کی اور خواہش ظاہر کی کہ بہن سے شادی کو جائز قرار دے لیکن لوگوں نے قبول نہیں کیا۔ بادشاہ نے ایسے بہت سے مومنین کو جنہوں نے یہ بات قبول نہیں کی تھی جلتی ہوئی آگ کی خندق میں ڈلوا دیا[1]

یہ فارس کے اصحاب الاخدود کے بارے میں ہے۔ شام کے اصحاب الاخدود کے بارے میں بھی علماء نے لکھا ہے کہ وہاں مومنین رہتے تھے اور آنتیا خوس نے انہیں خندق میں جلوایا تھا[2]

بعض مفسرین نے اس واقعہ کو بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر حضرت دانیالؑ کے اصحاب و انصار کے ساتھ مربوط سمجھا ہے جس کی طرف تورات کی کتاب دانیال میں اشارہ ہوا ہے اور ثعلبی نے بھی اخدود فارسی کو انہی پر منطبق کیا ہے[3]

کچھ بعید نہیں کہ اصحابِ اخدود میں یہ سب کچھ اور ان جیسے دوسرے لوگ شامل ہوں اگرچہ اس کا مشہود و معروف مصداق سرزمینِ یمن کا ذونواس ہی ہے۔

---

[1]، [2]، [3] اعلام قرآن، ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

۲۔ حفظِ ایمان کے سلسلہ میں استقامت

ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں ماضی و حال دونوں میں فداکاری کی بہت درخشاں مثالیں ہیں۔ تاریخ انسانی بہت سے ایسے افراد کا پتہ دیتی ہے جنہوں نے اس راستے میں جام شہادت نوش کیا ہے اور سولی کی رسی اور جلادوں کی تلواروں کو بوسہ دیا ہے اور پروانہ وار تشدد کرنے والوں کی روشن کی ہوئی آگ میں جلے ہیں جن میں سے صرف ایک گروہ کا نام ونشان تاریخ میں محفوظ ہے۔

آسیہ زن فرعون کی داستان ہم نے سنی ہے جو موسیٰ بن عمران پر ایمان لانے کی وجہ سے ان تمام شدائد سے دوچار ہوئی اور جس نے انجام کار اس راہ میں اپنی جان جانِ آفرین کی بارگاہ میں پیش کی۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ خدا نے حبشہ کے لوگوں میں سے ایک پیغمبر ان پر مبعوث کیا۔ وہ لوگ اس پیغمبر کی تکذیب پر آمادہ ہوئے۔ ان کے درمیان جنگ ہوئی۔ آخرکار ان لوگوں نے اس پیغمبر کے اصحاب میں سے ایک گروہ کو قتل کیا اور ایک گروہ کو اس پیغمبر سمیت گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد ایک جگہ آگ تیار کی اور لوگوں کو اس کے قریب بلایا اور کہا جو شخص ہمارے دین پر ہے وہ ایک طرف ہوجائے اور جو اس گروہ کے دین پر ہے وہ اپنے آپ کو آگ میں ڈال دے۔ پیغمبر کے وہ مقید ہمراہی آگ میں کودنے پر ایک دوسرے سے سبقت کرتے تھے۔ اس موقع پر ایک عورت آئی جس کی گود میں ایک مہینے کا بچہ تھا جس وقت عورت نے چاہا کہ اس آگ میں چھلانگ لگائے تو شفقتِ مادری جوش میں آئی اور سدِّ راہ ہوئی تو اس بچے نے کہا اے مادرِ گرامی خوف نہ کھائیں آپ خود بھی اس آگ میں کود جائیں اور مجھ کو بھی ڈال دیں۔ خدا کی قسم یہ چیز راہِ خدا میں بہت معمولی ہے۔ (ان ھٰذا واللہ فی اللہ قلیل...) اور یہ بچہ بھی ان افراد میں سے تھا جنہوں نے گہوارہ میں کلام کیا۔[1]

اس داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھا گروہ اصحاب الاخدود کا حبشہ میں تھا۔ حضرت عمار یاسر کے ماں باپ اور ان جیسے دوسرے افراد کی داستان اور اس سے بڑھ کر حضرت امام حسینؑ کا واقعۂ جاں بازی اور میدانِ کربلا میں ایک دوسرے سے بڑھ کر جام شہادت نوش کرنا اسلام میں مشہور و معروف ہے۔

ہم نے اپنے اس زمانے میں بھی بہت زیادہ نمونے اس موضوع کے اپنے کانوں سے سنے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں کہ بوڑھوں اور جوانوں نے دین و ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نہایت والہانہ انداز میں منزلِ شہادت کی طرف قدم بڑھائے۔ کہنا یہ چاہیئے کہ خدا کے دین کی بقا گزشتہ اور موجودہ زمانہ میں اس قسم کی قربانیوں کے بغیر ممکن نہ تھے۔

---

[1] تفسیر عیاشی مطابق نقل تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۷۷۔ (تلخیص کے ساتھ)۔

(۱۰) اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ ۝

(۱۱) اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡكَبِیۡرُ ۝

(۱۲) اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِیۡدٌ ۝

(۱۳) اِنَّهٗ هُوَ یُبۡدِئُ وَیُعِیۡدُ ۝

(۱۴) وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ۝

(۱۵) ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُ ۝

(۱۶) فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ۝

ترجمہ

(۱۰) جنہوں نے صاحبِ ایمان مَردوں اور عورتوں پر تشدد کیا ہے ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور آگ کا جلانے والا عذاب ہے۔

(۱۱) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ان کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

(۱۲) تیرے پروردگار کی قہر آمیز گرفت اور سزا بہت ہی شدید ہے۔

(۱۳) وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور وہی ہے جو دوبارہ پلٹاتا ہے۔

(۱۴) اور بخشنے والا اور (مومنین کا) دوست رکھنے والا ہے۔

(۱۵) صاحبِ عرشِ مجید ہے۔

(۱۶) اور جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

تشدد کرنے والے عذابِ الٰہی کے سامنے

گزشتہ اقوام میں سے تشدد کرنے والوں کی عظیم بے رحمی کے بیان کے بعد جو صاحبِ ایمان لوگوں کو آگ میں زندہ جلاتے تھے ان آیات میں ان تشدد کرنے والوں کے متعلق خدا کے سخت عذاب اور مومنین کے لیے عظیم ثواب کی طرف نوید ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"وہ جنہوں نے ایماندار مَردوں اور عورتوں کو موردِ آزار و عذاب قرار دیا اور پھر توبہ نہیں کی ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور اسی طرح جلانے والی آگ کا عذاب ہے" (ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات ثم لم یتوبوا فلھم عذاب جھنم ولھم عذاب الحریق)۔

"فتنوا" "فتن" (بروزن متن) اور فتنہ کے مادہ سے اصل میں سونے کو آگ میں ڈالنے کے معنی میں ہے تاکہ اس کو پرکھا جا سکے اور کھرا کھوٹا قرار دیا جا سکے۔ اس کے بعد یہ مادہ (فتنہ) آزمائش، عذاب و عقاب، گمراہی اور شرک کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور زیرِ بحث آیت میں عذاب، آزار اور تشدد کے معنی میں ہے۔

اس کی نظیر سورہ ذاریات کی آیت ۱۳، ۱۴ میں بھی آئی ہے (یوم ھم علی النار یفتنون ذوقوا فتنتکم ھٰذا الذی کنتم بہ تستعجلون) "وہی دن جس دن وہ آگ میں جلائے جائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تمہیں جلدی تھی"۔ "ثم لم یتوبوا" کا جملہ بتاتا ہے کہ توبہ کا راستہ اس قسم کا تشدد کرنے والوں کے لیے بھی کھلا ہوا ہے اور یہ چیز یہ بتاتی ہے کہ پروردگارِ عالم گناہ گاروں پر کتنا رحم کرنا چاہتا ہے۔

ضمناً یہ مکّے کے لوگوں کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ جلد از جلد مومنین کو آزار پہنچانے اور تکلیف دینے سے باز آجائیں اور خدا کی طرف رجوع کریں۔ قرآن اصولی طور پر بازگشت کی راہ کسی پر بند نہیں کرتا اور یہ چیز بتاتی ہے کہ دردناک عذابِ دنیا بھی مفسدین کی اصلاح کے لیے ہے اور ان کے حق کی طرف لوٹ آنے کے لیے ہے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ اس آیت میں ان کے لیے دو قسم کے عذاب بیان ہوئے ہیں ایک عذابِ جہنم دوسرا

عذابِ حریق (جلانے والی آگ کا عذاب) ان دو عذابوں کا ذکر ہو سکتا ہے کہ اس بنا پر ہو کہ چونکہ جہنم میں کئی قسم کی سزائیں اور عذاب ہیں، جن میں سے ایک جلانے والی آگ ہے۔ اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ تشدد کرنے والے مذکورہ افراد مومنین کو آگ میں جلاتے تھے لہٰذا وہاں انہیں آگ کی سزا ملنی چاہیئے لیکن یہ آگ کہاں اور وہ آگ کہاں۔ وہ آگ خدا کے قہر و غضب کے شعلوں سے بھڑکائی گئی ہے اور وہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، نیز ذلت و خواری اپنے ہمراہ لیے ہوئے ہے۔ جبکہ دنیا کی آگ ناپائیدار ہے جو کمزور مخلوق کی جلائی ہوئی ہے اور جو مومنین اس میں جلے ہیں وہ سربلند و پُرافتخار ہوں گے اور راہِ حق کے شہیدوں کی پہلی صف میں ان کی جگہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ عذابِ جہنم ان کے کفر کی سزا تھا اور عذابِ حریق ان کے تشدد اعمال کے نتیجے میں ہے۔ اس کے بعد مومنین کے اجر کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے ان کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی و نجات ہے" (ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات لھم جنات تجری من تحتھا الانھار ذالک الفوز الکبیر)۔

اس سے بہتر کونسی کامیابی ہوگی کہ پروردگار کے جوارِ قدس میں انواع و اقسام کی پائیدار نعمتوں کے درمیان سربلندی و افتخار کے ساتھ ان کو جگہ ملے۔ لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اس فوزِ کبیر اور کامیابی کی اصل کلید ایمان اور عملِ صالح ہے۔ اس راہ کا اصلی سرمایہ یہی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ اس کی شاخیں ہیں۔

"عملوا الصالحات" کی تعبیر (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صالحات صالح کی جمع ہے) بتاتی ہے کہ صرف ایک یا چند عملِ صالح کافی نہیں ہیں بلکہ ضروری ہے کہ انسان ہر قدم پر عملِ صالح انجام دے۔

"ذالک" کی تعبیر جو عربی زبان میں دُور کے اشارے کے لیے ہے، اس قسم کے مقامات پر اہمیت اور بلندی کو ظاہر کرتی ہے یعنی ان کے کامیابی، نجات اور اختیارات و اعزازات اس قابل ہیں کہ ہماری فکر کی دسترس سے خارج ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ تشدد کرنے والوں اور کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ یقینی بات ہے کہ تیرے پروردگار کی قہر آمیز گرفت اور سزا بہت ہی شدید ہے" (ان بطش ربک لشدید)

اس کے بعد فرماتا ہے: "یہ گمان نہ کرو کہ درمیان میں قیامت نہیں ہے یا تمہاری بازگشت مشکل ہے، وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور وہی ہے جو واپس لوٹائے گا" (انہ ھو یبدئ و یعید)۔

"بطش" کے معنی ایسی گرفت کے ہیں جس میں قہر و قدرت کا دخل ہو۔ چونکہ عام طور پر یہ کام سزا کی تمہید ہوتا ہے اس لیے یہ لفظ سزا کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"ربک" تیرا پروردگار کی تعبیر پیغمبر کے دل کی تسلی اور خدا کی طرف سے ان کی حمایت کی تاکید ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کسی قسم کی تاکیدوں کو لیے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو لفظ بطش خود قہر آمیز گرفت کے معنی میں ہے اور اس میں شدت پوشیدہ ہے، دوسرے جملہ اسمیہ ہے جو عام طور پر تاکید کے لیے آتا ہے، تیسرے "شدید" کی تعبیر اور

چوتھے لفظ "اِنّ"، پانچویں "لام تاکید" یہ سب اسی ایک آیت میں جمع ہیں اس بنا پر قرآن مجید چاہتا ہے کہ انہیں انتہائی قطعی انداز میں سزاؤں کے بیان سے تہدید کرے اور دھمکائے اور انه هو يبدئ ويعيد کا جملہ، جس میں معاد کی اجمالی دلیل پوشیدہ ہے، کہہ کر ایک اور تاکید کا اضافہ کرتا ہے[1]

اس کے بعد خدائے عظیم و برتر کے اوصاف میں سے پانچ اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ توبہ کرنے والے بندوں کو بخشنے والا اور مومنین کو دوست رکھنے والا ہے" (وهو الغفور الودود)۔

"وہ تختِ قدرت والا، عالمِ ہستی پر حکومتِ مطلقہ رکھنے والا اور صاحبِ مجد و عظمت ہے" (ذو العرش المجيد)۔

"وہ کام کا ارادہ کرکے اسے انجام دیتا ہے" (فعال لما يريد)۔

"غفور" و "ودود" دونوں مبالغہ کے صیغہ ہیں اور اس کی انتہائی بخشش اور محبت کی طرف اشارہ ہیں۔ گنہگار توبہ کرنے والوں کا بخشنے والا اور بندگان صالح کے بارے میں شفیق و مہربان۔

حقیقت میں ان اوصاف کا ذکر اس تہدید کے مقابلہ میں جو گزشتہ آیات میں آئی ہے، اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ بازگشت کا راستہ گناہ گاروں کے سامنے کھلا ہے اور خدا شدید العقاب ہونے کے باوجود غفور و ودود و رؤف و مہربان ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ودود یہاں فاعل کے معنی رکھتا ہے، نہ کہ مفعول کے۔ اور یہ جو بعض مفسرین نے ودود کے لفظ کو اسم مفعول کے معنوں میں سمجھا ہے، مثل رکوب کے جو مرکوب کے معنی میں آیا ہے یعنی خدا سے بہت زیادہ محبت و دوستی کی گئی ہے، غفور کی صفت کے ساتھ جو اس سے پہلے آئی ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ خدا کا ہدف و مقصد بندوں سے محبت کرنا اور انہیں دوست رکھنا ہے نہ کہ بندوں کا اس کی نسبت دوست رکھنا اور محبت کرنا ہے۔

تیسری صفت یعنی ذو العرش، اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ عرش بلند تختِ شاہی کے معنی میں ہے، اس قسم کے موارد میں قدرت و حاکمیت کا کنایہ ہے اور اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ جہانِ ہستی کی حکومت اسی کے لیے ہے اور جو کچھ وہ ارادہ کرے وہ انجام پا جاتا ہے۔

اس بنا پر حقیقت میں "فعال لما يريد" کا جملہ اس حاکمیت مطلقہ کے لوازم میں سے ہے اور ان سب میں مسئلہ معاد اور مُردوں کو موت کے بعد زندہ کرنے اور تشدد کرنے والے جباروں کو سزا دینے اور کیفرِ کردار تک

---

[1] معاد کے بارے میں مندرجہ بالا خوب صورت دلیل وہی ہے جو سورہ یٰسین کے آخر میں آیہ ۷۹ میں بھی آئی ہے۔ (قل يحييها الذى انشأها اوّل مرّة وهو بكل خلق عليم) کہہ دے وہی ذات جس نے اسے ابتدا میں خلق کیا ہے، دوبارہ زندہ کرے گی اور وہ اپنی پوری مخلوق سے آگاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ فارابی کی آرزو تھی کہ کاش مشہور یونانی فیلسوف ارسطو زندہ ہوتا تاکہ وہ محکم اور خوبصورت دلیل معاد قیامت کے بارے میں قرآن مجید کی طرف سے سنتا۔

پہنچانے کے سلسلہ میں اس کی طاقت و قدرت کی نشاندہی کرتا ہے۔

"مجید" "مجد" کے مادہ سے کرم و شرافت و جلالت کی وسعت کے معنی میں ہے اور یہ ایسی صفات میں سے ہے جو خدا کی ذات سے مخصوص ہیں اور دوسروں کے بارے میں بہت کم استعمال ہوتی ہیں[1]

یہ پانچوں صفتیں ایک واضح انجام اور ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے کہ غفور و ودود ہونا اس وقت مفید ہے جب قدرت حاصل ہو اور کرم وسیع اور نعمت بے پایاں ہو تاکہ وہ جو کچھ ارادہ کرے انجام دے سکے۔ نہ کوئی چیز اس کے کام میں مانع ہو اور نہ کوئی مقابلہ کی قدرت رکھتا ہو اور اس کے ارادہ میں ضعف و نقاہت و شک اور تردید و فسخ کا امکان نہ ہو۔

---

[1] توجہ رکھنی چاہیئے کہ اوپر والی آیت میں مجید مشہور قراءت کی بناء پر مرفوع ہے اور خدا کے اوصاف میں سے ہے نہ کہ مجرد اور عرش کے اوصاف میں سے۔

(۱۷) هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ
(۱۸) فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ؕ
(۱۹) بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ
(۲۰) وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ
(۲۱) بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ
(۲۲) فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۧ

ترجمہ

(۱۷) کیا لشکروں کی داستان تجھ تک پہنچی ہے؟
(۱۸) فرعون و ثمود کے لشکر۔
(۱۹) بلکہ کفار ہمیشہ حق کی تکذیب میں مصروف رہتے ہیں۔
(۲۰) اور خدا ان سب پر احاطہ رکھتا ہے۔
(۲۱) (یہ کوئی جدا اور جھوٹ نہیں ہے) بلکہ باعظمت قرآن ہے۔
(۲۲) جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔

تفسیر

تُو نے دیکھا کہ خدا نے فرعون و ثمود کے لشکروں کے ساتھ کیا کیا؟

گزشتہ آیات خدا کی قدرتِ مطلقہ، اس کی قطعی حاکمیت اور تشدد کرنے والے کفار کی تہدید کے طور پر تھیں۔ یہ بتانے کے لیے کہ یہ تہدیدیں عملی ہیں، باتوں اور نعروں کی حد تک محدود نہیں ہیں، زیرِ بحث آیات میں رُوئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"کیا لشکروں کی داستان تجھ تک پہنچی ہے؟" (ھل اتاک حدیث الجنود)۔ وہ عظیم لشکر جنہوں نے خدائی پیغمبروں کے مقابلہ میں صف آرائی کی اور لڑنے کے لیے مستعد ہو گئے، اس گمان میں کہ وہ خدائی قدرت کے مقابلہ میں اپنے آپ کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے دو بہت ہی واضح اور آشکار نمونوں کی طرف جن میں سے ایک قدیم الایام میں اور دوسرا بہت ہی نزدیک کے زمانہ میں وقوع میں آیا، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہی فرعون اور ثمود کے لشکر" (فرعون وثمود)۔ "وہی جن میں سے بعض نے دنیا کے مشرق و مغرب کو اپنے زیرِ تسلط کر لیا تھا اور بعض نے پہاڑوں کو چیر کر بڑے بڑے پتھر کاٹ کر ان سے بڑے بڑے مکانات، قصر اور محل بنائے اور کسی میں بھی ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں تھی لیکن خدا نے پہلے گروہ کو پانی کے ذریعہ اور دوسرے کی آندھی کے وسیلے سے، جو دونوں انسانی زندگی کا ذریعہ ہیں اور زیادہ لطیف موجودات شمار ہوتے ہیں، سرکوبی کی۔ دریائے نیل کی موجیں فرعون اور اس کے لشکر کو نگل گئیں اور ٹھنڈی اور سرکوبی کرنے والی ہوا قوم ثمود کو پرِ کاہ کی طرح اٹھاتی اور تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے بے جان جسموں کو سطح زمین پر پھینک دیتی تھی تاکہ مشرکین عرب جان لیں کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

جب خدا نے ان عظیم اور طاقتور لشکروں سے اس طرح انتقام لیا تو ان لوگوں کی کیا ہستی ہے جو ان کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور و ناتواں ہیں، اگرچہ اس کی قدرت کے مقابلہ میں ضعیف و قوی سب برابر ہیں۔

گزشتہ عام اقوام میں سے قوم ثمود و فرعون کا انتخاب سرکش قوموں کے نمونہ کے طور پر اس بنا پر ہے کہ وہ دونوں قومیں انتہائی طاقتور تھیں۔ ایک گزشتہ ادوار سے متعلق تھی (قوم ثمود) اور دوسری زیادہ نزدیک ماضی سے تعلق رکھتی تھی (قوم فرعون)۔ علاوہ ازیں قوم عرب ان ناموں سے باخبر تھی اور اجمالی طور پر ان کی تاریخ سے آشنا تھی۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "بلکہ وہ لوگ کافر ہو گئے، وہ ہمیشہ حق کی تکذیب میں گرفتار و مبتلا ہیں" (بل الذین کفروا فی تکذیب)۔ اس طرح نہیں ہے کہ حق کی نشانیاں کسی سے مخفی ہیں۔ عناد اور ہٹ دھرمی اجازت نہیں دیتے کہ بعض لوگ راہ نکال کر منزلِ حق کی طرف قدم بڑھائیں۔

"بل" کی تعبیر، جو اصطلاح کے مطابق "اضراب" (ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف عدول کرنے) کے لیے ہے، گویا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مشرک گروہ قومِ فرعون و ثمود سے بھی بدتر اور زیادہ ہٹ دھرم ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ قرآن کے انکار اور تکذیب میں لگے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ہر ذریعہ اور وسیلہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن انہیں جان لینا چاہیئے کہ خدا ان سب پر احاطہ رکھتا ہے اور وہ سب اس کی قدرت کی گرفت میں ہیں (واللہ من ورائھم محیط)۔

اگر خدا انہیں مہلت دیتا ہے تو عجز و ناتوانی کی بنا پر نہیں ہے اور اگر انہیں جلدی سزا نہیں دیتا تو وجہ یہ نہیں

ہے کہ وہ اس کی اقلیم قدرت سے باہر ہیں (وراءھم) ان کے پیچھے اور پسِ پشت کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر جہت سے قدرتِ الٰہی کے قبضہ میں ہیں اور قدرت تمام اطراف سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ اس کی عدالت اور سزا سے راہِ فرار اختیار کرسکیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان کے اعمال پر تمام جہات سے خدا کا علمی احاطہ ہو اس طرح سے کہ ان کی کوئی گفتار، ان کا کوئی کردار اور ان کا کوئی کام اس سے مخفی نہیں ہے۔ بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

"ان کا قرآن کی تکذیب پر اصرار اور اسے سحر، جادو، شعر اور کہانت سے تشبیہ دینا، بیہودہ اور فضول بات ہے بلکہ وہ قرآن مجید باعظمت اور بلند مرتبہ ہے" (بل ھو قرآن مجید)۔ ایسا کلام ہے جو لوحِ محفوظ میں ثبت ہے اور نااہل شیاطین اور کاہنوں کا ہاتھ ہرگز اس تک نہیں پہنچتا، اور ہر قسم کے تغیر، تبدیلی، اضافہ اور نقصان سے محفوظ ہے (فی لوح محفوظ)۔

اس بنا پر اگر وہ ناروا نسبتیں تیری طرف دیتے ہیں اور تجھے شاعر، ساحر، کاہن اور مجنوں کہتے ہیں تو تُو اس سے ہرگز غمگین نہ ہو۔ تیری تکیہ گاہ محکم، تیری راہ روشن و واضح اور تیرا حامی صاحبِ قدرت ہے۔

"مجید" جیسا کہ ہم نے کہا ہے "مجد" کے مادہ سے شرافت وجلالت کی وسعت کے معنی میں ہے اور یہ معنی قرآن کے بارے میں پورے طور پر صادق آتے ہیں، اس لیے کہ قرآن کے مشمولات ومضامین وسیع وعظیم ہیں اور اس کے معانی بلند و پُر مایہ ہیں۔

معارف وعقائد کے سلسلہ میں بھی اور اخلاق ومواعظ و احکام وتسنن کے بارے میں بھی۔ (لوح، لام کے زبر کے ساتھ) عریض و وسیع صفحہ کے معنی میں ہے جس پر کوئی چیز لکھتے ہیں اور لُوح (لام کے پیش کے ساتھ) پیاس کے معنی میں ہے۔ اس ہَوا کو بھی کہتے ہیں جو زمین و آسمان کے درمیان موجود ہے۔ وہ فعل جو پہلے تلفظ سے مشتق ہوتا ہے آشکار ہونے اور چمکنے کے معنوں میں ہے۔

بہرحال یہاں مراد وہ صفحہ ہے جس پر قرآن مجید تحریر ہے۔ لیکن وہ صفحہ نہیں جو ہمارے درمیان رائج ہے جو الواح کی مانند ہے بلکہ ایک تفسیر کے مطابق جو ابنِ عباس سے منقول ہے کہ:

لوحِ محفوظ کا طول زمین و آسمان کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے اور عرض مغرب ومشرق کے فاصلے کے برابر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ لوحِ محفوظ وہی علمِ خدا کا ایک صفحہ ہے جس نے عالم کے شرق و غرب کو گھیر رکھا ہے اور وہ ہر قسم کی دگرگونی، تغیر اور تبدیلی و تحریف سے محفوظ ہے۔

جی ہاں! قرآن کا سرچشمہ حق تعالیٰ کا علمِ بے پایاں ہے۔ یہ انسانی فکر کی پیداوار نہیں ہے نہ یہ القائے شیاطین کا نتیجہ ہے۔ اس کے مشمولات ومضامین اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

یہ احتمال وہی چیز ہے جسے قرآن مجید میں کبھی کتابِ مبین سے اور کبھی ام الکتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ رعد کی آیت ۳۹ میں ہم پڑھتے ہیں (یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب) خدا جسے چاہتا

ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے۔ اور سورہ انعام کی آیت ۵۹ میں آیا ہے (ولا رطب ولا یابس الّا فی کتاب مبین) خشک و تر کی کوئی چیز ایسی نہیں مگر یہ کہ واضح کتاب میں ثبت ہے۔

خداوندا! ہمیں اپنی اس عظیم آسمانی کتاب کی حقیقت سے زیادہ آشنا فرما۔

پروردگارا! اس دن جس میں مومنینِ صالح فوزِ کبیر حاصل کریں گے اور کافرین مجرم عذاب حریق میں گرفتار ہوں گے ہمیں اپنے دامن عافیت میں پناہ دیجئو۔

بارالٰہا! تُو غفور و ودود و رؤف و مہربان ہے۔ تو ہم سے وہ سلوک کر جو تیرے ان اسمائے صفات سے ہم آہنگ ہے۔ وہ سلوک نہ کیجو جس کا ہمارے اعمال تقاضا کرتے ہیں۔

آمین یارب العالمین

سورۂ بروج کا اختتام

سُورۂ طارق

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اور اس میں ۱۷ آیتیں ہیں

سورہ طارق کے مضامین اور ان کی فضیلت

اس سورہ کے مطالب نہایت عمدہ طریقہ سے دو محوروں کے گرد گھومتے ہیں۔

۱۔ معاد و قیامت کا محور۔

۲۔ قرآن مجید اور اس کی قدر و قیمت و اہمیت کا محور۔

لیکن سورہ کے آغاز میں فکر آفریں قسموں کے بعد ان نگہبانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو خدا کی طرف سے بندوں پر مقرر ہیں اور معاد و قیامت کے امکان کو ثابت کرنے کے بعد پہلی زندگی، یعنی انسان کے نطفہ کے پانی سے پیدا ہونے کی طرف اشارہ کر کے نتیجہ اخذ کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"وہ خدا جو قدرت رکھتا ہے کہ اسے اس قسم کے بے قیمت اور ناچیز پانی سے پیدا کرے، وہ نئے سرے سے اس کی بازگشت کی توانائی اور طاقت بھی رکھتا ہے۔ بعد کے مرحلے میں روزِ قیامت کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے بعد متعدد پُرمعنی قسموں کے حوالہ سے قرآن کی اہمیت کو گوش گزار کرتا ہے اور آخرکار سورہ کو خدائی عذاب کی اس تہدید پر ختم کرتا ہے جو کافروں کے لیے ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں ہمیں پیغمبرِ اسلامؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ (من قرأ ھا اعطاہ اللہ بعدد کل نجم فی السماء عشر حسنات) جو شخص اس کی تلاوت کرے خدا اسے ہر اس ستارے کی تعداد کے مقابلہ میں، جو آسمان میں ہے، دس نیکیاں عطا کرتا ہے[1]

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے (من کان قرائتہ فی الفریضۃ والسماء والطارق کان لہ عند اللہ یوم القیامۃ جاہ و منزلۃ وکان من رفقاء النبیین و اصحابھم فی الجنۃ) جو شخص نمازِ فریضہ و واجب میں سورہ والسماء والطارق کی تلاوت کرے وہ روزِ قیامت خدا کے ہاں عظیم مقام و منزلت کا حامل ہوگا اور جنت میں پیغمبروں کے رفقاء اور ان کے اصحاب میں سے ہوگا[2]

واضح رہے کہ سورہ کے مضامین پر عمل کرنا ہی ایسی چیز ہے جس کا یہ اجرِ عظیم ہے، نہ کہ وہ تلاوت جو عمل اور غور و فکر سے خالی ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۶۹۔

[2] ثواب الاعمال مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۴۹۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ

(۲) وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ

(۳) النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ۙ

(۴) اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ؕ

(۵) فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ

(۶) خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ

(۷) يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ

(۸) اِنَّهٗ عَلٰى رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ

(۹) يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ ۙ

(۱۰) فَمَا لَهٗ مِنۡ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

(۱) قسم ہے رات کی اور رات کے کھٹکھٹانے والے کی۔

(۲) اور تُو نہیں جانتا کہ رات کو کھٹکھٹانے والا کیا ہے؟

(۳) وہی درخشاں ستارہ اور تاریکیوں کو چیرنے والا۔

(۴) (اس عظیم خدائی آیت کی قسم) ہر شخص کا ایک مراقب و محافظ ہے۔

(۵) انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟

(۶) وہ اچھلتے ہُوئے پانی (منی) سے پیدا ہُوا ہے۔

۷ وہ پانی جو پشت اور سینوں کے درمیان سے خارج ہوتا ہے۔

۸ (وہ جس نے اسے اس قسم کی ناچیز شے سے پیدا کیا ہے) اسے واپس لوٹا سکتا ہے۔

۹ جس دن اسرار کھلیں گے۔

۱۰ اور اس کے لیے کوئی قوت اور مددگار نہیں ہے۔

تفسیر

اے انسان دیکھ کہ تُو کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟

یہ سورۃ بھی قرآن کے آخری پارہ کی بہت سی دوسری سورتوں کی طرح خوبصورت اور فکر انگیز قسموں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ ایسی قسمیں ایک عظیم حقیقت کے بیان کی تمہید ہیں۔

"قسم ہے آسمان کی اور رات کو کھٹکھٹانے والے کی" (والسماء والطارق)۔ "اور تُو نہیں جانتا کہ رات کو کھٹکھٹانے والا کیا ہے" (وما ادراک ما الطارق)۔ "بلند و درخشاں اور رات کی تاریکیوں کو چیرنے والا ستارہ ہے" (النجم الثاقب)۔

"طارق" طرق (بروزن برق) کے مادہ سے کوٹنے کے معنی میں ہے۔ راستے کو اس لیے طریق کہتے ہیں کہ وہ چلنے والے لوگوں کے قدموں سے روندا جاتا ہے اور مطرقہ اس ہتھوڑے کے معنوں میں ہے جسے دھاتوں وغیرہ کو کوٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ رات کو گھروں کے دروازے بند کر دیتے ہیں اس لیے وہ شخص جو رات کو آتا ہے دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوتا ہے' لہٰذا رات کو آنے والے شخص کو طارق کہتے ہیں۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ اشعث بن قیس منافق کے بارے میں، جو رات کے وقت آپ کے دروازہ پر آیا تھا اور حلوہ اپنے ساتھ لایا تھا کہ اپنے خیال ناقص میں حضرت علیؑ کو اپنی طرف متوجہ کرے اور کسی معاملے میں آپ سے اپنے موافق حکم حاصل کرے، فرماتے ہیں (واعجب من ذالک طارق طرقنا بملفوفة وعائها) اور اس سے زیادہ تعجب کی بات تو اس شخص کی ہے جس نے رات کے وقت دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور وہ لذیذ حلوہ سے پُر ڈھکا ہوا برتن اپنے ہمراہ لایا تھا[1]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۴۔

لیکن قرآن یہاں طارق کی خود تفسیر کرتا ہے اور کہتا ہے یہ رات کا مسافر وہی درخشاں ستارہ ہے جو آسمان پر ظاہر ہوتا ہے اور اس قدر بلند ہے گویا چاہتا ہے کہ آسمان کی چھت میں سوراخ کر دے۔ اس کی روشنی آنکھوں کو اس قدر خیرہ کرنے والی ہے کہ تاریکیوں میں شگاف ڈال دیتی ہے اور انسان کی آنکھوں کے اندر نفوذ کرتی ہے۔ (توجہ فرمائیں کہ ثاقب ثقب کے مادہ سے سوراخ کرنے کے معنی میں ہے)۔

یہ بات کہ اس سے مراد کوئی معین ستارہ ہے، مثلاً ثریا نامی ستارہ (آسمان میں بلندی اور دُوری کے لحاظ سے) یا زحل، مچھر زہرہ یا شہب (خیرہ کرنے والی روشنی کے لحاظ سے) یا آسمان کے تمام ستاروں کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں کئی تفسیریں کی گئی ہیں۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بعد کی آیت میں اسے نجم ثاقب (نفوذ کرنے والے ستارے) کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر ستارہ نہیں بلکہ وہ درخشاں ستارے ہیں جن کا نور تاریکی کے پردوں میں شگاف ڈال دیتا ہے اور انسان کی آنکھوں میں نفوذ کرتا ہے۔

بعض روایات میں النجم الثاقب کی زحل ستارے سے تفسیر کی گئی ہے جو نظام شمسی کے سیاروں میں سے بہت ہی پُر فروغ اور منور ستارہ ہے، اور یہ معنی اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتے ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے النجم الثاقب کی تفسیر کے سلسلہ میں ایک منجم کو بتائے ہیں۔

آپ نے فرمایا: زحل ستارہ ہے جو ساتویں آسمان میں طلوع ہوتا ہے اور اس کی روشنی تمام آسمانوں کو چیرتی ہوئی نچلے آسمان تک پہنچ جاتی ہے، اسی لیے خدا نے اسے نجم ثاقب کہا ہے[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ زحل آخری اور سب سے دور جو نظام شمسی ہے، اس کا ستارہ ہے، جو بغیر کسی آلے کی مدد کے خالی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ چونکہ نظام شمسی کے ستاروں کی ترتیب کے اعتبار سے سورج کی نسبت کے پیشِ نظر ساتویں مدار اور مقام گردش میں قرار پاتا ہے (چاند کے مدار کے حساب سے) تو امام اس حدیث میں اس کا مدار ساتواں آسمان بتاتے ہیں۔ اس ستارے کی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے قابلِ قسم بناتی ہیں۔ ایک تو یہ نظام شمسی کے سب سے دُور ستاروں میں سے ہے۔ اس وجہ سے ادب عربی میں ہر بلندی کی اس سے مثال دیتے ہیں اور کبھی اسے شیخ النجوم بھی کہتے ہیں[2]

زحل ستارہ، جس کا فارسی نام کیوان ہے، اس کے کئی نورانی حلقے ہیں جو اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اس کے آٹھ چاند ہیں۔ زحل کے نورانی حلقے جو اس کا احاطہ کیے ہوتے ہیں عجیب ترین آسمانی مظاہر میں سے ہیں جن کے بارے میں ماہرین فلکیات کے مختلف نظریات ہیں اور وہ حلقے اب بھی پُر اسرار موجودات ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ زحل کے دس چاند ہیں جن میں سے آٹھ کا عام نجومی دوربینوں سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۵۰ حدیث ۴۔

[2] دائرۃ المعارف وجدا مادہ زحل۔

دو چاند صرف بہت بڑی دوربینوں سے نظر آسکتے ہیں [1]

مذکورہ اسرار اس وقت کسی پر قطعاً واضح نہیں تھے جب قرآن نازل ہوا تھا۔ وہ اس کے صدیوں بعد آشکار ہوئے۔ بہرحال نجم ثاقب کی زحل ستارے سے تفسیر خصوصیت کے ساتھ ممکن ہے، ایک واضح مصداق کے بیان کی قبیل سے ہو اور وہ اس راہ میں حائل نہ ہو کہ آسمان کے دوسرے درخشاں ستاروں سے تفسیر کی جائے اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری روایات میں مصداقی تفسیر بہت زیادہ ہے۔

سورہ صافات کی آیت ۱۰ میں ہم پڑھتے ہیں (الا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب) "مگر وہ جو مختصر سے لمحے میں استراق سمع کے لیے (چوری چھپے کان لگا کر سننے کے لیے) آسمان کے نزدیک ہو کر شہابِ ثاقب کا تعاقب کرتا ہے"

تو اس آیت میں شہاب کی توصیف لفظِ ثاقب سے ہوئی ہے اور چونکہ یہ آسمان میں وجود میں آنے والی چیز عجائباتِ عالم میں سے ایک ہے، لہٰذا ممکن ہے کہ زیرِ بحث آیت کی ایک تفسیر یہ بھی ہو۔ اس آیت کے لیے جو شانِ نزول بعض کتب تفسیر میں بیان ہوئی ہے وہ بھی ان معانی کی تائید کرتی ہے [2]

اب ہم دیکھیں گے کہ یہ قسمیں کس لیے ہیں۔ بعد میں آنے والی آیت میں فرماتا ہے: "مسلّم ہے کہ ہر ایک شخص کا ایک مراقب و محافظ ہے" (ان کل نفس لما علیها حافظ) [3]

جو اس کے اعمال کو لکھتا ہے اور حساب کتاب اور جزا و سزا کے لیے محفوظ رکھتا ہے۔ جیسا کہ سورہ انفطار کی آیت ۱۰، ۱۱، ۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں (وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون) "اور تم پر کچھ محافظ مقرر کر دیئے گئے ہیں، لکھنے والے مکرم و محترم، جو ہمیشہ تمہارے اعمال لکھتے رہتے ہیں اور جو کچھ انجام دیتے ہو وہ اس سے واقف ہیں"

اس طرح تم اکیلے اور تنہا نہیں ہو اور تم میں سے کوئی بھی ہو اور جہاں کہیں بھی ہو، وہ پروردگار کے مامورین کی زیرِ نگرانی ہوگا۔ یہ ایسا مفہوم ہے جس کی طرف توجہ انسان کی اصلاح و تربیت کے لیے بے حد مؤثر ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ یہ حافظ کون ہے اور کن امور کی حفاظت کرتا ہے۔

لیکن قرآن کی دوسری آیتیں گواہی دیتی ہیں کہ حفاظت کرنے والے فرشتے ہیں اور جن چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں وہ انسان کے اعمال ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ اطاعتیں ہوں یا معاصی و گناہ۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی حوادث و مہلکات سے حفاظت ہے۔

---

[1] دائرة المعارف وجدا ماده زحل۔

[2] روح المعانی، جلد ۱۰ ص ۳۹۷۔

[3] اس آیت میں ان نافیہ ہے اور لما الا کے معنی میں ہے۔

واقعی اگر خدا انسان کی حفاظت نہ کرے تو دنیا میں بہت کم افراد کو طبعی موت نصیب ہو اس لیے کہ حوادث کا حجم اس قدر زیادہ ہے کہ کوئی بھی ان سے نہیں بچ سکتا۔ خصوصاً وہ بچے جن کی عمر ابھی چند سال ہی کی ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ بھی مراد ہو کہ شیطانی وسوسوں سے انسان کی حفاظت کی جاتی ہے، اس لیے کہ اگر خدا کی طرف سے فراہم کی ہوئی یہ حفاظت نہ ہو تو جن وانس پر مبنی شیاطین کے وسوسے اس قدر زیادہ ہیں کہ کوئی فرد بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بعد والی آیت مسئلہ معاد وقیامت اور اعمال وکردار کے حساب کتاب میں گفتگو کرتی ہے۔ لہٰذا پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ اس آیت میں ان تینوں تفسیروں کو جمع کرنے سے بھی کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ پہلے بیان شدہ قسموں کے اور اعمالِ انسان کی فرشتوں کے ذریعہ حفاظت کے مسئلہ کے درمیان ایک زندہ رابطہ ہے، اس لیے کہ بلند آسمان اور وہ ستارے، جو اپنے منظم راستوں میں مسلسل راہ پیمائی کر رہے ہیں، اس عالمِ عظیم میں نظم وضبط اور حساب کتاب کے موجود ہونے کی دلیل ہے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسان کے اعمال حساب کتاب کے بغیر ہوں اور مراقبینِ الٰہی اور محافظین خدائی ان کی نگرانی نہ کریں۔

اس کے بعد مسئلہ معاد کے ایک استدلال کے عنوان سے، ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اسے غیر ممکن سمجھتے ہیں، فرماتا ہے: "انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے" (فلینظر الانسان مم خلق)۔

اس طرح قرآن تمام لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر پہلی خلقت کی طرف واپس لے جاتا ہے اور ایک جملہ استفہامیہ کے ذریعہ ان سے پوچھتا ہے "تمہاری خلقت کس چیز سے ہوئی ہے؟" اور بغیر اس کے کہ ان کے جواب کا انتظار کرے اس سوال کا جواب جو بالکل واضح ہے، خود دیتا ہے اور مزید کہتا ہے:

"وہ ایک ٹپکنے والے پانی سے خلق ہوا ہے" (خلق من ماء دافق)۔ جو مرد کے نطفہ کی توصیف ہے جو منی کے پانی میں تیرتا ہے اور باہر آتے وقت ٹپکتا ہے۔ اس کے بعد اس پانی کی ایک اور توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے: "جو صلب وترائب کے درمیان میں سے نکلتا ہے" (یخرج من بین الصلب والترائب)۔

"صلب" کے معنی پشت کے ہیں اور ترائب ترببہ کی جمع ہے جو علمائے لغت کے مطابق سینے کے اوپر کی ہڈیوں کے معنی میں ہے، جس کے اوپر گلوبند باندھا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابن منظور لسان العرب میں کہتا ہے: (قال اھل اللغۃ اجمعون موضع القلادۃ من الصدر)

سب اہلِ لغت کہتے ہیں وہ سینے کے قلادہ والی جگہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے کئی اور معانی بھی بیان ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ ترائب کے معنی ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں ہیں، یا یہ کہ سینے کی ساری ہڈیاں ہیں۔ یا دائیں طرف کی چار پسلیاں، یا بائیں طرف کی چار پسلیاں ہیں۔ بہرحال یہ کہ اس آیت شریفہ میں صلب وترائب سے کیا مراد ہے، اس عنوان پر مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے بہت سی

تفسیریں تحریر کی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

۱۔ "صلب" مَردوں کی طرف اشارہ ہے اور "ترائب" عورتوں کی طرف، اس لیے کہ مرد مظہر صلابت اور عورتیں مظہر لطافت و زینت ہیں۔ اسی لیے یہ آیت نطفۂ انسانی کی ترکیب کی طرف مرد و عورت کے نطفے کے حوالے سے اشارہ کرتی ہے جو موجودہ زمانے کی اصلاح میں "اسپرز" (SPERM) اور "اوول" کے نام سے موسوم ہے۔

۲۔ "صلب" اشارہ ہے مرد کی پشت کی طرف اور ترائب اشارہ ہے اس کے سینے اور بدن کے اگلے حصّہ کی طرف۔ اس بنا پر مراد صرف مرد کا نطفہ ہے جو شکم کے اندرونی حصوں میں سے پشت اور اگلے حصے کے اندر سے خارج ہوتا ہے۔

۳۔ مراد عورت کے رحم سے جنین کا خروج ہے جو اس کی پشت اور بدن کے اگلے حصّہ میں قرار پاتا ہے۔

۴۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک دقیق علمی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے اس آخری زمانہ کے انکشافات نے پردہ اٹھایا ہے، جو نزولِ قرآن کے زمانے میں یقیناً پنہاں تھا اور وہ یہ کہ نطفہ مرد کے بیضے اور عورت کے تخمدان سے لیا جاتا ہے اور ماہرین جنین شناسی کے حوالے بتاتے ہیں کہ یہ دونوں ابتداء میں جب جنین میں ظاہر ہوتے ہیں تو گردوں کے قرب میں ہوتے ہیں اور تقریباً پشت کے مہروں کے ستون کے وسط کے مقابلہ میں صلب اور ترائب (پشت اور انسان کی نچلی پسلیاں) کے درمیان قرار پاتے ہیں۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد اور ان دونوں اعضاء کے نشوونما سے اس جگہ سے نیچے آجاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی موجودہ جگہ پر آجاتا ہے۔

چونکہ انسان کی پیدائش عورت و مرد کے نطفہ کی ترکیب سے ہوتی ہے اور دونوں ابتداء میں اصل محل صلب و ترائب کے درمیان قرار پاتا ہے، لہٰذا قرآن نے اس قسم کی تعبیر کو منتخب کیا ہے، وہ تعبیر جو اس زمانے میں کسی کو معلوم نہیں تھی اور جدید علمِ جنین شناسی نے اس پر سے پردہ اٹھایا ہے[1]

زیادہ واضح تعبیر میں مرد کا بیضہ اور عورت کا تخمدان ابتدائے خلقت میں، یعنی اس وقت جب عورت و مرد خود عالمِ جنین میں تھے، ان کی پشت میں قرار پایا تھا، جو تقریباً پشت کے مہروں کے ستون کے وسط کے مدِمقابل تھا۔ اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ مرد کا نطفہ ساز کارخانہ اور عورت کی نطفہ ساز دستگاہ دونوں صلب و ترائب کے درمیان تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب مرد و عورت کی خلقت شکمِ مادر میں مکمل ہوتی ہے تو وہاں سے الگ ہوکر آہستہ آہستہ نیچے آتی ہے، اس طرح سے کہ مرد کے بیضے کے تولد کے وقت شکم سے باہر اور آلہ تناسل کے قریب

---

[1] تفسیر مراغی، جلد ۳۰ ص ۱۱۳۔

قرار پاتی ہے اور عورت کا تخمدان رحم کے قرب میں قرار پاتا ہے۔

لیکن اس تفسیر پر اہم اعتراض یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ وہ ٹپکنے والا پانی صلب و ترائب کے درمیان سے خارج ہوتا ہے، یعنی پانی خروج کے وقت ان دونوں کے درمیان سے گزرتا ہے، جبکہ اس تفسیر کے مطابق نطفہ کے پانی کے خروج کے وقت ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ نطفہ ساز دستگاہ اس موقع پر کہ جب خود شکم مادر میں تھی تو اس وقت صلب و ترائب کے درمیان تھی۔ اس سے قطع نظر ترائب کی تعبیر اگر نچلی آخری پسلیوں سے کی جائے تب بھی بحث و تنقید سے خالی نہیں ہے۔

۵۔ اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ منی حقیقت میں انسان کے تمام اجزائے بدن سے لی جاتی ہے۔ اسی لیے خروج کے وقت سارے بدن میں ہیجان ہوتا ہے اور اس کے بعد تمام بدن میں سستی آجاتی ہے۔ اس لیے صلب و ترائب انسان کی عام پشت اور تمام اگلے حصّہ کی طرف اشارہ ہے۔

۶۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ عمدہ ترین منی کی پیدائش کا عامل "نخاع شوکی" حرام مغز ہے جو مرد کی پشت اور اس کے بعد دل و جگر ہیں، جن میں سے ایک سینے کی ہڈیوں کے نیچے اور دوسرا دونوں کے درمیان ہے' اور یہی چیز سبب بنی کہ صلب و ترائب کے مابین کی تعبیر کا اس کے لیے انتخاب ہوا۔ لیکن ہر چیز سے پہلے مشکل کے حل کرنے کے لیے اس اہم نکتہ کی طرف توجہ کی جائے کہ مندرجہ بالا آیات میں صرف مرد کے نطفہ کے بارے میں گفتگو ہے اس لیے کہ ماء دافق" کی تعبیر (اچھل کر نکلنے والا پانی) مرد کے نطفہ پر صادق آتی ہے' نہ کہ عورت کے نطفہ پر۔

یہی وجہ ہے کہ بعد والی آیت پر" یخرج " کی ضمیر جس کی طرف لوٹتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ اچھل کر نکلنے والا پانی صلب و ترائب سے خارج ہوتا ہے، تو اس حساب سے اس بحثِ قرآنی میں عورت کو شریک کرنا مناسب نظر نہیں آتا، بلکہ زیادہ مناسب وہی تعبیر ہے کہ کہا جائے کہ قرآن نطفہ کے دو اصلی اجزا میں سے ایک کی طرف، جو مرد کا نطفہ ہے اور سب کو معلوم ہے، اشارہ کرتا ہے اور صلب و ترائب سے مراد انسان کی پشت اور اگلا حصہ ہے' اس لیے کہ مرد کے نطفہ کا پانی انہی دونوں کے درمیان میں سے نکلتا ہے[1]

یہ تعبیر واضح اور ہر قسم کی پیچیدگی سے خالی ہے اور لفظ کے معنی کے سلسلہ میں جو کچھ کتبِ لغت میں آیا ہے اس سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے باوجود ممکن ہے کہ اس آیت میں ایک زیادہ اہم حقیقت بھی چھپی ہوئی ہو جو ہمارے موجودہ علم کی حد تک ہمارے لیے منکشف نہیں ہوئی اور ماہرین کے آئندہ کے انکشافات اس پر سے پردہ اٹھا سکیں گے۔

اس کے بعد اس بیان سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ جس نے انسان کو نطفہ کے پانی سے پیدا کیا

---

[1] قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی جب نطفہ سے انسان کی خلقت کی گفتگو درمیان میں آتی ہے تو زیادہ تر مرد ہی کے نطفہ پر' جو ایک محسوس امر ہے' انحصار کیا جاتا ہے۔ سورہ نجم کی آیت ۴۶ اور قیامت کی آیت ۳۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

ہے، قادر ہے کہ اسے دوبارہ زندگی کی طرف لوٹائے" (انہ علیٰ رجعہ لقادر)۔

ابتداء میں وہ مٹی تھا۔ پیچیدہ اور تعجب انگیز مراحل طے کرنے کے بعد کامل انسان میں تبدیل ہوا۔ اس لیے اس کی نئی زندگی کی طرف بازگشت کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی۔ اس بیان کی نظیر قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی نظر آتی ہے۔

سورہ حج کی آیت ۵ میں فرماتا ہے: (یا ایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفۃ) "اے لوگو! اگر قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہو تو ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے" نیز سورہ مریم کی آیت ۶۷ میں ہم پڑھتے ہیں (اولا یذکر الانسان انا خلقناہ من قبل ولم یک شیئا) "کیا انسان اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اسے پہلے پیدا کیا، جبکہ وہ کوئی شے نہیں تھا"

اس کے بعد اس عظیم دن کی تعریف و توصیف کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ بازگشت اس دن تحقق پائے گی جس دن اسرار آشکار ہوں گے" (یوم تبلی السرائر)[1]

"تبلی" "بلوی" کے مادہ سے آزمائش اور امتحان کے معنی میں ہے اور چونکہ آزمائش کے وقت اشیاء کی حقیقت آشکار و واضح ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ مادہ یہاں ظہور و بروز کے معنی میں آیا ہے۔

"سرائر" سریرہ کی جمع ہے جو اندرونی پوشیدہ حالات، صفات اور نیتوں کے معنی میں ہے۔

جی ہاں! اس دن جو یوم الظہور و یوم البروز ہے، اسرار آشکار ہو جائیں گے، قطع نظر اس سے کہ ایمان و کفر و نفاق ہوں، یا نیت خیر و شر، یا ریا و اخلاص۔

روز بروز یہ ظہور مومنین کے لیے باعث افتخار و فراوانی نعمت ہوگا اور مجرموں کے لیے شرمساری اور سر کے جھکنے کا سبب اور ذلت و خواری کا باعث۔ اور کیا ہی دردناک ہے کہ وہ انسان جس نے اپنی اندرونی خرابیوں اور برائیوں کو عمر بھر لوگوں سے چھپائے رکھا ہو اور ان کے درمیان عزت سے زندگی گزاری ہو، لیکن اس دن، جس دن تمام اسرار آشکار ہوں گے، تو تمام مخلوق کے سامنے شرمسار اور ندامت سے سرنگوں ہو، اس لیے کہ بعض اوقات عذاب ندامت دوزخ کی آگ سے بھی زیادہ دردناک ہوتا ہے۔

سورہ الرحمٰن کی آیت ۴۱ میں بھی آیا ہے: (یعرف المجرمون بسیماھم) "قیامت میں گنہگار اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے" نیز دوسری آیات میں ہے کہ "قیامت میں ایک گروہ کے چہرے روشن اور تابناک ہوں گے اور دوسرے گروہ کے چہرے تاریک و غبار آلود ہوں گے" (عبس - ۳۸ - ۴۱)۔

جی ہاں! جس طرح طارق اور ستارے رات کے وقت آسمان میں ظاہر ہوتے ہیں اور پردے سے باہر آ

---

[1] یوم یہاں ظرف ہے اور رجع کا متعلق ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے اور اس قسم کے موارد میں مصدر اور اس کے معمول کے درمیان فاصلہ ضرر نہیں رکھتا، اس لیے کہ یہ کسی اجنبی سے فاصلہ نہیں ہے۔

جاتے ہیں، وہ محافظ و مراقب جو انسان کے اعمال کے حفظ و ضبط پر مامور ہیں، وہ بھی وہاں سب کچھ ظاہر کر دیں گے۔

ایک روایت میں معاذ بن جبل سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا سے اس آیت میں جو لفظ سرائر ہے اس کے معنی پوچھے کہ وہ کون سے اسرار ہیں جن کے ذریعہ خدا قیامت میں بندوں کو آزمائے گا؟ تو آپ نے فرمایا:

(سرائرکم ھی اعمالکم من الصلوٰۃ والصیام والزکوٰۃ والوضوء والغسل من الجنابۃ وکل مفروض لان الاعمال کلھا سرائر خفیۃ فان شاء الرجل قال صلیت ولم یصل وان شاء قال توضأت ولم یتوضأ فذالک قولہ یوم تبلی السرائر)

"تمہارے سرائر تمہارے اعمال ہی ہیں، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، وضو، غسل جنابت اور ہر واجب عمل، اس لیے کہ تمام اعمال حقیقت میں پنہاں ہیں۔ اگر انسان چاہے تو کہہ دے کہ میں نے نماز پڑھی ہے جبکہ اس نے نہ پڑھی ہو اور کہہ سکتا ہے کہ میں نے وضو کیا ہے جبکہ نہ کیا ہو۔ یہ ہے خدا کے اس کلام کی تفسیر (یوم تبلی السرائر)"[1]

اس دن اہم مشکل یہ ہوگی کہ انسان کے لیے کوئی قوت و طاقت اندر سے اور کوئی یاور و ہمدرد باہر سے نہیں ہوگا (فمالہ من قوۃ ولا ناصر)۔ کوئی طاقت جو اس کے بُرے اعمال اور بُری نیت پر پردہ ڈالے اور کوئی مددگار جو اسے عذابِ الٰہی سے رہائی بخشے۔

یہ مفہوم بہت سی قرآنی آیات میں آیا ہے کہ اس دن نہ کوئی مددگار ہوگا نہ کوئی فدیہ اور فدا ہونے والا قبول ہوگا، نہ ہی کوئی فرار اور بازگشت کی راہ انسان کے سامنے ہوگی اور نہ کوئی راستہ عدالتِ پروردگار کے چنگل سے فرار کرنے کا راستہ ہوگا۔ نجات کا وسیلہ صرف اور صرف عمل صالح ہوگا۔ جی ہاں! نجات کا وسیلہ صرف یہی ہے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۷۲۔ اس مفہوم سے مشابہ تفسیر در المنثور، جلد ۶، ص ۳۳۶ میں بھی آئی ہے۔

(۱۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ
(۱۲) وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ
(۱۳) اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ
(۱۴) وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ؕ
(۱۵) اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۙ
(۱۶) وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۚ
(۱۷) فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۧ

ترجمہ

(۱۱) پُربارش آسمان کی قسم۔
(۱۲) اور پُرشگاف زمین کی قسم۔
(۱۳) کہ یہ ایک سچی بات ہے۔
(۱۴) اور یہ مذاق نہیں ہے۔
(۱۵) وہ ہمیشہ مکر کرتے ہیں۔
(۱۶) اور مَیں اس کے مقابلہ میں چارہ جوئی کرتا ہوں۔
(۱۷) اب جبکہ ایسا ہے تو کافروں کو تھوڑی سی مہلت دے دے۔ (تاکہ اپنے اعمال کی سزا دیکھ لیں)

تفسیر

مَیں دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہوں

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں انسان کے نطفہ اور اس کی پہلی زندگی کی طرف توجہ کے حوالے سے استدلال

تھا، ان آیات میں پھر امرِ معاد پر تاکید کرتے ہوئے اور دوسرے دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"قسم ہے بارش سے پُر آسمان کی" (والسماء ذات الرجع)۔ "اور قسم ہے زمین کی جو شگافتہ کی جاتی ہے اور اس میں سے سبزہ پھوٹتا ہے" (والارض ذات الصدع)۔ "کہ یہ ایک حق بات ہے کہ تم زندہ ہو جاؤ گے" (انہ لقول فصل)۔

"یہ پکی بات ہے اور اس میں کسی قسم کی شوخی اور مزاح نہیں ہے" (وما ھو بالھزل)۔

"رجع"، رجوع کے مادہ سے بازگشت کے معنی میں ہے اور عرب بارش کو رجع کہتے ہیں، اس وجہ سے کہ پانی زمین اور سمندروں سے اٹھتا ہے اور بارش کی صورت میں زمین کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یا یہ کہ مختلف فاصلوں پر بار بار بارش ہوتی ہے۔

وہ گڑھے جن میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے انہیں بھی رجع کہتے ہیں، بارش کے پانی کے جمع ہو جانے کی بنا پر، یا ان لہروں اور موجوں کی بنا پر جو ان کی سطح پر ہوا کی جنبش سے پیدا ہوتی ہیں[1]

"صدع"، سخت اجسام میں شگاف پڑ جانے کے معنی میں ہے، اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو کچھ رجع کے معنی میں کہا گیا ہے اس کو خشک و سخت زمینوں کے بارش کے نزول کے بعد شگافتہ ہونے اور سبزہ کی نشوونما کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ حقیقت میں یہ دونوں قسمیں اشارہ ہیں مردہ زمینوں کے بارش کی وجہ سے زندہ ہونے کی طرف، جسے قرآن نے بار بار مسئلہ معاد کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کیا ہے۔ مثلاً سورہ ق کی آیت ۱۱ (واحیینا بہ بلدۃ میتاً کذالک الخروج) "ہم نے بارش کے ذریعہ مُردہ زمینوں کو زندہ کیا اور قیامت میں تمہارا خروج بھی اسی طرح ہوگا"۔

اسی طرح ان قسموں کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جن کے لیے قسم کھائی گئی ہے، واضح مناسبت ہے۔ یہ قرآن کے محاسن میں سے ایک ہے کہ قسموں کے درمیان اور ان کے درمیان جن کے لیے یہ قسمیں کھائی جا رہی ہیں، ایک عمدہ اور پُرکشش تناسب نظر آتا ہے۔ جس طرح سورہ حج کی آیت ۵ میں مسئلہ معاد پر نطفہ سے انسان کی خلقت اور جنین کے اسرار سے استدلال کرتا ہے اور بارش کے نزول کے زیرِ اثر مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے پر استدلال کرتا ہے، اسی طرح اس سورہ (سورہ طارق) میں بھی ان دونوں مسائل پر انحصار کیا ہے۔

بعض مفسرین نے "والسماء ذات الرجع" کے جملے کے لیے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ ہے آسمان کے ستاروں کی گردش کی تکرار اور ان کا پہلی حالت کی طرف پلٹنا، زمین کی مختلف ادوار میں اپنے گرد اور سورج کے گرد گردش اور نظامِ شمسی کے سیاروں کی حرکت، چاند، سورج اور ستاروں کی طلوع و غروب کی حرکت۔ یہ سب حرکات بازگشت کی حامل ہیں۔ ان بازگشتوں کا وجود انسان کی حیاتِ تازہ کی طرف بازگشت کی علامت ہے۔ البتہ پہلے معنی

---

[1] مفردات راغب مادہ رجع۔

زمین کے شگافتہ ہونے اور مسئلہ معاد کے دلائل کے ساتھ بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

قول فصل کے معنی ایسی بات کے ہیں جو حق و باطل کو الگ الگ کردے۔ یہاں گزشتہ آیتوں کے قرینہ سے ایک گروہ نے اسے قیامت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جبکہ مفسرین کی ایک دوسری جماعت اسے قرآن کی طرف اشارہ سمجھتی ہے۔

معصومینؑ کی بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے۔ البتہ قیامت کو یوم الفصل سے تعبیر کرنا قرآن کی بہت سی آیتوں میں نظر آتا ہے، جو ضمنی طور پر معاد کی خبر دیتی ہیں۔ اس طرح دونوں تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین حضرت علیؑ کے واسطے سے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(انها ستکون فتنة قلت فما المخرج منها یارسول الله قال کتاب الله فیه نبأ من قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم هو الفصل لیس بالهزل من ترکه من جبار قصمه الله ومن ابتغی الهدی فی غیره اضله الله)

"عنقریب تمہارے درمیان فتنہ ظاہر ہوگا۔ میں نے عرض کیا اے خدا کے رسولؐ اس سے نجات کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: قرآن جس میں گزشتہ اور آئندہ لوگوں کی خبریں اور تمہارے درمیان کے فیصلے ہیں اور وہ ایسا کلام ہے جو حق کو باطل سے جدا کر دیتا ہے، محکم و پختہ ہے، اس میں شوخی و مزاح نہیں ہے۔ جو جبار اس کو چھوڑے گا خدا اس کی کمر توڑے گا اور جو شخص اس کے غیر سے ہدایت چاہے گا خدا اس کو گمراہ کردے گا"[1]

اس کے بعد پیغمبرؐ و مومنین کو تسلی دینے کے لیے اور دشمنان اسلام کی تہدید کی غرض سے خداوند عالم مزید فرماتا ہے: "وہ ہمیشہ مکر و حیلہ کرتے ہیں اور منصوبے بناتے ہیں (انهم یکیدون کیدًا)۔ میں بھی ان کے مقابلہ میں ایک منصوبہ بناتا ہوں اور ان کی سازش کو خاک میں ملا دیتا ہوں۔ (واکید کیدًا)۔ اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو کافروں کو تھوڑی سی مہلت دے دے تاکہ وہ اپنے اعمال کا انجام دیکھ لیں۔ (فمهل الکافرین امهلهم رویدًا)۔

ہاں! وہ ہمیشہ منحوس منصوبے تجھ سے لڑنے کے بناتے رہتے ہیں۔ کبھی مذاق اڑاتے ہیں، کبھی دیوانہ کہتے ہیں، کبھی صبح کو ایمان لاتے ہیں اور عصر کے وقت کافر ہو جاتے ہیں تاکہ ایک گروہ کو اپنے ساتھ واپس کفر کی طرف لے جائیں۔

کبھی کہتے ہیں کہ جو لوگ تیرے گرد جمع ہو گئے ہیں وہ فقراء و بے نوا ہیں۔ انہیں دور کر تاکہ ہم تیرا ساتھ دیں۔ کبھی کہتے ہیں کم از کم ہمارے بعض خداؤں کو قانونی طور پر قبول کرلے تو ہم تیرا ساتھ دیں گے۔ کبھی تجھے جلا وطن کرنے کا

---

[1] صحیح ترمذی، سنن دارمی مطابق نقل روح المعانی جلد ۳ ص ۱۰۰ اور تفسیر مراغی، جلد ۳۰ ص ۱۸۔

اور قتل کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر لمحے ایک نئے بھیس میں آتے ہیں تاکہ تیری جماعت کو متفرق و منتشر کردیں اور تیرے اصحاب و انصار پر دباؤ ڈالیں یا تجھے ختم کردیں اور خدا کے نور کو بجھا دیں۔

لیکن انہیں جاننا چاہیئے کہ خدا نے ارادہ کیا ہے کہ یہ نور عالمگیر ہو جائے۔ یہ خدا کا نور ہے۔ یہ کسی کے پھونک مارنے سے نہیں بجھ سکتا۔ یہ فروزاں آفتاب ہے جو چمگادڑوں کی چشم پوشی سے ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ منصوبہ بناتے ہیں اور ہم بھی اپنی تدابیر کرتے ہیں۔

"کید" بقول مفرداتِ راغب، ایک قسم کی چارہ جوئی ہے اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک مذموم دوسرا پسندیدہ، اگرچہ اس کا استعمال مذموم چارہ جوئی میں زیادہ ہوتا ہے لیکن ممدوح چارہ جوئی میں بھی ہوتا ہے مثلاً (کذالک کدنا لیوسف) ہم نے اس طرح یوسف کے لیے چارہ جوئی کی۔ (یوسف ۔ ۷۶)۔

دشمنوں کے کید و مکر کی مراد زیر بحث آیت میں واضح ہے۔ یہ وہی صورتِ حال ہے جس کے کچھ عنوانات کے متعلق ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور قرآن ان کی ایذا رساں سازشوں اور شرارت پر مبنی واقعات سے پُر ہے۔ باقی رہا خدائی کید، اس سے یہاں کیا مراد ہے؟

بعض نے یہاں کہا ہے کہ وہی مہلت دیتا ہے جو دردناک عذاب پر منتہی ہوتی ہے اور بعض نے خود عذاب کے معنی میں سمجھا ہے۔ لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ مراد وہی الطاف الٰہی ہیں جو پیغمبرؐ اور مومنین کے شامل حال تھے اور دشمنانِ اسلام کو غافل کر دیتے اور ان کی کوششوں کو ختم کر دیتے۔ ان کی سازشوں کو درہم برہم کر دیتے جس کے نمونے تاریخِ اسلام میں بہت زیادہ ہیں۔

ان آیات میں خصوصیت کے ساتھ پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ کافروں سے لطف و مدارت سے پیش آ، انہیں مہلت دے اور ان کے فنا ہو جانے کے بارے میں عجلت سے کام نہ لے۔ انہیں چھوڑ دے کہ کافی حد تک اتمامِ حجت ہو جائے اور انہیں رہنے دے تاکہ جو لوگ مختصر سی آمادگی بھی رکھتے ہوں وہ آخر کار مشرف بہ اسلام ہو جائیں۔

اصولی طور پر جلد بازوہ ہوتا ہے جو فرصتوں کے خوف اور امکانات کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ رکھتا ہے اور یہ چیز خداوندِ قادر و قاہر کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔

قابلِ توجہ یہ کہ فرماتا ہے: (فمهل الكافرين) "کافروں کو مہلت دے" اور دوبارہ تاکید کرتے ہوئے کہتا ہے (امهلهم) "انہیں مہلت دے"

ان میں سے ایک باب تفعیل سے ہے اور دوسرا افعال سے اور اس کی تکرار تاکید کے لیے ہے، بغیر اس کے کہ لفظ کی تکرار ہو اور اس کے کانوں کو بوجھ محسوس ہو۔

"رویدا"، "رود" (بروزن عود) کے مادہ سے آمد و رفت رکھنے اور کسی کام کو نرمی سے انجام دینے کے معنی میں ہے۔ یہاں اس کے مصدری معنی مراد ہیں اور تصغیر کا پہلو لیے ہوتے ہیں[1] یعنی انہیں تھوڑی سی مہلت دے

---

[1] اس بنا پر رویدًا یہاں مفعول مطلق کا جانشین ہے اور حقیقت میں ایسا ہے جیسا کہ کہا جائے امهلهم امهالا قليلا اور یہ جو بعض نے احتمال پیش
(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس طرح خدا اس مختصر سے جملے میں اپنے پیغمبر کو تین مرتبہ ان سے مدارات کرنے اور انہیں مہلت دینے کی ہدایت کرتا ہے۔ یہ تمام مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے کہ وہ اپنے کاموں میں، خصوصاً جبکہ ان کا دشمن سے مقابلہ ہو، اس وقت حوصلہ اور صبر و شکیبائی سے کام لیں اور ہر قسم کی جلد بازی سے پرہیز کریں۔ کوئی بے محل اقدام نہ کریں اور ہر کام کا منصوبہ بنائیں۔ علاوہ ازیں دین حق کی تبلیغ کی راہ میں ہمیشہ جلد بازی سے پرہیز کریں تاکہ وہ تمام افراد، جن کی ہدایت کا احتمال موجود ہے ایمان لے آئیں اور باقی تمام افراد کے بارے میں اتمام حجت ہو جائے۔

یہ بات کہ یہ مہلت کم اور مختصر کیوں شمار کی گئی ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اسلام مختصر سی مدت میں دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو گیا تھا اور کافروں کے منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔ انہوں نے پہلی ضرب کا مزہ جنگ بدر میں چکھا۔ اس کے بعد بہت جلد میدان احزاب و خیبر و حنین وغیرہ میں ان کے ارادے خاک میں ملے۔ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں نورِ اسلام سارے جزیرۃ العرب پر چھا گیا اور ایک صدی گزرنے سے پہلے دنیا کے اُس دَور کے عمدہ اور اہم حصوں پر اس نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ یا پھر اس وجہ سے ہے کہ قیامت کا عذاب بھی نزدیک ہے اور اصولی طور پر جو کچھ قطعی ہو وہ نزدیک شمار ہوتا ہے۔

بہرحال یہ سورہ آسمان اور ستاروں کی قسم سے شروع ہوتا ہے اور سازش کرنے والے حقیقت کے دشمن کفار کی تہدید پر ختم ہوتا ہے۔ درمیان میں معاد و قیامت کے خوبصورت اور مؤثر دلائل اور انسانوں پر نگہبانوں کے تقرر کے بارے میں پُرلطف بیانات ہیں۔ نیز مومنین کی تشفی و دلداری ہے۔ یہ تمام عنوانات مختصر قسم کی عبارتوں کے ساتھ، جو نہایت ہی لطیف ہے اور مخصوص قسم کی قاطعیت لیے ہوئے ہیں، بیان ہوئے ہیں۔

خداوندا! دشمنوں کے کید و مکر کا رُخ، جو ہمارے زمانے میں بہت زیادہ ہو گیا ہے، خود انہی کی طرف کر دے اور ان کے منحوس منصوبے نقش بر آب کر دے۔

پروردگارا! جس روز اسرار کھل جائیں گے اس روز ہمیں شرمندہ نہ کیجئو۔

بارالٰہا! ہم تیرے علاوہ کوئی قوت، ناصر اور مددگار نہیں رکھتے۔ ہمیں اپنے غیر کے سپرد نہ کیجئو۔

آمین یارب العالمین

سورۂ طارق کا اختتام

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کیا ہے کہ رویدًا یہاں امر کے معنی رکھتا ہے اسی لیے تین امر پے در پے آئے ہیں، بعید نظر آتا ہے البتہ رویدا امر کے معنی میں اور اسم مفعول کی شکل میں بھی آیا ہے لیکن زیر بحث آیت سے مناسب اور اس لفظ کے منصوب ہونے کے ساتھ موزوں یہی ہے کہ مفعول مطلق ہو۔

سورۂ اعلیٰ

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اس میں ۱۹ آیتیں ہیں

تاریخِ ابتدا : ۲۴ رشعبان / ۱۴۰۷ھ

سورۂ اعلیٰ کے مضامین اور ان کی فضیلت

اس سورہ کے درحقیقت دو حصّہ ہیں۔ ایک حصّہ تو وہ ہے جس میں روئے سخن خود پیغمبرؐ کی طرف ہے اور ان کے لیے تسبیح پروردگار اور ادائے فرضِ رسالت کے سلسلہ میں احکام جاری کیے گئے ہیں۔ اُس حصہ میں خدائے بزرگ و برتر کے سات اوصاف شمار کرائے گئے ہیں۔

دوسرا حصّہ وہ ہے جو خوف خدا رکھنے والے مومنین اور شقی القلب کفار کی بات کرتا ہے۔ اس حصہ میں ان دونوں گروہوں کی سعادت و شقاوت کے عوامل و اسباب اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

سورہ کے آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ مطالب صرف قرآن ہی میں نہیں آئے بلکہ وہ حقائق ہیں جن پر گزشتہ کتب و صحف اور صحفِ ابراہیم و موسیٰ میں بھی تاکید آئی ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ہم تک بہت سی روایات پہنچی ہیں۔ ایک حدیث ہمیں پیغمبر اسلامؐ کی ملتی ہے کہ آپ نے فرمایا:

(من قرأ ھا اعطاہ اللہ عشر حسنات بعدد کل حرف انزل اللہ علیٰ ابراھیم و موسیٰ و محمّد (صلواۃ اللہ علیھم) "جو شخص سورہ اعلیٰ کی تلاوت کرے خدا ہر اس حرف کے بدلے جو اس نے ابراہیم، موسیٰ اور محمدؐ پر نازل کیا ہے دس نیکیاں اسے عطا فرمائے گا"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ (من قرأ سبح اسم ربك الاعلیٰ فی فرائضه او نوافله قیل له یوم القیامة ادخل الجنة من ای ابواب الجنة شئت انشاء اللہ) جو شخص اپنے فرائض یا نوافل میں سورہ اعلیٰ کی تلاوت کرے تو قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جا (انشاء اللہ)[2]

متعدد روایات میں آیا ہے کہ جس وقت پیغمبرؐ یا ائمہ ہدیٰ "سبح اسم ربك الاعلیٰ" پڑھتے تو اس کے بعد اس حکم پر عمل کرتے ہوئے فرماتے "سبحان ربی الاعلیٰ"[3]

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے بیس راتوں کو آپ کی اقتدا میں نماز پڑھی تو سوائے سبح اسم ربك الاعلیٰ کے اور کوئی سورۃ آپ نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے اگر تم جانتے کہ اس میں کیا برکتیں ہیں تو تم میں سے ہر شخص اسے دس مرتبہ پڑھتا۔ اور جو شخص اسے پڑھے گویا اس نے موسیٰ و ابراہیم کے صحف کی تلاوت کی ہے[4]

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۳۔

[2] و [3] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۳۔

[4] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۴۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مجموعہ روایات جو اس سلسلہ میں دستیاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ یہ سورہ پیغمبر اکرمؐ کو محبوب سورہ تھا (کان رسول اللہ یحب ھٰذہ السورۃ سبح اسم ربك الاعلیٰ)[1]

یہ بات کہ یہ سورہ مکی ہے یا مدنی، اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ مدینہ میں نازل ہوا۔ علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس سورہ کا پہلا حصہ مکی ہو اور دوسرا حصہ (ذیلی) مدنی۔ وہ اس لیے کہ ذیل میں گفتگو نماز اور زکوٰۃ کی ہے اور، اس تفسیر کے مطابق جو آئمہ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہے، نماز سے مراد نماز عید الفطر اور زکوٰۃ سے مراد فطرہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ نماز رمضان کے روزے، نماز عید اور زکوٰۃ فطرہ مدینہ میں نازل ہوتے ہیں[2]

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ نماز و زکوٰۃ کا حکم اس سورہ کے آخری حصہ میں ایک عام حکم کے طور پر ہے، اگرچہ نماز عید الفطر اور زکوٰۃ فطرہ اس کے ایک واضح مصداق شمار ہوتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ واضح مصداق کے ساتھ روایات اہل بیت بہت ہی فراواں ہے۔ اس وجہ سے ان مشہور علماء کا نظریہ جو کہتے ہیں کہ تمام سورہ مکی ہے بعید نظر نہیں آتا ہے بالخصوص جبکہ آغاز سورہ کی آیات اور اختتام سورہ کی آیات مکمل طور پر، مقاطع حروف کے لحاظ سے ہم آہنگ ہیں۔ لہٰذا مشکل ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ ایک حصہ مکہ میں نازل ہوا اور ایک مدینہ میں۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ مسلمانوں کا جو گروہ بھی مدینہ میں داخل ہوتا تو یہی سورہ مدینہ میں لوگوں کے سامنے پڑھتا[3] پس یہ احتمال کہ اس کا صرف صدر حصہ مکہ میں اور اس کا ذیلی حصہ مدینہ میں نازل ہوا ہو، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۷۲۔

[2] المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۸۶۔

[3] تفسیر درالمنثور، ج ۶ ص ۳۴۷ یہ مفصل حدیث ہے جس کے اجمالی مفہوم کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ
۲ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ
۳ وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ۪ۙ
۴ وَالَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۪ۙ
۵ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ؕ

ترجمہ

۱ اپنے بلند مرتبہ پروردگار کے نام کی تسبیح کر (اور اسے منزہ رکھ)۔
۲ وہ خدا جس نے پیدا کیا اور منظم کیا۔
۳ اور وہ جس نے منظم کیا اور ہدایت فرمائی۔
۴ اور وہ جس نے چراگاہ کو ظاہر کیا۔
۵ پھر اسے خشک اور سیاہ قرار دیا۔

تفسیر

خداوندِ عظیم کی تسبیح کر

یہ سورہ حقیقت میں مکتبِ انبیا کی دعوتِ فکر کا نچوڑ اور خلاصے، یعنی پروردگارِ عالم کی تسبیحِ اقدس سے شروع ہوتا ہے۔

پروردگارِ عالم ابتداء میں روئے سخن پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے بلند مرتبہ پروردگار کے نام کو ہر عیب و نقص سے منزہ شمار کر" (سبح اسم ربک الاعلیٰ)۔

مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ یہاں اسم سے مراد مسمّیٰ ہے جبکہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ مراد

خود اسم پروردگار ہے، وہ نام جو مسمّٰی پر دلالت کرتا ہے۔ ان دونوں تفسیروں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں۔ بہرحال مراد یہ ہے کہ خدا کا نام بتوں کے ناموں کا ہم ردیف قرار نہ دیا جائے اور اس کی ذات پاک کو ہم ہر قسم کے عیب و نقص سے، جسم و جسمانیات کے عوارض سے اور ہر قسم کی محدودیت و نقصان سے منزہ شمار کریں بت پرستوں کی طرح نہیں جو خدا کا نام بتوں کے نام کے ساتھ لیتے تھے، یا وہ لوگ جو خدا کو جسم و جسمانیات سے منزہ خیال نہیں کرتے۔

"اعلیٰ" کی تعبیر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ وہ ہر شخص اور ہر اُس چیز سے، جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں، ہر خیال و قیاس و گمان سے اور ہر قسم کے جلی و خفی شرک سے برتر و بالا ہے۔

"ربک" (تیرا پروردگار) کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پروردگار جس کی طرف تُو لوگوں کو بلاتا ہے بت پرستوں کے پروردگار سے الگ ہے۔

رب و اعلیٰ کی دو صفتوں کے بعد ان کی وضاحت کے لیے پانچ اور صفات بیان کرتا ہے جو سب کی سب پروردگار کی اعلیٰ ربوبیت کی تشریح ہیں، فرماتا ہے: "وہ خدا جس نے پیدا کیا اور مرتب و منظم کیا" (الذی خلق فسوّٰی)۔

"سوّٰی" تسویہ کے مادہ سے نظام بخشنے اور مرتب کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے جو عالم کے تمام نظاموں پر محیط ہے۔ قطع نظر اس نظام سے جو آسمانی ستاروں پر حاکم ہے، یا جو زمینی مخلوقات پر حکم فرما ہے، انسان کی جسم و جان کے لحاظ سے۔

اور یہ جو بعض مفسرین نے صرف انسان کے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کے خاص نظام یا انسان کے راست قامت ہونے کے ساتھ تفسیر کی ہے، درحقیقت وہ اس مفہوم کے ایک محدود و مصداق کا بیان ہے۔ بہرحال عالمِ آفرینش کا نظام جو عظیم ترین آسمانی نظاموں پر حاوی ہے، پروردگار کی ربوبیت اور اس کے وجود کے اثبات کے لیے سادہ اور عام موضوعات کا موید ہے۔ مثلاً انسان کی انگلیوں کی پوروں کی لکیروں تک، جن کی جانب سورۂ قیامت میں اشارہ ہوا ہے: (بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوّی بنانہ) (قیامت۔ ۴)۔ اس مختصر سی تعبیر میں مطالب کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔

آفرینش اور خلقت کی تنظیم کے مسئلہ کے بعد حرکتِ کمالی اور اس کی راہ میں موجودات کی ہدایت کے لیے لائحہ عمل مقرر کرنے کے موضوع کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ جس نے تقدیر مقرر کی اور ہدایت فرمائی" (والذی قدّر فھدٰی)۔

تقدیر سے مراد اندازہ، اہداف و مقاصد اور روبہ عمل ہونے کے لائحہ عمل کی تعیین ہے جن کے لیے موجودات کو خلق کیا گیا ہے۔ ہدایت سے مراد وہی ہدایت تکوینی ہے جو محرکات اور قوانین کی شکل میں ہے اور جسے ہر موجود پر حاکم قرار دیا جاتا ہے (عام اس سے کہ وہ اندرونی محرک ہوں یا بیرونی)۔

مثلاً ایک طرف ماں کے پستان اور اس کے دودھ کو بچے کی غذا کے لیے پیدا کیا ہے، ماں کو شدید محبت مادری سے نوازا ہے اور دوسری طرف بچے میں محرک پیدا کیا ہے جو اسے ماں کے پستان کی طرف کھینچتا ہے۔ یہ آمادگی دونوں طرف کی قوتِ جاذبہ تمام موجودات کی راہِ مقاصد میں نظر آتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہر موجود کی ساخت کے بارے میں تدبر و تفکر کرنا اور وہ راہِ عمل جسے وہ اپنی پوری زندگی میں طے کرتا ہے، یہ دونوں باتیں اس حقیقت کا پتہ دیتی ہیں کہ نہایت باریک بینی پر مبنی ایک لائحہ عمل تجویز کیا گیا ہے، طاقتور جستِ ہدایت اس کے پیچھے ہے جو اس لائحہ عمل کے اجرا میں مدد کرتا ہے، اور یہ پروردگار کی ربوبیت کی ایک اور نشانی ہے۔

البتہ انسان کے لیے ہدایتِ تکوینی کے پروگرام کے علاوہ ایک اور قسم کی ہدایت بھی موجود ہے جو وحی اور بعثتِ انبیاء کے ذریعہ صورت پذیر ہوئی ہے۔ اس کا نام ہدایتِ تشریعی ہے۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ انسان کی ہدایتِ تشریعی بھی اس کی ہدایتِ تکوینی کی تکمیل کرتی ہے۔

اسی مفہوم کو سورہ طٰہٰ کی آیت ۵۰ میں بھی پیش کیا گیا ہے جہاں حضرت موسیٰؑ فرعون کے اس سوال کے جواب میں کہ تم دونوں کا پروردگار کون ہے؟ (فمن ربکما یا موسٰی) فرماتے ہیں (ربنا الذی اعطٰی کل شیء خلقه ثم هدٰی) "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر موجود کو اس کی خلقت کا لازمہ عطا فرمایا اور پھر اس کی ہدایت کی ہے"۔

اس بات کا مفہوم موسیٰؑ ابن عمران کے زمانہ میں یا نزولِ قرآن کے زمانہ میں اگرچہ مختصراً معلوم تھا لیکن موجودہ زمانہ میں، جبکہ انسانی علوم و دانش نے انواعِ موجودات کی شناخت کے سلسلہ میں خصوصاً پودوں اور جانداروں کے بارے میں بڑی پیش رفت کی ہے، اب بہت سی معلومات عام ہو چکی ہیں اور ہزارہا کتابیں اس تقدیر اور ہدایتِ تکوینی کے سلسلہ میں معرضِ تحریر میں آچکی ہیں۔ اس کے باوجود محققین کہتے ہیں کہ جو کچھ ابھی معلوم نہیں کیا جا سکا وہ کئی گنا زیادہ ہے۔

بعد والے مرحلہ میں گیاہ و نباتات یعنی چوپاؤں کی غذا کی طرف خصوصی اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ جو چراگاہ کو وجود میں لایا اور اسے زمین کے اندر سے باہر نکالا" (والذی اخرج المرعٰی)۔

"اخرج" کی تعبیر "اخراج" کے مادہ سے اس طرف اشارہ ہے۔ گویا یہ سب زمین کے اندر موجود تھے اور خدا نے انہیں باہر نکالا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ حیوانات کی غذا انسانی غذا کی تمہید ہے اور اس کا فائدہ آخر کار انسان کو پہنچتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "اس کے بعد خدا نے اسے خشک اور سیاہ قرار دیا" (فجعله غثاءً احوٰی)۔

"غثاء" اصل میں خشک گھاس کے معنی میں ہے جو سیلاب کے نتیجہ میں نکلتی ہے۔ وہ جھاگ جو دیگ کے جوش کھانے سے پیدا ہوتا ہے، اسے بھی غثاء کہتے ہیں۔ یہ تعبیر ہر اس چیز کے لیے کنایہ ہے جو ضائع ہو جاتی ہے۔

زیر بحث آیت میں غثا کے معنی خشک گھاس اور فضول چیز کے ہیں۔

"احوٰی" "حوہ" (بروزن قوہ) کے مادہ سے کبھی سبز رنگ اور کبھی سیاہ رنگ کے معنی دیتا ہے اور دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں، اس لیے کہ سبز رنگ جب زیادہ سبز ہو تو سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ یہ تعبیر اس بناء پر ہے کہ خشک گھاس جب اوپر تلے پڑی ہو تو آہستہ آہستہ سیاہ ہونے لگتی ہے۔ اس تعبیر کا انتخاب، باوجودیکہ خدائی نعمتوں کے بیان کے محل پر ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل تین علتوں میں سے اس کی ایک علت ہو۔

۱۔ پہلی علت یہ کہ گھاس وغیرہ کی کیفیت دنیا کے فانی ہونے کو ظاہر کرتی ہے اور انسانوں کے لیے ہمیشہ درس عبرت کا کام دیتی ہے۔ وہ سبزہ جو فصل بہار میں تر و تازہ اور مسرت بخش تھا، چند ماہ گزرنے کے بعد خشک ہو کر سیاہ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اس پر مُردنی چھا جاتی ہے۔ گویا زبانِ حال سے دنیا کی ناپائیداری اور وقت کے تیزی سے گزرنے کی داستان سناتی ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ خشک گھاس جب اوپر نیچے رکھ دی جائے اور بوسیدہ ہو جائے تو ایک قسم کی کھاد بن جاتی ہے جو نئی گھاس کو پرورش کے لیے مفید ہوتی ہے اور زمین کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔

۳۔ تیسری علت یہ ہے کہ بعض مفسرین کے مطابق اس آیت میں گھاس اور درختوں سے پتھر کے کوئلوں کی تخلیق کی طرف اشارہ ہے، اس لیے ہم جانتے ہیں کہ پتھر کا کوئلہ جو کرۂ زمین سے حاصل ہونے والی قوتوں میں سے ایک اہم ترین قوت ہے، انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی صنعتوں اور کارخانوں میں اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا چکا ہے اور اب بھی اٹھاتا ہے۔

یہ کوئلہ گیاہ اور درختوں کا باقی ماندہ حصہ تھا جو کئی ملین سال سے خشک ہو کر زمین میں دفن ہو گیا اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ پتھر بن کر سیاہ رنگ اختیار کر چکا ہے۔ بعض ماہرین کا نظریہ ہے کہ وہ چراگاہیں جو موجودہ زمانے میں پتھر کے کوئلے کی شکل اختیار کر کے نکل آئی ہیں تقریباً ڈھائی ملین سال پہلے موجود تھیں اور پھر زمین میں دفن ہو گئیں۔

یہ چراگاہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر موجودہ زمانے میں پتھر کے کوئلہ کا مصرف ہم اپنی نگاہ میں رکھیں تو وہ چار ہزار سال سے زیادہ دنیا کے لوگوں کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے[1]

آیت کی تفسیر خصوصیت کے ساتھ آخری معنی کے حوالہ سے بعید از قیاس نظر آتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ آیت کے جامع معانی ہوں، جس میں تینوں تفسیریں جمع ہوں۔

بہرحال (غثاءً احوٰی) "خشک سیاہ رنگ کی گھاس" بہت سی منفعتیں رکھتی ہے۔ سردی کے زمانے میں جانوروں کی مناسب غذا بھی ہے، انسان کے لیے آگ کی فراہمی کا ذریعہ بھی اور زمینوں کے لیے مناسب کھاد بھی ہے۔

---

[1] آخری تفسیر کتاب "قرآن برفراز اعصار" تالیف ع نوفل ترجمہ بہرام پور میں بیان ہوئی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ سات صفتیں، جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہیں، بلند و بالا ربوبیت، خلقت، تسویہ، تقدیر، ہدایت اور گیاہ و نباتات کی تخلیق، یہ حقیقت میں پروردگار کی اعلیٰ ربوبیت کے مسئلہ کی نہایت احسن انداز میں تشریح ہے جس کا مطالعہ انسان کو خدا کے اعلیٰ مقام ربوبیت سے اچھی طرح آشنا ہے، اس کے دل میں ایمان کی روشنی پیدا کرتا ہے، خدا کی اہم ترین نعمتوں کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے اور انسان میں شکر گزاری کا احساس پیدا کرتا ہے۔

ایک نکتہ

مسئلہ تقدیر اور موجودات عالم کی عمومی ہدایت جو اوپر والی آیات میں پروردگار کی ربوبیت کے مظاہر میں شمار ہوئی ہے، ایسے مسائل میں سے ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے اور انسانی علم و دانش میں پیش رفت ہوگی اسی قدر اس میں زیادہ سے زیادہ حقائق آشکار ہوتے جائیں گے۔ علمی انکشافات ہمیں یہ امکان فراہم کرتے ہیں کہ ہم تمام ذرات عالم میں نئے، تعجب انگیز اور زیادہ شوق آور چہرے دیکھیں۔

بعض مفسرین نے یہاں مشہور ماہر حیوانات کریسی مورلیسن کی کتاب (راز آفرینش انسان) کی تحریروں سے استناد کرتے ہوئے مختلف جانداروں کے حوالے سے حیوانات کی ہدایت کے بارے میں اس عظیم راز کے نمونے پیش کیے ہیں جس کا ایک مختصر سا نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے:

۱۔ مہاجر پرندے، جو کبھی ایک سال کے اندر سمندروں، جنگلوں اور بیابانوں کا ہزارہا میل کا راستہ طے کرتے ہیں، اپنے آشیانوں کو کبھی نہیں بھولتے اور واپسی پر ٹھیک اپنے وطن پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتے سے خواہ کتنی ہی دُور کیوں نہ ہو جائیں اور تیز ہَوا انہیں کتنا ہی منتشر کیوں نہ کر دے، پھر بھی وہ ٹھیک اپنے چھتے کی طرف واپس لوٹ آتی ہیں، جبکہ انسان اپنے وطن کی طرف لوٹنے کے لیے واضح نشانیوں، پتوں اور رہنماؤں کا محتاج ہوتا ہے۔

۲۔ حشرات الارض خورد بینی آنکھیں رکھتے ہیں جن کی ساخت اور دیکھنے کی طاقت انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے جبکہ باز جیسے پرندے دور بینی آنکھ رکھتے ہیں۔

۳۔ انسان رات کے وقت اپنا راستہ معلوم کرنے کے لیے مجبور ہے کہ منبع نور سے فائدہ اٹھائے لیکن بہت سے پرندے انتہائی تاریکیٔ شب میں اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا یہ دیکھنا ایسی آنکھوں کے ذریعہ ہے جو ایسی شعاؤں کے مقابلہ میں جو سرخ رنگ سے کم ہیں، حساسیت رکھتی ہیں اور اس طرح راڈار کی دستگاہ کی مانند ہیں جن میں سے بعض کے اندر یہ دستگاہ یادگار کے طور پر رکھی ہوئی ہے۔

۴۔ کتے ایک اضافی قوت شامہ رکھنے کی وجہ سے ہر اس جانور کو جو ان کے سامنے آئے سونگھ کر پہچان لیتے ہیں، جبکہ انسان ان وسائل و ذرائع کے باوجود جو اسے میسر ہیں اس قسم کی قوت سے محروم ہے۔

۵۔ تمام جانور ان آوازوں کو سن لیتے ہیں جن کی شدت ارتعاش ہماری قوت سامعہ کی گرفت سے باہر ہے۔ ان کی

قوتِ سماعت ہماری قوتِ سماعت سے کئی گنا زیادہ ہے۔ انسان اپنی اس کوتاہی کی تلافی علمی وسائل و آلات کے ذریعہ کر سکا ہے اور مکھی کے پروں کی آواز جو اس سے کئی کلومیٹر دور ہو، اس طرح سن سکتا ہے گویا یہ آواز اس کی کان کی لو کے نزدیک ہے۔ شاید انسان اور حیوان کی قوت وطاقت وسماعت کا یہ فرق، جو خدا نے دونوں میں رکھا ہے' اس بنا پر ہے کہ انسان علم وعقل کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر سکتا ہے جب کہ حیوان اس سے محروم ہیں۔

۶۔ چھوٹی مچھلی کی ایک قسم ہے جو سالہا سال سمندر میں زندگی گزارتی ہے۔ اس کے بعد تخم ریزی کے لیے اُس نہر یا دریا کی طرف لوٹ جاتی ہے جس میں وہ پیدا ہوئی ہے۔ یہ مچھلی امواج کے برعکس بڑھتی ہے اور اپنے اس اصلی وطن کو، جو اس کی پرورش سے مناسبت رکھتا ہے کئی سال دور فاصلہ پر رہنے کے باوجود اسے تلاش کر لیتی ہے۔

۷۔ پانی کے بعض جانوروں کی داستان اس سے زیادہ عجیب ہے۔ وہ اپنے راستے کو اس طریقہ کے برعکس طے کرتے ہیں۔

۶ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ
۷ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ؕ
۸ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۚ
۹ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ؕ
۱۰ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۙ
۱۱ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ
۱۲ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۚ
۱۳ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ؕ

ترجمہ

۶ ہم عنقریب تیرے سامنے (قرآن کو) پڑھیں گے اور تُو اسے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔
۷ مگر جو کچھ خدا چاہے۔ وہ آشکار اور پنہاں کو جانتا ہے۔
۸ اور ہم تمہیں ہر اچھے کام کے انجام دینے کے لیے آمادہ کریں گے۔
۹ تو جہاں تک سمجھانا مفید ہو، سمجھاتے رہو۔
۱۰ اور عنقریب وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں متذکر ہوں گے۔
۱۱ لیکن زیادہ بدبخت لوگ اس سے دُوری اختیار کرتے ہیں۔
۱۲ وہی جو بہت بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

(۱۳) پھر اس آگ میں نہ مرے گا، نہ زندہ رہے گا۔

تفسیر

ہم تجھے ہر اچھے کام کے لیے آمادہ کریں گے

گزشتہ آیتوں میں پروردگار کی ربوبیت اور توحید کے بارے میں گفتگو تھی۔ اس کے بعد زیر بحث آیات میں قرآن اور پیغمبر کی نبوت کی بات ہو رہی ہے۔ گزشتہ آیات میں عام موجودات کی ہدایت کے متعلق گفتگو تھی اور زیر بحث آیات میں نوع انسانی کی ہدایت کی بات ہے۔ خلاصہ یہ کہ گزشتہ آیات میں پروردگار علی و اعلیٰ کی تسبیح کا ذکر آیا تھا اور ان آیات میں اس قرآن کی بات ہے جو اس تسبیح کو بیان کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "ہم عنقریب تیرے لیے قرأت کریں گے اور تو کبھی نہیں بھولے گا" (سنقرئک فلا تنسٰی)۔ اس بنا پر نزول وحی کے وقت عجلت سے کام نہ لے اور آیات الٰہی کے بھول جانے کے بارے میں کبھی پریشان نہ ہو۔ وہ ذات جس نے یہ عظیم آیات انسانوں کی ہدایت کے لیے تجھ پر نازل کی ہیں، وہ ان کا محافظ و نگہبان بھی ہے۔ وہ ان آیات کا نقش تیرے مبارک سینے میں اس طرح ثبت کرے گا کہ نسیان کا گرد و غبار اسے کبھی مکدر نہیں کرے گا۔

یہ اس مفہوم کی نظیر ہے جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴ میں آیا ہے (ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضٰی الیک وحیہ وقل رب زدنی علما) "قرآن پڑھنے کے سلسلہ میں اس سے پہلے کہ اس کی وحی تجھ پر تمام ہو، جلدی نہ کرو اور کہہ پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما"۔

پھر سورہ قیامت کی آیت ۱۶۔۱۷ میں ہم پڑھتے ہیں: (لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرآنہ) "اپنی زبان کو قرآن کے ساتھ حرکت نہ دے اس سے پہلے کہ وحی تجھ پر تمام ہو۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو جمع کریں اور تیرے سامنے پڑھیں"۔

اس کے بعد خدا کی قدرت کو ثابت کرنے اور یہ کہ جو کچھ خیر و برکت ہے وہ اسی کی طرف ہے، مزید کہتا ہے "تو آیات الٰہی میں سے کسی چیز کو نہیں بھولے گا، مگر وہ جسے خدا چاہے۔ اس لیے کہ وہ آشکار و پنہاں کو جاننے والا ہے (الا ماشاء اللہ انہ یعلم الجہر وما یخفٰی)۔

اس تعبیر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پیغمبرؐ آیات الٰہی میں سے کسی چیز کو بھول جائیں گے، یا ان کی گفتگو سے اطمینان سلب ہو جائے گا۔

مقصود کلام یہ ہے کہ آیات الٰہی کو یاد رکھنے کی نعمت خدا کی طرف سے ہے، لہٰذا جس وقت وہ چاہے اسے پیغمبرؐ سے چھین سکتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں ہدف و مقصد خدا کے علم ذاتی اور اس کے پیغمبرؐ کے علم وہبی کے درمیان جو فرق ہے اس کو بیان کرنا ہے۔

یہ آیت حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ ہود کی آیت ۱۰۸ میں اہلِ بہشت کے جنت میں ہمیشہ رہنے کے بارے میں آئی ہے (واما الذین سعدوا ففی الجنة خالدین فیھا ما دامت السماوات والارض الّا ما شاء ربک عطاء غیر مجذوذ) "سعادت مند ہمیشہ جنت میں رہیں گے، جب تک کہ آسمان و زمین قائم ہیں، مگر وہ جو تیرا پروردگار چاہے، یہ عطا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی"۔

یہ طے شدہ بات ہے کہ اہلِ جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور آیت کا آخری حصہ گواہ ہے۔ (الّا ما شاء ربک) کا جملہ خدا کے ارادہ و حاکمیت کی قدرت کی طرف اشارہ ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ ہر چیز اس کی مشیت سے ربط رکھتی ہے، اپنی ابتداء خلقت میں بھی اور بقاء و استمرار میں بھی۔

من جملہ ان امور کے جو اس موضوع کے گواہ ہیں یہ ہے کہ بعض مسائل کو یاد رکھنا اور بعض کو بھول جانا تمام انسانوں میں موجود ہے اور یہ کوئی امتیاز و خصوصیت نہیں ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کے لیے ایک نعمت کے طور پر بیان کرے۔ لہٰذا مراد تمام آیاتِ قرآن اور احکام و معارف اسلام کا حفظ اور یاد رکھنا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس استثناء سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کے معنی اور تلاوت دونوں منسوخ ہو گئے ہیں لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے۔ اصولی طور پر اس قسم کی آیات کا وجود ہی ثابت نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ استثناء قرأت سے متعلق ہے۔ اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم عنقریب تیرے لیے قرأت کریں گے اور اپنی آیات کو بیان کریں گے، مگر وہ آیات جن کے بارے میں تیرے پروردگار نے ارادہ کیا ہے اور اس کے علم مخزون میں پوشیدہ رہ جائیں۔ یہ تفسیر بھی آیات کے سیاق کی طرف توجہ کرتے ہوئے بعید نظر آتی ہے۔ (انه یعلم الجهر وما یخفیٰ) کا جملہ حقیقت میں اس مفہوم کی علت کا بیان ہے جو سنقرئک کے جملہ میں آیا ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا جو تمام آشکار و پنہاں حقائق سے باخبر ہے، وہ تجھ پر نوعِ بشر کی احتیاجات میں سے باقی رہ جانے والی چیزیں وحی کے ذریعہ القا کرتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرے گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مراد یہ ہو کہ پیغمبرؐ وحی کے حصول میں عجلت نہ کریں اور بھول چوک کا خوف نہ رکھیں، اس لیے کہ وہ خدا، جو آشکار و پنہاں حقائق کا عالم ہے، اس نے وعدہ کیا ہے کہ پیغمبر کو نسیان نہیں ہوگا۔

بہرحال یہ پیغمبرِ اسلامؐ کا ایک معجزہ ہے کہ طولانی آیات کو جبرائیلؑ کے ایک ہی مرتبہ تلاوت کرنے سے یاد کر لیتے، ہمیشہ یاد رکھتے اور کوئی بات بھی نہیں بھولتے تھے۔

اس کے بعد پیغمبر کی دلداری کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ہم تجھے ہر اچھے کام کے انجام دینے کی توفیق دیں گے" (ونیسرک للیسریٰ) [1]

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ واقعی آیت کا مفہوم ونیسر الیسری لک تھا، اور تاکید کے عنوان سے تقدیم و تاخیر ہوئی ہے اور نیسرک للیسری ہو گیا ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ نیسرک توفقک کے معنی میں نہ ہو ورنہ تقدیم و تاخیر کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں مقصودِ کلام یہ ہے کہ اس راستہ میں جو تجھے درپیش ہے بہت سی سختیاں اور مشکلات ہیں، وحی کے اخذ کرنے اور اسے یاد رکھنے کی راہ میں بھی، تبلیغ رسالت میں بھی اور اچھے کام انجام دینے میں بھی۔ ہم ان تمام امور میں (وحی کے حصول، اس کی تبلیغ، نشر و اشاعت، تعلیم دینے اور اس پر عمل کرنے میں) تیری مدد کریں گے اور مشکلات کو تجھ پر آسان کر دیں گے۔

یہ جملہ، ہوسکتا ہے کہ دعوتِ فکرِ پیغمبرؐ کے نفس مضمون، پیغمبرؐ کی ذمہ داریوں اور خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے لائحہ عمل کی طرف بھی اشارہ ہو، یعنی اس کا محتوا و مضمون آسان ہے، اس کی شریعت شریعتِ سہلہ ہے اور اس خدائی دین میں حوصلہ شکن تکلیفیں اور ذمہ داریاں نہیں ہیں۔

اس بنا پر مندرجہ بالا آیات کا ایک بہت ہی وسیع مفہوم ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے اسے اس کی ایک ہی جہت میں محدود کر دیا ہے، اور واقعی اگر خدا کی مدد، توفیق اور نصرت نہ ہوتی تو ان تمام مشکلات پر پیغمبرؐ کا قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ خود پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی بھی اس حقیقت کی تعلیم کا ایک نمونہ تھی۔ آپ کسی چیز میں بھی، قطع نظر اس سے کہ لباس، خوراک، سواری یا زندگی کے دوسرے وسائل میں سخت گیر نہیں تھے۔ ہر مناسب غذا کھا لیتے، ہر قسم کا لباس جو باعثِ عیب و نقص نہ ہوتا، زیبِ تن فرما لیتے، کبھی بستر پر آرام کرتے، کبھی عام فرش پر، حتیٰ کہ کبھی بیابان کے ریت پر۔ نیز آپ ہر قسم کے تعلق اور تقید سے آزاد تھے۔

پیغمبرِ اسلامؐ پر وحی آسمانی کی موہبت و نعمت اور آپ کے لیے توفیق اور تسہیل امور کے وعدے کے بیان کرنے کے بعد آپ کی اہم ترین ذمہ داری کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "پس تذکر کر اگر تذکر مفید ہو" (فذکر ان نفعت الذکریٰ)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تذکر بہر حال مفید ہے۔ وہ افراد جو اس سے کسی طرح بھی مستفید نہ ہوں، وہ بہت کم ہیں۔ علاوہ ازیں اور کچھ نہیں تو کم از کم منکرین پر اتمامِ حجت کا سبب تو ہے، جو بجائے خود ایک بہت بڑی منفعت ہے[1]

جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ آیت میں کچھ محذوف ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تذکر کر اور یاد دہانی کرا چاہے مفید ہو یا نہ ہو (فذکر ان نفعت الذکریٰ او لم تنفع) یہ حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نحل کی آیت ۸۱ میں آئی ہے (وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر) خدا نے تمہارے لیے پیراہن قرار دیئے ہیں جو تمہیں گرمی (سردی)

---

[1] اور یہ جو قرآن کہتا ہے سواء علیہم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون) ان کے لیے برابر ہے چاہے تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے (بقرہ - ۶) یہ لوگوں کی صرف ایک اقلیت کے لیے ہے، ورنہ اکثریت بہر حال اچھی باتوں کا اثر لیتی ہے۔ البتہ بعض لوگ بہت زیادہ اور اس کے برعکس بعض لوگ بہت کم اثر لیتے ہیں۔ لیکن بہر حال سنجیدہ باتیں عام طور پر اثر کرتی ہیں۔ اس وجہ سے یہاں جملہ شرطیہ قید غالب کی قبیل سے ہے جو اثر نہیں رکھتی۔

سے محفوظ رکھتے ہیں۔

اس آیت میں صرف گرمی کا ذکر ہوا ہے اور سردی قرینہ تقابل سے معلوم ہوتی ہے لیکن بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ جملہ شرطیہ یہاں مفہوم رکھتا ہے اور مراد یہ ہے کہ وہاں تذکر کر جہاں مفید ہو اور جہاں اس کا کوئی فائدہ نہ ہو تو پھر اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ "ان" یہاں شرطیہ نہ ہو بلکہ "قد" کے معنی میں تاکید و تحقیق کے لیے ہو، اور جملہ کا مفہوم یہ ہو کہ تذکر کر کیونکہ تذکر مفید و فائدہ بخش ہے۔ ان چاروں تفسیروں میں سے سب سے زیادہ مناسب پہلی تفسیر ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کا لائحہ عمل بھی اس پر گواہ ہے کہ وہ اپنی تبلیغات و تذکرات کے لیے کسی قسم کی قید و شرط کے قائل نہیں تھے۔ سب کو وعظ و نصیحت کرتے اور خوف خدا دلاتے تھے۔

بعد والی آیت میں تذکر، وعظ اور انذار کے مقابلہ میں لوگوں کے ردعمل کو پیش کرتا ہے اور انہیں دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتا ہے: "عنقریب وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں اور مسئولیت و ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں، متذکر ہوں گے" (سیذکر من یخشی)۔

جی ہاں! جب تک روح میں خوف خدا اور خشیت الٰہی نہ ہو، یا دوسرے لفظوں میں حق طلبی اور حق جوئی کی روح انسان میں نہ ہو، جو تقویٰ کا ایک مرتبہ ہے تو مواعظ الٰہیہ اور تذکرات انبیاء فائدہ نہیں پہنچاتے۔ اسی لیے سورہ بقر کے آغاز میں پروردگار قرآن کو پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: (ھدی للمتقین) ایک بعد والی آیت میں دوسرے گروہ کو پیش کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے: "لیکن زیادہ بدبخت افراد اس سے دُوری اختیار کرتے ہیں" (و یتجنبھا الاشقی)[1]

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ آیت (سیذکر من یخشی) عبداللہ ابن مکتوم، پاک دل و حق طلب نابینا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ (و یتجنبھا الاشقی) ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے بارے میں ہے، جو کفار و مشرکین کے سرغنہ تھے۔[2]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اشقیٰ سے مراد یہاں معاندین اور دشمنان حق ہیں، اس لیے کہ لوگوں کے تین گروہ ہیں: ایک عارف و آگاہ گروہ، دوسرا متوقف اور شک کرنے والا گروہ اور تیسرا دشمنی کرنے والا گروہ۔ فطری و طبعی امر ہے کہ پہلا اور دوسرا گروہ تو فہمائش سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صرف تیسرا گروہ ہے جو مثبت فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ان کے بارے میں فہمائش کی تاثیر صرف وہی اتمام حجت ہے جس کا ذکر کیا گیا۔

---

[1] یتجنبھا کی ضمیر ذکریٰ کی طرف لوٹتی ہے جو گزشتہ آیات میں آیا ہے (غور کیجئے)۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۱۱۰، دوسرا حصہ تفسیر کشاف و روح المعانی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ تیسرے گروہ کو بھی اپنی فہمائش سے مستفید فرماتے تھے، لیکن وہ لوگ دُوری اختیار کرتے اور روگرداں ہوتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں شقاوت وخشیت کا نقطۂ مقابل قرار دیا گیا ہے جبکہ قاعدۃً اسے سعادت کے مقابلہ میں قرار پانا چاہیئے تھا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش بختی کا اصل سبب مسئولیت و ذمہ داری کا احساس اور خشیت ہی ہے۔

بعد والی آیت میں آخری گروہ کی سرنوشت اس طرح بیان فرماتا ہے: "وہ شقی جو دوزخ کی عظیم آگ میں داخل ہوگا اور وہاں قرار پائے گا" (الذی یصلی النار الکبریٰ)۔ پھر اس آگ میں ہمیشہ رہے گا، نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ (ثم لا یموت فیھا ولا یحیٰی)۔ یعنی نہ تو مرے گا تاکہ آسودہ ہو اور نہ اس حالت کو جس میں وہ ہوگا زندگی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندگی اور موت کے درمیان ہاتھ پاؤں مارتا رہے گا جو کیفیت ایسے افراد کے لیے بدترین بلا ومصیبت ہے۔

(النار الکبریٰ) سے کیا مراد ہے؟ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جہنم کا سب سے نچلا طبقہ اسفل السافلین ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ شقی ترین اور معاند ترین لوگ ہیں۔ لہٰذا ان پر نازل ہونے والا عذاب بھی سخت ترین اور ہولناک ترین ہونا چاہیئے۔ لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آگ کی لفظ کبریٰ کے ساتھ توصیف آتشِ صغریٰ کے مقابلہ میں ہے یعنی اس دنیا کی آگ کے مقابلہ میں، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

(ان نارکم ھذہ جزء من سبعین جزء من نار جھنم وقد اطفئت سبعین مرۃ بالماء ثم التھبت ولولا ذالک ما استطاع ادمی ان یطیقھا)۔ "یہ تمہاری آگ جہنم کی آگ کے ستر اجزا میں سے ایک ہے۔ وہ پانی سے ستر مرتبہ دھوئی گئی پھر بھی وہ بھڑک اٹھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر کوئی آدمی اس کے تحمل کی طاقت نہ رکھتا اور اس کے قریب نہ ٹھہر سکتا"[1]

مشہور دعائے کمیل جو امیر المومنین حضرت علیؑ سے منقول ہے اس میں دنیا کی آگ اور آخرت کی آگ کے موازنہ میں ہم پڑھتے ہیں (علیٰ ان ذالک بلاء ومکروہ قلیل مکثہ یسیر بقائہ قصیر مدتہ) یہ ایسی بلا اور مکروہ و ناپسندیدہ چیز ہے جس میں توقف کم ہے، اس کی بقا مختصر ہے اور اس کی مدت تھوڑی ہے۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۸ ص ۲۸۸ حدیث ۲۱۔

(۱۴) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ
(۱۵) وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ
(۱۶) بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ
(۱۷) وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ
(۱۸) اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ
(۱۹) صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ۚ

ترجمہ

(۱۴) یقیناً وہ رستگار ہوگا جو تزکیہ کرے۔
(۱۵) اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرے اور نماز پڑھے۔
(۱۶) بلکہ تم دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھتے ہو۔
(۱۷) جبکہ آخرت زیادہ پائیدار اور بہتر ہے۔
(۱۸) یہ احکام پہلی آسمانی کتب میں آچکے ہیں۔
(۱۹) کتب ابراہیم و موسیٰ میں۔

تفسیر

وہ دستور العمل جو تمام آسمانی کتب میں آیا ہے

گزشتہ آیات میں کفار اور دشمنانِ حق کے بارے میں سخت سزا کا اشارہ ہوا ہے۔ زیرِ بحث آیات میں اہلِ ایمان کی نجات اور اس نجات کے اسباب و عوامل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:
"یقیناً وہ شخص فلاح پائے گا جو اپنا تزکیہ کرے" (قد افلح من تزکّٰی)۔ اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر

کرے اور اس کے بعد نماز پڑھے (و ذکر اسم ربہ فصلّٰی)۔ اس طرح فلاح و رستگاری اور کامیابی و نجات کے عوامل ان تین چیزوں کو بتایا ہے۔ تزکیہ، نام خدا کا ذکر اور اس کے بعد نماز پڑھنا۔

تزکیہ سے مراد کیا ہے؟ اس سلسلہ میں علماء نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ پہلی روح کو نجاست شرک سے پاک کرنا ہے، گزشتہ آیات کے قرینہ سے، نیز اس قرینہ سے بھی کہ اہم ترین تطہیر شرک سے تطہیر ہے۔

دوسری یہ کہ تزکیہ سے مراد دل کو اخلاقی رذائل سے پاک کرنا اور اعمال صالح بجالانا ہے۔ قرآن مجید میں آیات فلاح کے نقطہ نظر سے دوسری آیات کے علاوہ سورۂ مومنین کے آغاز کی آیتیں ہیں جو فلاح کو اعمال صالح کی روح قرار دیتی ہیں اور سورہ شمس آیہ ۹ کے حوالے سے جس میں تقویٰ اور فجور کے بیان کے بعد فرماتا ہے: (قد افلح من زکّٰھا) وہ فلاح پایا جس نے اپنے نفس کو فسق و فجور اور دوسرے بُرے اعمال سے پاک کیا اور تقویٰ سے آراستہ کیا۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ تقویٰ سے مراد زکوٰۃ فطرہ دینا ہے۔ عید فطر کے دن پہلے زکوٰۃ فطرا دا کی جائے، پھر نماز عید پڑھی جائے۔ جیسا کہ متعدد روایات میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے[1] اور یہی معانی منابع اہل سنت میر امیرالمومنینؑ سے منقول ہیں[2]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ اعلیٰ مکی ہے اور مکہ میں نہ زکوٰۃ فطرہ مقرر ہوئی تھی، نہ ماہ رمضان کے روزے، نہ نماز عید ہی اور فطرہ کے مراسم۔ اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں ہے کہ اس سورہ کا پہلا حصہ مکہ میں نازل ہوا ہو اور ذیلی حصہ مدینہ میں۔

یہ احتمال بھی قوی طور پر موجود ہے کہ مندرجہ بالا تفسیر ایک واضح مصداق کے بیان کی قبیل سے ہو اور آیت کی تطبیق کسی واضح فرد پر ہو۔ بعض نے یہاں تزکیہ کو مالی صدقہ دینے کے معنی میں سمجھا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تزکیہ کے وسیع معانی ہیں۔ یہ روح سے شرک کی آلودگی کو دور کرنے کے معنی میں بھی ہے، اخلاق رذیلہ سے خود کو پاک کرنے کے معنی میں بھی، ہر قسم کے مکر و ریا سے پاک کرنے کے معنی میں بھی اور راہ خدا میں زکوٰۃ دے کر مال و جان کی تطہیر کے معنی میں بھی۔ لہٰذا سورہ توبہ آیہ ۱۰۳ (خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا) "ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) لے تاکہ انہیں اس کے ذریعہ پاک کرے اور ان کا تزکیہ کرے" کے مطابق زکوٰۃ کا دینا روح و جان کی پاکیزگی کا سبب ہے۔

اس بناء پر تمام تفسیریں آیت کے وسیع معنی کے اعتبار سے ممکن ہے کہ ٹھیک ہوں۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں پہلے تزکیہ، اس کے بعد پروردگار کا ذکر اور پھر نماز کی بات ہوئی ہے۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۵۶ حدیث ۱۹ تا ۲۱۔

[2] روح المعانی، جلد ۳۰ ص ۱۱۰ اور تفسیر کشاف، جلد ۴ ص ۷۴۰۔

بعض مفسرین کے بقول مکلف کے تین عملی مراحل ہیں۔ پہلا دل سے فاسد عقائد کا ازالہ، اس کے بعد اللہ کی معرفت اور اس کے صفات و اسماء کا دل میں حضور، اور تیسرا مشغلہ ہے "اشتغال بخدمت"۔ مندرجہ بالا آیت نے تین مختصر جملوں میں ان تینوں مرحلوں کی طرف اشارہ کیا ہے[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ نماز کا ذکر پروردگار کی فرع شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ جب تک اس کی یاد میں محو نہ ہو اور نورِ ایمان دل میں سایہ فگن نہ ہو اس وقت تک بندہ نماز کے لیے کھڑا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں وہ نماز قدر و قیمت رکھتی ہے جس کے ساتھ اس کا ذکر بھی ہو اور وہ اس کی یاد کو ساتھ لیے ہوئے ہو اور یہ جو بعض لوگوں نے ذکرِ پروردگار سے مراد صرف اللہ اکبر یا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو لیا ہے، یہ درحقیقت اس کے بعض مصادیق کا بیان ہے۔

اس کے بعد اس فلاح و رستگاری کے دستور العمل سے انحراف کے اصلی عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "بلکہ تم دنیاوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو اور اسے ترجیح دیتے ہو" (بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا) جبکہ آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے (والاٰخرۃ خیر و ابقیٰ)۔

یہ حقیقت میں وہی مفہوم ہے جو احادیث میں بھی آیا ہے (حب الدنیا رأس کل خطیئۃ) "دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے"[2]

حالانکہ عقل کبھی اجازت نہیں دیتی کہ انسان سرائے باقی کو متاعِ فانی کے بدلے فروخت کرے اور ان مختصر سی لذتوں کو جو انواع و اقسام کے درد و رنج ساتھ لیے ہوئے ہیں ان تمام جاودانی اور ہر قسم کی تکالیف سے مبرا نعمتوں پر مقدم سمجھے اور ان پر ترجیح دے۔

انجام کار سورہ کے آخر میں فرماتا ہے: "یہ احکام جو بتائے گئے ہیں اس کتابِ آسمانی ہی میں محدود نہیں ہیں بلکہ پہلی کتب اور صحف میں بھی آچکے ہیں" (ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ) یعنی صحفِ و کتب ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں۔ (صحف ابراھیم و موسیٰ)[3]

یہ بات کہ ھذا کا مشارٌ الیہ کیا ہے اس سلسلہ میں کئی نظریات موجود ہیں۔ ایک جماعت نے کہا ہے تزکیہ، نماز اور حیاتِ دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دینے کے آخری حکم کے سلسلہ میں اشارہ ہے، اس لیے کہ یہی انبیاء کی سب سے اہم اور بنیادی تعلیمات تھیں اور ان کا بیان تمام کتبِ آسمانی میں موجود ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱ ص ۱۴۷۔

[2] یہ حدیث مختلف عبارتوں کے ساتھ امام جعفر صادقؑ اور امام زین العابدینؑ سے، بلکہ تمام انبیاء سے نقل ہوئی ہے اور یہ اس کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر ہے۔ نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۵۶، ۵۵۷۔

[3] ہو سکتا ہے صحف ابراہیم و موسیٰ صحف الاولیٰ کی وضاحت ہو، یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا بیان اور واضح مصداق ہو۔ پہلی صورت میں گزشتہ تمام انبیاء کی کتب پر حاوی ہوگا اور دوسری صورت میں صرف ابراہیم و موسیٰ کے صحیفے مراد ہوں گے۔

بعض دوسرے مفسرین اس کو ساری سورۃ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، اس لیے کہ سورۃ توحید سے شروع ہوتی ہے اور نبوت کا تذکرہ جاری رکھتے ہوئے عملی دستور العمل پر ختم ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہ تعبیر بتاتی ہے کہ اس سورہ کا اہم مضمون، بالخصوص آخری آیات عالم ادیان کے اصول اساسی میں سے ہے، تمام انبیاء کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے اور یہ خود اس سورۃ کی عظمت اور ان تعلیمات کی اہمیت کی نشانی ہے۔

"صحف" صحیفہ کی جمع ہے جو یہاں لوح، تختی اور صفحہ کے معنی میں ہے جس پر کوئی چیز لکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات بتاتی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ بھی آسمانی کتابوں کے حامل تھے۔ ایک روایت حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ انبیاء کی تعداد کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا "ایک لاکھ چوبیس ہزار"۔ میں نے عرض کیا "ان میں سے رسول کتنے تھے؟" فرمایا "تین سو تیرہ اور باقی صرف نبی تھے"۔ میں نے عرض کیا "حضرت آدمؑ نبی تھے؟" فرمایا "ہاں۔ خدا نے ان سے کلام کیا اور انہیں اپنے دستِ قدرت سے خلق فرمایا"۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے مزید فرمایا: "اے ابوذر! انبیاء میں سے چار افراد عرب تھے: ہود، صالح، شعیب اور تیرا پیغمبر"۔ میں نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! خدا نے کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں؟" فرمایا "ایک سو چار کتابیں۔ دس کتابیں آدمؑ پر، پچاس کتابیں شیثؑ پر اور تیس کتابیں اخنوخ پر، جو ادریسؑ ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا۔ ابراہیمؑ پر دس کتابیں اور توریت، انجیل، زبور اور فرقانِ موسیٰؑ، عیسیٰؑ، داؤدؑ اور پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئیں"[1]

(الصحف الاولیٰ) کی تعبیر ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی کتب کے بارے میں آخری صحف کے مقابل ہے جو حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئے۔

ایک نکتہ

حُبّ الدنیا رأس کل خطیئۃ کی تحلیل

یقیناً مومن افراد کے لیے یہ قرآنی محاسبہ، جو مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے اور جو دنیا و آخرت کے موازنے کے سلسلہ میں ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے، مکمل طور پر واضح ہے۔ لیکن اس کے باوجود مومن اکثر اوقات اپنے اس علم و آگاہی کو اپنے قدموں تلے روندتا ہے اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔

اس سوال کا جواب ایک ہی جملہ میں دیا جا سکتا ہے کہ یہ سب ان خواہشات کے نتیجے میں ہوتا ہے جن کا انسان کے وجود پر غلبہ ہوتا ہے اور خواہشات کے غلبہ کا سرچشمہ بھی حُبِ دنیا ہی ہے۔ حُبِ دنیا میں یہ سب چیزیں شامل ہیں:۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۷۶۔

حُبِ مال، حُبِ مقام، شہوتِ جنسی، تفوق طلبی، تن پروری، جذبۂ انتقام اور اسی قسم کے دیگر امور جو انسان کی روح میں کبھی کبھی اس قسم کا طوفان برپا کر دیتے ہیں کہ اس کی تمام معلومات کو برباد کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کی حسِ تشخیص ہی کو ختم کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے۔

یہ جو بعض اسلامی روایات میں بارہا حُبِ دنیا کو تمام گناہوں کا سرچشمہ بتایا گیا ہے یہ ایک حقیقت واقعی ہے، جسے ہم نے خود اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگی میں بارہا آزمایا ہے۔ اسی بنا پر گناہ کی جڑوں کو کاٹنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم دنیا کی محبت اور اس کے عشق کو دل سے باہر نکال دیں۔

ہمیں چاہیئے کہ ہم دنیا کو ایک وسیلہ، رہگزر، پل اور کھیتی سمجھیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا کے عاشق، جو دو راہے پر کھڑے ہیں یعنی متاعِ دنیا کے حصول اور رضائے خدا کے حصول کا دوا ہے، وہ کسی دوسری چیز کو ترجیح دیں۔

اگر ہم اپنے جرائم کے دفتر کو دیکھیں تو مندرجہ بالا آیت کی حقیقت ہمیں اس میں اچھی طرح نظر آجائے گی۔ اگر ہم لڑائیوں، خونریزیوں اور قتل و غارت کے اسباب و علل کو موردِ توجہ قرار دیں تو ان سب میں حُبِ دنیا بنائے فساد کے طور پر ملے گی۔

باقی رہا یہ کہ حُبِ دنیا کو کس طرح دل سے نکالا جا سکتا ہے جبکہ ہم سب ابنائے دنیا ہیں اور ماں سے بیٹے کی محبت ایک امر فطری ہے۔ یہ چیز فکری تعلیم و تربیت اور تہذیبِ نفس کی متقاضی ہے۔ من جملہ ان امور کے جو حُبِ دنیا کو دل سے نکالنے کے خواہشمند لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں، اہلِ دنیا کے انجامِ کار کا مطالعہ ہے۔

فراعنہ نے باوجود قوت اور مالی وسائل کے آخر کار کیا کیا؟ قارون ان خزانوں میں سے جن کی چابیاں کئی طاقتور انسان مشکل سے اٹھا سکتے تھے، اپنے ساتھ کیا لے کر گیا؟ وہ عظیم طاقتیں جنہیں ہم اپنے زمانے میں دیکھتے ہیں ایک موج ہوا کے ذریعہ ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جاتا ہے اور صرف ایک گردشِ لیل و نہار کے نتیجے میں ان کا تختِ سلطنت الٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے قصرِ دولت و ثروت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، یا زیرِ خاک پنہاں ہو جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے لیے بہترین معلّم کا کام دے سکتی ہیں۔

اس وسیع و عریض گفتگو کو ہم امام زین العابدینؑ کی ایک بہت ہی معنی خیز حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آنجنابؑ سے کچھ لوگوں نے پوچھا "خدا کے نزدیک سب سے افضل عمل کونسا ہے"؟ آپؑ نے فرمایا:

(ما من عمل بعد معرفة الله عزوجل و معرفة رسوله افضل من بغض الدنیا) "خدا اور اس کے رسولؐ کی معرفت کے بعد بغضِ دنیا سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے"۔ اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا "محبتِ دنیا کے بہت سے شعبے ہیں اور گناہوں کے بھی بہت سے شعبے ہیں۔ سب سے پہلی چیز جس کی وجہ سے خدا کی نافرمانی ہوئی وہ ابلیس کی نافرمانی تھی، جس وقت اس نے انکار کیا اور تکبر کر کے کافرین میں سے ہو گیا۔

اس کے بعد حرص تھی جو آدمؑ و حوّا کے ترکِ اولیٰ کا سبب بنی، جس وقت کہ خداوند متعال نے ان سے فرمایا جنت کی جس جگہ سے چاہو کھاؤ لیکن اس ممنوع درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے۔ لیکن وہ اس چیز کی

طرف گئے جس کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔ یہی چیز ان کی اولاد کے لیے قیامت تک باقی رہ گئی، اس لیے کہ زیادہ تر چیزیں جو انسان طلب کرتا ہے اس کی ضرورت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ (عام طور پر ضرورتیں گناہ کا سبب نہیں ہیں۔ وہ چیز جو سبب گناہ ہے وہ ہوا و ہوس اور ضرورت سے زائد امور ہیں)۔

اس کے بعد حسد تھا جو آدمؑ کے بیٹے کا سببِ گناہ تھا۔ اس نے اپنے بھائی سے حسد کیا اور اس کو قتل کر دیا۔

اس کے شعبوں میں سے عورتوں کی محبت، دنیا کی محبت[1]، حُبِّ ریاست، حُبِّ راحت و آرام، حُبِّ گفتگو و کلام، حُبِّ برتری اور حُبِّ دولت و ثروت ہے۔ یہ سات صفات ہیں جو سب کی سب حُبِّ دنیا میں جمع ہیں۔ اسی لیے انبیاء و مرسلین اور علمائے اعلام نے اس حقیقت سے آگاہی کے لیے کہا ہے کہ "حُبُّ الدنیا راس کل خطیئۃ" ہے۔

خداوندا! دنیا کی محبت، جو تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے، اسے ہمارے دلوں سے نکال دے۔

پروردگارا! تو خود ہی تکامل و ارتقا کے پر پیچ راستے میں ہمارا ہاتھ تھام کر منزلِ مقصود تک ہماری ہدایت فرما۔

بارالٰہا! تو آشکار و پنہاں سب سے آگاہ ہے۔ ہمارے مخفی اور آشکار گناہ اپنے لطف و کرم سے بخش دے۔

آمین یارب العالمین

سورۂ اعلیٰ کا اختتام

آغاز ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۷ھ

---

[1] ایسا نظر آتا ہے کہ یہاں حُبِّ دنیا سے مراد دنیا میں باقی رہنے کی محبت ہے، جو سات شعبوں میں سے ایک شمار ہوتی ہے اور عام طور پر طویل امیدوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اصول کافی جلد ۲ باب حُبِّ الدنیا والحرص علیہا حدیث ۸۔ اصول کافی کے اس باب میں اس سلسلہ میں ۱۷ روایات نقل ہوئی ہیں جو بہت ہی اخلاقی اور تربیتی ہیں۔

سورۂ غاشیہ

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اس میں ۲۶ آیتیں ہیں
تاریخِ ابتدا یکم رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ

سورہ غاشیہ کے مشتملات اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو مکی سورتوں میں سے ہے، زیادہ تر تین محوروں کے گرد گردش کرتا ہے۔

پہلا۔ معاد و قیامت کی بحث، بالخصوص مجرموں کا دردناک انجام اور مومنوں کو ملنے والا شوق انگیز ثواب۔

دوسرا۔ توحید کی بحث جو آسمان کی خلقت، پہاڑوں اور آسمان کی آفرینش کی طرف اشارہ اور انسان کی تین موضوعات کی طرف توجہ کے بیان سے عبارت ہے۔

تیسرا۔ نبوت کی بحث، پیغمبر اسلامؐ کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں کے بیان پر مبنی ہے۔

یہ سورہ مجموعی طور پر مکی سورتوں کے مقاصد ہی کو موضوع گفتگو بناتا ہے جن سے ایمان و اعتقاد کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے "من قرأ ھا حاسبہ اللہ حسابًا یسیرًا" "جو شخص اس کی تلاوت کرے گا پروردگار عالم بروز قیامت اس کا حساب آسان کردے گا۔

ایک اور حدیث امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے "جو شخص واجب اور مستحب نمازوں میں اس سورہ کی قرأت کی پابندی کرے گا، خدا اسے دنیا و آخرت میں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا۔

یقیناً یہ سب ثواب اسی صورت میں انسان کو حاصل ہوگا جب اس کی تلاوت اس کے لیے فکر و عمل کا محرک ثابت ہو۔

ہوں گے۔ دونوں تفسیروں کے مابین جمع بھی ممکن ہے۔

چونکہ ان خوشگوار چشموں اور جنت کی شراب طہور سے فائدہ اٹھانا برتنوں کی احتیاج رکھتا ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "خوبصورت اور جاذب نظر پیالے ان چشموں کے پاس رکھے ہوں گے" (واکواب موضوعۃ)۔ جس وقت وہ ارادہ کریں گے تو پیالے چشموں سے پُر ہو کر ان کے سامنے آجائیں گے اور وہ تازہ تازہ نوش کریں گے، ایسی لذت جس کا شعور ساکنین دنیا کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اکواب جمع کوب (بروزن خوب) جو قدح، پیالے یا ایسے ظرف کے معنی میں ہے جس میں دستہ لگا ہوا ہو۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قرآن میں اہل جنت کی شراب طہور کے برتنوں کے بارے میں مختلف تعبیریں آئی ہیں یہاں اور بعض دوسری آیات میں اکواب کی تعبیر آئی ہے جبکہ بعض دوسری آیات میں اباریق (ابریق کی جمع) کی تعبیر آئی ہے، جو ایسے ظرف کے معنی میں ہے جس کا دستہ اور ٹونٹی ہو، سیال چیزوں کو انڈیلنے کی غرض سے۔ یا پھر کأس کا لفظ آیا ہے جس کے معنی شراب سے لبریز جام کے ہیں (یطوف علیھم ولدان مخلدون باکواب واباریق وکأس من معین) ان کے گرد ایسے جوان گردش کرتے ہوں گے جو ہمیشہ جوانی کی طراوت و تروتازگی کے حامل ہوں گے۔ جبکہ شراب طہور سے لبریز پیالے اور جام ان کے ہاتھ میں ہوں گے اور وہ ان کے سامنے پیش کریں گے۔ (واقعہ ۱۷، ۱۸)۔

اس کے بعد جنت کی نعمتوں کی جزئیات کے متعلق مزید نکات پیش کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: "وہاں پلنگوں پر تکیے اور گاؤ تکیے ہوں گے جو صف بستہ ہوں گے" (ونمارق مصفوفۃ)۔ نمارق نمرق (بروزن غلغل) کی جمع ہے جس کے معنی چھوٹے تکیے کے ہیں جس کا سہارا لیتے ہیں[1] اور عام طور پر مکمل استراحت کے وقت ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور مصفوفۃ کی تعبیر اشارہ ہے نظم خاص اور تعدد کی طرف جو ان پر حاکم ہے۔

یہ تعبیر بتاتی ہے کہ وہ مجالس انس تشکیل دیں گے اور یہ مجلسیں جو ہر قسم کی لغویت اور بیہودگی سے پاک ہوں گی۔ ان میں صرف الطاف الٰہی، اس کی بے پایاں نعمتوں اور دنیا کے درد و رنج اور عذاب سے نجات کے بارے میں گفتگو ہوگی، اس قدر لطف اور لذت رکھتی ہوں گی کہ کوئی چیز ان کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔

آخری زیر بحث آیت میں جنت کے قیمتی فرشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہاں گراں بہا اور خوبصورت فرش بچھے ہوئے ہوں گے" (وزرابی مبثوثۃ)۔

"زرابی" جمع ہے زربیہ کی جو ایسے قیمتی فرش کے معنی میں ہے جو نرم، راحت بخش اور بیش قیمت ہونگے۔ واضح ہے کہ ان آسائش و لذت کے وسائل و ذرائع کے برابر اور بہت سے دوسرے وسائل موجود ہوں گے جبکہ یہ گنتی نمونہ از خروارے کے مصداق ہیں۔ ان آیتوں میں جنت کی سات اہم نعمتیں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک دوسری

---

[1] صحاح اللغۃ مادہ غرق۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ الۡغَاشِيَةِ ۘ

۲ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۙ

۳ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ

۴ تَصۡلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ

۵ تُسۡقٰى مِنۡ عَيۡنٍ اٰنِيَةٍ ۘ

۶ لَيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ ۙ

۷ لَّا يُسۡمِنُ وَلَا يُغۡنِىۡ مِنۡ جُوۡعٍ ۘ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

۱ کیا غاشیہ (قیامت کا دن جس کے وحشت ناک حوادث سب کا احاطہ کر لیں گے) کی داستان تجھ تک پہنچی ہے؟

۲ چہرے اس دن خاشع اور ذلّت بار ہوں گے۔

۳ وہ جنہوں نے ہمیشہ عمل کیا ہے اور تھک چکے ہیں (اور کوئی نتیجہ انہیں حاصل نہیں ہوا)۔

۴ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

۵ انہیں حد سے زیادہ گرم چشمے سے پلایا جائے گا۔

۶ ضریع (بدبودار اور تلخ خشک کانٹے) کے علاوہ انہیں اور کوئی کھانا نہیں ملے گا۔

ایسی غذا جو نہ انہیں موٹا کرے گی اور نہ ان کی بھوک کو ختم کرے گی۔

تفسیر

بدنصیب تھکے ماندے

اس سورہ کے آغاز میں ہمارا سامنا قیامت کے ایک نئے نام سے ہوا ہے جو غاشیہ ہے۔ فرماتا ہے: "کیا غاشیہ کی داستان تجھ تک پہنچی ہے" (ھل اتٰک حدیث الغاشیۃ)۔

"غاشیۃ" غشادۃ کے مادہ سے ڈھانپنے کے معنوں میں ہے۔ قیامت کے لیے اس نام کا انتخاب اس وجہ سے ہے کہ وحشت ناک حوادث اچانک سب کو ڈھانپ لیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن اولین و آخرین حساب کے لیے جمع ہوں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ مراد اس طرح کی آگ ہے جو کافروں اور مجرموں کے چہرہ کو ڈھانپ لے گی۔

پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں مخاطب خود پیغمبرؐ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور پیغمبرِ اسلامؐ سے یہ جملہ استفہام کی شکل میں اس عظیم دن کی اہمیت کے پیشِ نظر کہا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی تجویز کیا ہے کہ اس آیت میں مخاطب ہر انسان ہے، لیکن یہ مفہوم بعید نظر آتا ہے۔ اس کے بعد مجرموں کی حالت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"چہرے اس دن خاشع اور ذلت بار ہوں گے" (وجوہ یومئذ خاشعۃ)۔ ذلتِ عذاب اور عظیم سزا کے خوف نے اس دن ان کے تمام وجود کو گھیر رکھا ہوگا۔ اور چونکہ انسان کے باطنی حالات ہر جگہ سے زیادہ اس کے چہرہ سے ظاہر ہوتے ہیں، لہٰذا خوف، ذلت اور وحشت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو اس کے تمام چہرے کو ڈھانپ لیں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "وجوہ" سے کفر کے بڑے بڑے لوگ اور سرغنے مراد ہیں جو ایک گہری ذلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔ اس وقت مزید فرماتا ہے: "یہ ایسے لوگ ہیں جو مسلسل کام کر کے تھک چکے ہیں" (عاملۃ ناصبۃ)۔ زندگانی دنیا میں بہت زیادہ کوشش کرتے ہیں، لیکن تھکن کے علاوہ انہیں کوئی فائدہ نصیب نہیں ہوتا، نہ ان کا بارگاہِ خدا میں کوئی عمل مقبول ہے اور نہ اس دولت و ثروت میں سے وہ کوئی چیز اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں جسے انہوں نے جمع کر رکھا ہے، نہ اپنے بعد وہ کوئی نیک نامی چھوڑ جاتے ہیں، نہ کوئی اولاد صالح۔ وہ محض تھک جانے والے زحمت کش ہیں۔ کتنی بہترین اور عمدہ تعبیر ہے۔ (عاملۃ ناصبۃ)

بعض مفسرین نے اس جملہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں وہ عمل کرتے ہیں لیکن اس کی

خستگی و رنج و تکلیف اپنے ساتھ آخرت میں لے جاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ مجرموں سے دوزخ میں محنتِ شاقہ لی جائے گی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عذاب جھیلیں۔

لیکن ان تینوں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

آخرکار یہ خستہ، تھکے ہوئے اور فضول کام کرنے والے زحمت کش بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور اس میں جلیں گے۔ (تصلیٰ نارًا حامیةً) "تصلیٰ" صلی (بروزن نفی) کے مادہ سے آگ میں داخل ہونے اور اس میں جلنے کے معنی میں ہے (صلی بالنار ای لزمھا واحترق بھا۔ "آگ میں ہمیشہ رہا اور جلتا رہا")

لیکن ان کا عذاب اسی پر ختم نہیں ہوگا۔ جب وہ آگ کی حرارت کی وجہ سے یاس میں مبتلا ہوں گے تو حد سے زیادہ کھولتے ہوئے چشمے سے انہیں پلایا جائے گا۔ (تسقٰی من عین انیة)۔ "انیة" مؤنث ہے انی کے (انی بروزن حلی) مادہ سے جو تاخیر میں ڈالنے کے معنی میں ہے اور کسی چیز کے بیان کرنے کے وقت کے پہنچ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں ایسے جلانے والے پانی کے معنی میں ہے جس کی حرارت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔

سورہ کہف کی آیت ۲۹ میں ہم پڑھتے ہیں (وان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل یشوی الوجوہ بئس الشراب وساءت مرتفقًا) اور اگر پانی مانگیں گے تو ان کے لیے ایسا پانی لائیں گے جو کسی پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہوگا جو ان کے چہروں کو بھون دے گا۔ وہ کتنا بُرا مشروب ہے اور وہ محلِ اجتماع کتنا بُرا ہے۔

بعد والی آیت میں ان کی خوراک کے بارے میں، جبکہ وہ بھوکے ہوں گے، مزید فرماتا ہے: "وہ ضریع کے علاوہ کوئی طعام نہیں رکھتے" (لیس لھم طعام الا من ضریع)۔ یہ ضریع کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین کے پاس مختلف تفاسیر ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک قسم کا کانٹا ہے جو زمین سے چمٹ جاتا ہے۔ اگر وہ تر ہوتا تو قریش اسے شبرق کہتے تھے اور جب خشک ہوتا تو ضریع کہتے۔ وہ ایک زہریلی گھاس ہے جسے کوئی جانور منہ نہیں لگاتا۔[1]

علمائے لغت میں سے خلیل کا کہنا ہے کہ ضریع بدبودار اور سبز گھاس ہے جو دریا سے باہر آن گرتی ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آتشِ جہنم کا ایک درخت ہے جو اگر دنیا میں ہو تو زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس سب کو جلا کر فنا کر دے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ ضریع دوزخ کی آگ میں ایک چیز ہے جو کانٹے کی طرح ہے، حنظل سے زیادہ تلخ اور مردار سے زیادہ بدبودار، آگ سے زیادہ جلانے والی ہے۔ خدا نے اس کا نام ضریع رکھا ہے۔ (الضریع شئ یکون فی النار یشبہ الشوک اشد مرارۃ من الصبر وانتن من الجیفۃ واحر من النار سماہ اللہ ضریعًا) بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ضریع ایک ذلیل غذا ہے کہ جہنمی جس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے بارگاہِ خدا میں تضرع کریں گے)[2] (ہم اس بات کو نہ بھول جائیں کہ ضرع کا مادہ ضعف، ذلت اور خضوع

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۷۱۱۹۔

[2] تفسیر قرطبی " " ص ۷۱۲۰۔

کے معنی میں ہے۔[1]

یہ تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے معنی میں یہ سب جمع ہوں۔ اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے:

"نہ وہ انہیں موٹا کرتا ہے نہ ان کی بھوک کو ختم کرتا ہے" (لا یسمن ولا یغنی من جوع)۔ یقیناً اس قسم کی غذا نہ جسم کی تقویت کے لیے اور نہ بھوک کو ختم کرنے کے لیے ہے۔ وہ ایک ایسی غذا ہے جو بجائے خود ایک عذاب ہے جیسا کہ سورہ مزمل کی آیت ۱۳ میں ہم پڑھتے ہیں:

(وطعاماً ذا غصة و عذاباً الیماً) ہمارے پاس گلے میں پھندہ لگانے والی غذائیں ہیں اور وہ دردناک عذاب ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا میں انواع و اقسام کی لذیذ، مرغن اور شیریں غذائیں دوسروں پر ظلم کر کے فراہم کی ہیں اور جنہوں نے محروم لوگوں کو ناگوار غذائیں کھانے کے علاوہ اور کسی غذا کے حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا، ضروری ہے کہ وہاں ان کی ایسی غذا ہو جو ان کے لیے عذاب الیم بنے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے جنت کی نعمتیں اور دوزخ کے عذاب دونوں ہم جیسے اسیرانِ زندگی کے لیے ناقابلِ تشریح ہیں۔ یہ سب اشارے ہیں جنہیں ہم سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

---

[1] ایک اور بحث دوزخیوں کی غذا کے بارے میں جسے قرآن کبھی ضریع، کبھی زقوم اور کبھی غسلین کے نام سے یاد کرتا ہے اور ان تعبیرات میں فرق ہے۔ یہ سب تفسیر نمونہ کی جلد ۲۴ پر سورۂ حاقہ کی آیت ۳۶ کے ذیل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

(۸) وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ
(۹) لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۙ
(۱۰) فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ
(۱۱) لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ؕ
(۱۲) فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ؕ
(۱۳) فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۙ
(۱۴) وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۙ
(۱۵) وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۙ
(۱۶) وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ؕ

ترجمہ

(۸) اُس دن کچھ چہرے شاداب ہوں گے۔
(۹) اس لیے کہ اپنی کوشش سے مسرور ہوں گے۔
(۱۰) جو بہشت عالی میں ہوں گے۔
(۱۱) جس میں تُو کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں سنے گا۔
(۱۲) اس میں چشمے جاری ہیں۔
(۱۳) اس میں خوبصورت بلند تخت ہوں گے۔
(۱۴) اور پیالے جو ان چشموں کے پاس رکھے ہوں گے۔

اور تکیے جو صف بستہ ہوں گے۔
اور بچھے ہوئے فاخرہ فرش ہوں گے۔

تفسیر

بہشت کی روح پرور نعمتوں کے مناظر

اس تشریح کے بعد جو گزشتہ آیات میں دوسری دنیا میں مجرموں اور بدکاروں کی حالت اور جہنم کے عذاب کے بارے میں آئی تھی، ان آیتوں میں نیکوکار مومنین کی حالت کی تشریح اور جنت کی بے نظیر نعمتوں کی توصیف پیش کرتا ہے تاکہ قہر کو مہر سے ملا دے اور انذار کو بشارت سے مربوط کر دے۔ فرماتا ہے:

"چہرے اس دن پُرطراوت اور مسرور ہوں گے" (وجوہ یومئذ ناعمة)۔ بدکاروں کے چہروں کے برعکس، جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے کہ وہ ذلّت و اندوہ میں غرق ہوں گے۔

"ناعمة" نعمت کے مادہ سے یہاں ایسے چہروں کی طرف اشارہ ہے جو نعمت سے سرشار، تروتازہ، شاداب اور مسرور و نورانی ہوں گے، جیسا کہ سورہ مطففین کی آیت ۲۴ میں آیا ہے کہ جنتیوں کی توصیف میں فرماتا ہے:

(تعرف فی وجوھھم نضرة النعیم) "ان کے چہروں میں تجھے طراوت اور نعمت کی شادابی نظر آئے گی"۔

یہ چہرے ایسے نظر آئیں گے کہ وہ اپنی سعی و کوشش سے راضی اور خوش ہوں گے (لسعیھا راضیة)، دوزخیوں کے برعکس جنہوں نے اپنی سعی و کوشش سے سوائے تھکن اور رنج کے اور کچھ حاصل نہیں کیا (عاملة ناصبة)

بہشتی اپنی سعی و کوشش کو احسن وجہ سے دیکھیں گے اور مکمل طور پر راضی اور خوش ہوں گے؛ ایسی سعی و کوشش جو لطفِ خدا کے پرتو کے سائے میں کبھی کئی گنا، کبھی دس گنا اور کبھی سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہو۔ اور وہ کبھی اس سے بے حد و حساب جزا حاصل کر چکے ہوں گے (انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب) (زمر-۱۰)۔

اس کے بعد اس مفہوم کی شرح پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے: "وہ بہشت عالی میں قرار پائے ہیں" (فی جنة عالیة)۔

لفظ "عالیة" ممکن ہے کہ علوِّ مکانی کی طرف اشارہ ہو، یعنی وہ جنت کے عالی طبقات میں ہیں، یا یہ علوِّ مقامی ہے۔ مفسرین نے دونوں احتمال تجویز کیے ہیں، لیکن دوسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اگرچہ دونوں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

اس کے بعد اس جنت کی ایک اور صفت، جو روحانی اور معنوی پہلو رکھتی ہے، بیان فرماتا ہے: "وہاں تو کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں سنے گا" (لا تسمع فیھا لاغیة)[1] نہ ایسی بات جو نفاق کا پہلو لیے ہوئے ہو،

---

[1] "لاغیة" اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن اس قسم کے موارد میں اس چیز کے معنی میں ہے جو لغویت لیے ہوئے ہو۔ اسی لیے مفسرین نے اس کی (ذاتِ لغو) لغو لیے ہوئے تفسیر کی ہے۔

نہ عداوت وجنگ وجدل کی، نہ کینہ پروری اور حسد کی، نہ جھوٹ نہ تہمت وافترا، نہ غیبت، نہ لغو وبے فائدہ۔ وہ ماحول کیسا آرام دہ ہوگا جو ان فضولیات سے پاک ومبرّا ہو۔

اگر ہم ٹھیک طرح غور وفکر کریں تو دنیاوی زندگی کی پریشانیوں کا زیادہ تر حصہ اسی قسم کی باتوں کا سننا ہے جو روح وجان کے سکون اور اجتماعی نظاموں کو درہم برہم کر دیتا ہے، فتنوں کی آگ بھڑکاتا ہے اور انہیں شعلہ ور کرتا ہے۔

اس روحانی اور آرام وسکون بخش نعمت کے ذکر کے بعد جو جنتیوں کی روح وجان کو لغو وبیہودہ باتیں نہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہے، جنت کی مادی نعمتوں کے ایک حصہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس جنت میں چشمے جاری ہیں" (فیھا عین جاریۃ)۔ اگرچہ عین یہاں نکرہ ہے اور عام طور پر نکرہ ایک فرد کے لیے بھی آتا ہے لیکن قرآن کی باقی آیات کے قرینہ سے جنس کے معنی رکھتا ہے اور مختلف چشموں کے معنی میں ہے، جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیت ۱۵ میں ہے (ان المتقین فی جنات وعیون) پرہیزگار اور متقی لوگ جنت کے باغات اور چشموں کے درمیان قرار پائے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جنتیوں کے محلوں میں سے ہر محل میں ایک چشمہ جاری ہے اور عین کا مفرد ہونا یہاں اس طرف اشارہ کرتا ہے، ایسا چشمہ جو جنت والوں کی خواہش کے مطابق جس طرف چاہیں گے اسی طرف بہے گا اور جنت والے نہر وغیرہ بنانے کے محتاج نہیں ہوں گے۔ البتہ کئی چشموں کا ہونا خوبصورتی وزیبائی وطراوت کے اضافہ کے علاوہ یہ فائدہ بھی رکھتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مخصوص مشروب ہو اور جنتیوں کے ذائقہ کو انواع واقسام کی شراب طہور سے شیریں ومعطر کرتا ہو۔

ان چشموں کے تذکرہ کے بعد جنت کے تخت اور پلنگوں کو موضوع بنا کر فرماتا ہے: "جنت کے ان باغوں میں بلند اور اونچے تخت اور پلنگ ہوں گے" (فیھا سرر مرفوعۃ)۔ "سرر" جمع ہے سریر کی، "سرور" کے مادہ سے، ایسے تخت اور پلنگوں کے معنی میں کہ جن پر مجالس انس وسرور میں بیٹھتے ہیں[1]

ان پلنگوں کا بلند ہونا اس بنا پر ہے کہ جنتی اپنے اطراف کے تمام مناظر اور صحن دیکھ سکیں اور ان کے مشاہدہ سے لذت حاصل کریں۔ ابن عباس کہتے ہیں یہ بلند تخت اور پلنگ اس قسم کے ہیں کہ جس وقت ان کے مالک ان پر بیٹھنے کا ارادہ کریں گے تو وہ تواضع وخضوع کریں گے اور نیچے ہو جائیں گے اور بیٹھنے کے بعد اپنی پہلی حالت پر پلٹ جائیں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ان پلنگوں کی مرفوعۃ کے لفظ کے ساتھ توصیف ان کے قیمتی ہونے کی طرف اشارہ ہو اور جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ سونے کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے ہوں گے اور دُر ویاقوت وزبرجد سے مزین

---

[1] مفردات راغب مادہ "سرر"۔

ہوں گے۔ دونوں تفسیروں کے مابین جمع بھی ممکن ہے۔

چونکہ ان خوشگوار چشموں اور جنت کی شراب طہور سے فائدہ اٹھانا برتنوں کی احتیاج رکھتا ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "خوبصورت اور جاذب نظر پیالے ان چشموں کے پاس رکھے ہوں گے" (واکواب موضوعۃ)۔ جس وقت وہ ارادہ کریں گے تو پیالے چشموں سے پُر ہو کر ان کے سامنے آجائیں گے اور وہ تازہ تازہ نوش کریں گے، ایسی لذت جس کا شعور ساکنین دنیا کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اکواب جمع کوب (بروزن خوب) جو قدح، پیالے یا ایسے ظرف کے معنی میں ہے جس میں دستہ لگا ہوا ہو۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قرآن میں اہل جنت کی شراب طہور کے برتنوں کے بارے میں مختلف تعبیریں آئی ہیں یہاں اور بعض دوسری آیات میں اکواب کی تعبیر آئی ہے جبکہ بعض دوسری آیات میں اباریق (ابریق کی جمع) کی تعبیر آئی ہے، جو ایسے ظرف کے معنی میں ہے جس کا دستہ اور ٹونٹی ہو، سیال چیزوں کو انڈیلنے کی غرض سے۔ یا پھر کأس کا لفظ آیا ہے جس کے معنی شراب سے لبریز جام کے ہیں (یطوف علیھم ولدان مخلدون باکواب واباریق وکأس من معین) ان کے گرد ایسے جوان گردش کرتے ہوں گے جو ہمیشہ جوانی کی طراوت و تروتازگی کے حامل ہوں گے جبکہ شراب طہور سے لبریز پیالے اور جام ان کے ہاتھ میں ہوں گے اور وہ ان کے سامنے پیش کریں گے۔ (واقعہ ۱۷، ۱۸)۔

اس کے بعد جنت کی نعمتوں کی جزئیات کے متعلق مزید نکات پیش کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: "وہاں پلنگوں پر تکیے اور گاؤ تکیے ہوں گے جو صف بستہ ہوں گے" (ونمارق مصفوفۃ)۔ نمارق نمرق (بروزن غلغل) کی جمع ہے جس کے معنی چھوٹے تکیے کے ہیں جس کا سہارا لیتے ہیں[1] اور عام طور پر مکمل استراحت کے وقت ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور مصفوفۃ کی تعبیر اشارہ ہے نظم خاص اور تعدد کی طرف جو ان پر حاکم ہے۔

یہ تعبیر بتاتی ہے کہ وہ مجالس اُنس تشکیل دیں گے اور یہ مجلسیں جو ہر قسم کی لغویت اور بیہودگی سے پاک ہوں گی۔ ان میں صرف الطاف الٰہی، اس کی بے پایاں نعمتوں اور دنیا کے درد و رنج اور عذاب سے نجات کے بارے میں گفتگو ہوگی، اس قدر لطف اور لذت رکھتی ہوں گی کہ کوئی چیز ان کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔

آخری زیر بحث آیت میں جنت کے قیمتی فرشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہاں گراں بہا اور خوبصورت فرش بچھے ہوئے ہوں گے" (وزرابی مبثوثۃ)

"زرابی" جمع ہے زربیہ کی جو ایسے قیمتی فرش کے معنی میں ہے جو نرم، راحت بخش اور بیش قیمت ہونگے۔ واضح ہے کہ ان آسائش و لذت کے وسائل و ذرائع کے برابر اور بہت سے دوسرے وسائل موجود ہوں گے جبکہ یہ گنتی نمونہ از خروارے کے مصداق ہیں۔ ان آیتوں میں جنت کی سات اہم نعمتیں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک دوسری

---

[1] صحاح اللغۃ مادہ غرق۔

سے زیادہ جاذب تر اور زیباتر ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جنت ایک بے نظیر جگہ ہے، جس میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔ وہاں انواع و اقسام کے رنگ برنگ کے پھل، دل خوش کن نغمے، آبِ جاری کے چشمے، شرابِ طہور، شائستہ خدمتگار، بے مثل بیویاں، مرصع پلنگ، قیمتی فرش اور پُرخلوص دوست ہوں گے۔ نیز عمدہ اور خوبصورت پیالے ہوں گے جو چشموں کے پاس رکھے ہوئے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ ایسی نعمتیں وہاں دستیاب ہوں گی جن کی نہ اس دنیا کے الفاظ کے ذریعے تشریح ممکن ہے اور نہ عالمِ خیال ہی اس کی توضیح کرسکتا ہے۔

یہ سب چیزیں ان مومنین کی تشریف آوری کی منتظر ہیں جنہوں نے اپنے اعمالِ صالح کے ذریعہ نعمتِ الٰہی کے اس مرکز میں ورود کی اجازت لے لی ہے۔

مذکورہ بالا مادّی لذتوں کے علاوہ معنوی لذتیں بھی ہیں، سب سے بڑھ کر لقاء اللہ کی نعمت ہے۔ اس معبودِ حقیقی کے لطف و کرم ہیں کہ اگر ایک لمحے کے لیے مل جائیں تو وہ جنت کی تمام مادّی نعمتوں کے مقابلہ میں برتر و برتر ہیں۔ بقولِ شاعر ؎

گرم بہ دامن وصل تو دسترس باشد　　دگر ز طالع خویشم چہ ملتمس باشد؟
اگر بہ ہر دو جہاں یک نفس زنم بر دوست　　مرا ز ہر دو جہاں حاصل آن نفس باشد

اگر مجھے تیرے وصل کے دامن تک دسترس حاصل ہو جائے تو پھر میں اپنے مقدر سے اور کیا مانگوں۔
اگر دونوں جہاں کے بدلے دوست کے ساتھ ایک سانس لوں تو ان دونوں جہان کا ماحصل یہی ایک سانس ہوگا۔

(۱۷) اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وقفة
(۱۸) وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وقفة
(۱۹) وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وقفة
(۲۰) وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ وقفة
(۲۱) فَذَکِّرْ ۫ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ۝
(۲۲) لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۝
(۲۳) اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَکَفَرَ ۝
(۲۴) فَیُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ ۝
(۲۵) اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَهُمْ ۝
(۲۶) ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَهُمْ ۝

ترجمہ

(۱۷) کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح اسے پیدا کیا گیا؟
(۱۸) اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلندی پر قائم کیا گیا؟
(۱۹) اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح وہ اپنی جگہ نصب ہوئے ہیں؟
(۲۰) اور زمین کی طرف کہ وہ کس طرح مسطح ہوئی ہے؟
(۲۱) پس نصیحت کر کہ تُو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔
(۲۲) تُو ان پر مسلط نہیں ہے کہ انہیں (ایمان لانے پر) مجبور کرے۔

(۲۳) مگر وہ شخص جو پشت پھیرے اور کافر ہو جائے۔

(۲۴) جسے خدا بہت بڑے عذاب کی سزا دے گا۔

(۲۵) یقیناً ان کی بازگشت ہماری طرف ہے۔

(۲۶) اور یقیناً ان کا حساب کتاب ہمارے پاس ہے۔

تفسیر

اونٹ کی طرف دیکھو جو خود ایک آیت ہے

گزشتہ آیات میں بہت زیادہ بحثیں جنت اور اس کی آیتوں کے بارے میں آئی تھیں لیکن زیر بحث آیات میں ان نعمتوں تک پہنچنے کی اصلی کلید کی گفتگو ہے جو اللہ کی معرفت ہے۔ خدا کی قدرت کے چار مظاہر بیان کر کے خدا کی نادر خلقت اور انسان کو اس کے مطالعہ کی دعوت کے ساتھ جنت میں داخل ہونے کی راہ بتاتا ہے اور ضمنی طور پر یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ خدا کی قدرت بے پایاں ہے جو مسئلہ معاد کے حل کرنے کی کلید ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے" (افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت)۔ یہاں ہر چیز سے پہلے اونٹ کی تخلیق کے عنوان کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین نے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ لیکن یہ چیز واضح ہے کہ ابتداء میں روئے سخن مکہ کے عربوں کی طرف تھا جن کی زندگی کے بہت سے کام اونٹ سے وابستہ تھے۔ اس سے قطع نظر یہ جانور عجیب و غریب خصوصیتوں کا حامل ہے، جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ:

۱۔ بعض جانور ایسے ہیں جن کے صرف گوشت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، بعض ایسے ہیں جن کے صرف دودھ سے استفادہ ہوتا ہے، بعض ایسے ہیں جو صرف سواری کے کام آتے ہیں اور بعض صرف بار برداری کے کام آتے ہیں۔ لیکن اونٹ ایسا جانور ہے جس میں یہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کا گوشت بھی قابل استعمال ہے اور دودھ بھی۔ یہ سواری کے کام بھی آتا ہے اور بار برداری کے لیے بھی اسے کام میں لایا جاتا ہے۔

۲۔ اونٹ زیادہ طاقتور اور زیادہ قوت مقاومت رکھنے والا جانور ہے۔ یہ بہت زیادہ سامان اٹھا لیتا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جس وقت وہ بیٹھا ہوا ہو تو بھاری بوجھ اس پر رکھ دیتے ہیں اور ایک ہی حرکت کے ساتھ اپنے ہاتھوں کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے، جبکہ دوسرے جانور اس قسم کا کام نہیں کر سکتے۔

۳۔ اونٹ آٹھ دس روز تک پیاسا رہ سکتا ہے، اور اس میں بھوک کو برداشت کرنے کی بھی بہت

صلاحیت ہوتی ہے۔

۴۔ اونٹ ہر روز راستے کی طولانی مسافت طے کر سکتا ہے اور ایسی زمینوں سے، جن میں سے گزرنا مشکل ہو جیسے ریگستانی علاقہ جس کو عبور کرنا مشکل ہوتا ہے، آسانی سے گزر سکتا ہے۔ اسی بنا پر عرب اسے صحرائی جہاز کہتے ہیں۔

۵۔ وہ غذا کے اعتبار سے بہت ہی سستا ہے، ہر قسم کے خار و خس و خاشاک کھا لیتا ہے۔

۶۔ وہ غذا کے نامناسب حالات میں بیابان کے ایسے طوفانوں کے درمیان، جو آنکھ اور کان کو اندھا بہرا کر دیتے ہیں، اپنے مخصوص وسائل کے ساتھ، جو خدا نے اس کی پلکوں، کانوں اور ناک میں مہیا کیے ہیں، مقابلہ کرتا ہوا اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے۔

۷۔ وہ اپنی پوری قوت و طاقت کے باوجود نہایت مطیع جانور ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اونٹ کی قطار کی مہار ہاتھ میں لے کر جدھر اس کا دل چاہے انہیں لے کر جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس جانور کی خصوصیات کچھ اس قسم کی ہیں کہ اس کی خلقت کے بارے میں اگر غور و فکر کیا جائے تو وہ انسان کو خالقِ عظیم کی طرف متوجہ کرتی ہے، جو ایسی مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے۔ جی ہاں! قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "کیا یہ وادیٔ غفلت کے گمشدہ اس مخلوق کے حیران کن اسرار پر غور نہیں کرتے تاکہ انہیں حق کی راہ حاصل ہو اور یہ بے راہ روی سے بچ جائیں؟" یہ بات بغیر کہے واضح ہے کہ "افلا ینظرون" کے جملہ میں نگاہ سے مراد عام نگاہ نہیں، بلکہ ایسی نگاہ ہے جس میں غور و فکر و تفکّر و تدبّر شامل ہو۔

اس کے بعد آسمان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا وہ آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح قرار دیا گیا ہے؟" (والی السماء کیف رفعت)۔ آسمان اپنی اس عظمت کے ساتھ اور اپنے ان سب عجائبات کے ساتھ ستاروں اور کہکشاؤں کے ساتھ اور اس سارے جمال و زیبائی و شکوہ کے ساتھ، جس نے انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے، جس کی وجہ سے اپنے آپ کو وہ اس عظیم اور نظم و حساب سے پُر جہان کے پیدا کرنے والے کے مقابلہ میں چھوٹا اور ناچیز بلکہ اس لامحدود کے مقابلہ میں صفر کے برابر سمجھتا ہے، کس طرح یہ عظیم کُرّے اپنی اپنی جگہ پر میخ کی طرح گڑے ہوئے ہیں اور بغیر ستون کے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

اس نظامِ شمسی کے کُرّوں کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے لاکھوں سال گزر چکے ہیں لیکن ان کی حرکتِ اصلی کے محور تبدیل نہیں ہوئے۔ آسمان کی خلقت اگرچہ ہمیشہ عجیب تھی لیکن موجودہ زمانہ کے علمی انکشافات کے سائے میں اس کے عجائبات کئی گنا زیادہ ہو گئے ہیں اور اس کی عظمت اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ کیا اس عالمِ عظیم کے خالق و مدبّر کے بارے میں غور و فکر نہیں کرنا چاہیئے اور اس کے بلند و عظیم مقاصد کے قریب نہیں جانا چاہیئے؟

اس کے بعد آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوعِ گفتگو بناتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا وہ پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح اپنی جگہ پر نصب ہوئے ہیں؟" (والی الجبال کیف نصبت)۔ وہ پہاڑ جن کی جڑیں ایک دوسرے سے متصل ہیں، زمین کے اطراف کو زرہ کے حلقوں کی مانند گھیرے ہوئے ہیں اور اندرونی پگھلے ہوئے مادہ سے پیدا

ہونے والے زلزلوں اور چاند و سورج کی قوتِ جاذبہ سے پیدا ہونے والے مدّ و جزر کو کم کرتے ہیں۔ وہ پہاڑ جو ان طوفانوں کے مقابلہ میں قابلِ اطمینان پناہ گاہ اور ڈھال ثابت ہوتے ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو کرّہ زمین ایسے بیابانوں میں تبدیل ہو جاتا جن میں زندگی گزارنا ناممکن ہوتا۔

وہ پہاڑ جو پانی کے ذخیروں کو اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہیں اور انہیں آہستہ آہستہ پیاسی زمینوں کی طرف روانہ کرتے ہیں اور اپنے چاروں طرف زندگی کی مسرت، ہریالی، خوشی، طراوت اور تر و تازگی پیدا کرتے ہیں۔ غالباً یہی پہلو ہیں جن کی وجہ سے دوسری آیات میں پہاڑوں کو زمین کی میخیں کہا گیا ہے۔ اصولی طور پر پہاڑ عظمت و صلابت کے مظہر ہیں اور ہر جگہ خیر و برکت کا سبب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان پہاڑوں پر تفکر کی زیادہ صلاحیت محسوس کرتا ہے اور یہ بات بلا سبب نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی بعثت سے مدتوں پہلے جبلِ نور اور غارِ حرا میں عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

"نصبت"، نصب کے مادہ سے ثابت قرار دینے کے معنی میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر ضمنی طور پر آغازِ خلقت میں پہاڑوں کی خلقت کی کیفیت کی طرف اشارہ ہو، وہی چیز جس پر سے موجودہ علم نے پردہ اٹھایا ہے، اسے پہاڑوں کی خلقت کے متعدد اسباب و عوامل کی طرف نسبت دی ہے اور ان کے لیے انواع و اقسام کی قائل ہے۔

وہ پہاڑ جو زمین کے گھومنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہ پہاڑ جو آتش فشانیوں کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں، وہ پہاڑ جو بارش سے پیدا ہونے والے جھاگ کا نتیجہ ہیں، وہ پہاڑ جو سمندروں کے اندر بنتے ہیں اور جو سمندر کی کیچڑ اور اس میں پھنس جانے والے جانوروں کا مجموعہ ہیں۔ (مثلاً مرجانی پہاڑ اور جزیرے)۔

جی ہاں! ان پہاڑوں میں سے ہر ایک کی بناوٹ اور اس کے آثار و برکات مشکل سے سمجھ میں آنے والے ہیں، اہمیت کے حامل بھی اور بیدار مغز انسانوں کے لیے قدرتِ حق کی نشانیاں بھی۔

اس کے بعد زمین کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا وہ زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح مسطح ہوئی ہے" (و الی الارض کیف سطحت)۔

کس طرح مسلسل بارشوں نے پہاڑوں کو غسل دے کر مٹی کے ذرات کو وجود دیا ہے، پھر گڑھوں کو وسعت دے کر ایسی صاف زمین تیار کی ہے جو زراعت کے لیے بھی موزوں ہے اور ہر قسم کی تعمیر کے لیے بھی اور اسے انسانوں کے اختیار میں دے دیا گیا ہے۔

اگر تمام کرّہ زمین پہاڑوں اور درّوں پر مشتمل ہوتا تو اس پر زندگی گزارنا کس قدر مشکل اور طاقت رُبا ہوتا۔ وہ کون ہے جس نے ہمارے پیدا ہونے سے پہلے اسے مسطح کر کے قابلِ استفادہ بنایا۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن پر غور و فکر کی قرآن ہمیں دعوت دیتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چاروں امور کے درمیان کونسا ربط ہے: اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین۔ فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ:

یہ اس بنا پر ہے کہ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے اور عرب عام طور پر سفر میں رہتے تھے۔ چونکہ ان کے علاقہ میں زراعت

اور کھیتی باڑی نہیں تھی اور ان کے سفر زیادہ تر اونٹوں پر ہی ہوتے تھے۔ جب وہ ہولناک بیابانوں اور غیر آباد ریگستانوں میں سفر کرتے تھے تو ان میں تفکر کا مادہ پیدا ہوتا تھا۔ کوئی موجود نہ ہوتا جس سے وہ بات کرتے۔ کوئی چیز ایسی نہ ہوتی جو ان کی آنکھ اور کان کو اپنی طرف متوجہ رکھتی۔ ایسی حالت میں جب وہ غور و فکر کرتے تو سب سے پہلے ان کی نظر اونٹ پر پڑتی جس پر وہ سوار ہوتے تھے۔ وہ اس کا عجیب منظر دیکھتے اور سوچ میں ڈوب جاتے۔ جب وہ سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھتے تو آسمان کے علاوہ کوئی چیز انہیں نظر نہ آتی۔ جب دائیں بائیں نگاہ کرتے تو پہاڑوں کے سوا انہیں کچھ نظر نہ آتا، اور جب اپنے قدموں کی طرف دیکھتے تو زمین کے علاوہ کوئی چیز موجود نہ ہوتی۔ گویا خدا انہیں دعوتِ فکر دے رہا ہے اور دعوتِ فکر بھی ایسی جو تنہائی کے موقع پر دی جائے اور اس کا دائرہ صرف چار چیزوں تک محدود ہو۔[1]

لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہم عربوں کے ماحول سے نگاہ ہٹا کر زیادہ وسیع فضا میں غور و فکر کریں تو کہا جا سکتا ہے کہ چاروں امور جو اوپر والی آیت میں آئے ہیں، انسانی زندگی کی بنیاد کو تشکیل دیتے ہیں۔ آسمان نور و روشنی کا مرکز ہے اور بارش و ہوا کا بھی۔ زمین انواع و اقسام کے موادِ غذائی کی پرورش کا مرکز ہے۔

پہاڑ آرام و سکون کی رمز اور پانی اور معدنیات کا ذخیرہ ہیں۔ اونٹ خانگی جانوروں کا نمونہ ہے جسے انسان کے اختیار میں دیا گیا ہے۔ اس طرح زراعت کے مسائل، جانور رکھنے کے مسائل اور صنعت و کاریگری کے مسائل انہی چاروں میں پوشیدہ ہیں۔ ان گوناں گوں نعمتوں کے بارے میں غور و فکر انسان کو بہر حال شکرِ منعم حقیقی پر ابھارتا ہے اور شکرِ منعم انہیں اللہ کی معرفت اور خالقِ نعمت کی شناخت کی دعوت دیتا ہے۔

توحید سے متعلق اس بحث کے بعد پیغمبرؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہی ہے تو انہیں یاد دلا اور نصیحت کر اور تُو تو صرف یاد دہانی کرانے والا ہی ہے" (فذکر انما انت مذکر)۔ تُو ان پر بالکل مسلط نہیں ہے کہ انہیں ایمان لانے پر مجبور کرے۔ (لست علیھم بمصیطر)۔

جی ہاں! آسمان و زمین، پہاڑوں اور جانوروں کی خلقت بتاتی ہے کہ یہ عالم ظاہر حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے اور اس کی خلقت کا کوئی ہدف و مقصد ہے۔ اب جبکہ ایسا ہی ہے تو تُو انہیں یاد دہانیوں اور نصیحتوں سے خلقت و آفرینش پر غور کرنے کی تلقین کر، انہیں قربِ خدا کی راہ دکھا اور راہِ تکامل و ارتقا میں ان کا رہبر و رہنما بن جا۔

البتہ راہِ کمال اسی صورت میں طے کی جاتی ہے جب ارادہ و اختیار کے ساتھ میل و رغبت بھی شامل ہو۔ وہ تکامل و ارتقا جو حالتِ جبر کے نتیجے میں ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تُو انہیں مجبور نہیں کر سکتا اور اگر مجبور کر بھی سکتا تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ حکم فرمانِ جہاد کے نزول سے پہلے تھا اور حکمِ جہاد کے نزول سے یہ حکم منسوخ ہو

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱ ص ۱۰۸۔

گیا یہ کہنا بڑا اشتباہ اور غلطی ہے۔ پیغمبرؐ کے تذکر و تبلیغ کا سلسلہ پہلے دن سے شروع ہوا اور آپؐ کی زندگی کے آخری دن تک جاری رہا۔

آپؐ کے بعد بھی آپ کے معصوم جانشینوں اور علمائے دین کے ذریعہ جاری و ساری رہا اور ہے۔ یہ فسخ ہونے والی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور نہ کرنا بھی ایک بنیادی بات ہے۔ جہاد کا مقصد بھی زیادہ تر سرکش افراد سے جنگ کرنا ہے اور حق طلب لوگوں کے راستے سے رکاوٹوں کو دُور کرنا ہے۔

یہ مفہوم اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نساء کی آیت ۸۰ میں آئی ہے، جس میں فرماتا ہے: (ومن تولّٰی فما ارسلناک علیھم حفیظًا) "اور جو شخص روگردانی کرے تو ہم نے تجھ کو اس کا ذمہ دار نہیں بنایا، اور سورہ انعام کی آیت ۱۰۷ اور شوریٰ کی آیت ۴۸ میں انہی معانی کو بیان کرتی ہیں۔

"مصیطر" سطر کے مادہ سے کتاب کی سطور کے معنی میں ہے اور مسیطر وہ شخص ہے جو سطروں کو مرتب کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر وہ شخص جو کسی چیز پر مسلط ہو اور اس کو منظم کرے یا اسے کسی کام کے انجام دینے پر مجبور کرے۔

بعد والی آیت میں ایک استثناء کی شکل میں فرماتا ہے: "مگر وہ شخص جو پشت پھیرے اور کافر ہو جائے" (الّا من تولّٰی و کفر)۔ "اسے خدا ایک بہت بڑے عذاب کی سزا دے گا" (فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر)۔ یہ بات کہ یہ استثناء کس جملے سے متعلق ہے اس کی مختلف تفسیریں ہیں۔

پہلی یہ کہ فذکر کے جملے کے مفعول سے استثناء ہے۔ یعنی ضروری و لازمی نہیں ہے کہ ان معاند افراد سے روگردانی کرتے ہیں اور پند و نصیحت کو قبول نہیں کرتے تو نصیحت کر اور یاد دہانی کرا۔ حقیقت میں یہ اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ زخرف کی آیت ۸۳ میں آئی ہے (فذرھم یخوضوا و یلعبوا حتّٰی یلاقوا یومھم الذی یوعدون) "انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے باطل میں الجھے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس کا وعدہ کیا گیا ہے"۔

دوسرے یہ کہ ایک محذوف جملے سے استثناء ہے اور معنوی طور پر اس طرح ہے "نصیحت کر اس لیے کہ نصیحت سب لوگوں کے لیے نفع بخش ہے، مگر وہ جو حق کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں" اس چیز کے مشابہ جو سورۂ اعلیٰ کی آیت ۹ میں آئی ہے (فذکر ان نفعت الذکریٰ) اس بنا پر کہ آیت معنی شرط رکھتی ہو۔

تیسرے یہ کہ "علیھم" کی ضمیر سے استثناء ہے جو گزشتہ آیت میں ہے یعنی تو ان پر کوئی تسلط نہیں رکھتا، مگر وہ لوگ جو روگرداں ہو جائیں اور راہِ عناد اختیار کریں تیری ذمہ داری ہے کہ ان سے مقابلہ کرے[1]

یہ سب تفاسیر اس صورت میں ہیں کہ اگر استثناء اصطلاح کے مطابق متصل ہو، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ استثناء

---

[1] ایک حدیث سے جو در المنثور میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کی ذمہ داری تھی کہ بت پرستوں سے جنگ کریں اور اس صورت کے علاوہ باقی حالات میں ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ نصیحت کریں۔

منقطع ہو، جو تقریباً بلکہ کا مفہوم رکھتا ہے اور جملہ کے معنی اس طرح ہیں "بلکہ وہ لوگ جو روگرداں ہو جائیں اور کافر ہو جائیں تو خدا ان پر مسلط ہے، یا خدا انہیں بہت بڑے عذاب کی خبر دے گا"۔

ان تفسیروں میں سے دو تفسیریں سب سے زیادہ مناسب ہیں۔ پہلی یہ کہ استثناء متصل ہو اور لست علیہم بمصیطر کے جملے کی طرف لوٹے، جو طاقتوروں کے مقابلہ میں طاقت سے کام لینے کی طرف اشارہ ہو۔ یا استثناء متصل ہو اور ہٹ دھرم کافروں کے لیے عذاب الٰہی کی خبر کے معنوں میں ہو۔

عذاب اکبر سے مراد آخرت کا عذاب ہے، دنیا کے عذاب کے مقابلہ میں جو چھوٹا ہے اور کم اہم ہے، جیسا کہ سورہ زمر کی آیت ۲۶ میں ہم پڑھتے ہیں: (فاذاقھم اللہ الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا و لعذاب الاٰخرۃ اکبر) خدا نے ذلت وخواری کا مزہ انہیں اس دنیا میں چکھایا اور آخرت کا عذاب اکبر ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ عذاب اکبر سے مراد عذاب قیامت و دوزخ کا شدید ترین حصہ ہے اس لیے کہ دوزخ میں تمام مجرموں کا عذاب ایک جیسا نہیں ہے۔ اس سورہ کے آخر میں تہدید آمیز لہجے میں فرماتا ہے: "یقیناً ان کی بازگشت ہماری طرف ہے" (ان الینا ایابھم)۔ اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: "اس کے بعد یقیناً ان کا حساب ہمارے ہاتھ میں ہے" (ثم ان علینا حسابھم)۔

یہ حقیقت میں پیغمبرؐ کے دل کے لیے ایک قسم کی تشفی و تسلی ہے کہ کافروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پریشان و غمزدہ نہ ہوں اور اپنے کام کو جاری رکھیں۔ ضمنی طور پر یہ سب ہٹ دھرم کافروں کے لیے دھمکی ہے تاکہ وہ جان لیں کہ ان کا حساب کتاب کسی کے اختیار میں ہے۔ اس طرح سورہ غاشیہ جو قیامت کے موضوع سے شروع ہوا تھا، قیامت ہی کے موضوع پر ختم ہو رہا ہے۔ درمیان میں توحید و نبوت کی طرف جو قیامت کی کی بنیادوں کو تشکیل دیتے ہیں، اشارہ ہوا ہے۔

اس سورہ کی ابتدائی آیات کے ضمن میں مجرموں کو ملنے والی سنگین سزاؤں کا ایک حصہ اور اس کے بعد مومنین کے روح پرور حساب کا اہم حصہ آیا ہے۔ ضمنی طور پر راستے کے انتخاب کا اختیار دیا گیا کو دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور اس کو ان سے حساب لینا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبرؐ تبلیغ رسالت پر مامور ہیں اور لوگوں کے کفر و گناہ کے ذمہ دار ہیں۔ راہ حق کے تمام مبلغین کی ذمہ داری اسی قسم کی ہوتی ہے۔

خداوندا! جس دن تمام مخلوقات کی بازگشت تیری طرف ہے اور سب کا حساب تجھے لینا ہے ہم پر اپنا لطف و کرم بھیج۔

پروردگارا! ہمیں اپنی رحمت کبریائی سے کام لے کر عذاب اکبر سے رہائی بخش۔

بارالٰہا! تیری جنت کی نعمتیں جن کا ایک گوشہ تو نے اس سورہ میں بیان کیا ہے بہت ہی بیش بہا اور شوق انگیز ہیں۔ اگر ہم اپنے اعمال کی وجہ سے اس کے مستحق نہیں ہیں تو تو ہمیں ان کو اپنے فضل و کرم سے مراحمت فرما۔

آمین یارب العالمین

سورۂ غاشیہ کا اختتام ۳ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ

سورۂ فجر

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اس میں تیس آیات ہیں
تاریخ ابتداء ۳ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ

سورۂ فجر کے مشمولات اور اس کی فضیلت

یہ سورہ بہت سے دوسرے سوروں کی طرح، جو مکے میں نازل ہوئے، مختصر متزلزل کر دینے والی، پُر جلال اور بہت زیادہ ڈرانے والی آیات کا حامل ہے۔ اس سورہ کے پہلے حصہ میں ہمیں بہت سی قسمیں ملتی ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نئی ہیں اور یہ قسمیں ظالموں کے لیے عذاب الٰہی کی تہدید کے طور پر ہیں۔

اس سورہ کے دوسرے حصہ میں گزشتہ سرکشی کرنے والی بعض اقوام، مثلاً قوم عاد و ثمود و فرعون اور ان سے خدا کے شدید انتقام لینے کی طرف اشارہ ہے، تاکہ دوسری طاقتیں اپنے انجام پر غور کریں۔

اس سورہ کے تیسرے حصہ میں مسئلہ معاد اور مجرمین و کافرین کی سرنوشت اور اسی طرح مومنین کے اجر کو، جو صاحب نفس مطمئنہ ہیں، موضوع بنایا گیا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں ہمیں ایک حدیث پیغمبر اسلامؐ کی ملتی ہے (من قرأ ھا فی لیال عشر غفر اللہ لہ ومن قرأ ھا سائر الایام کانت لہ نورًا یوم القیامۃ) جو شخص اسے دس راتوں (اوّل ذی الحج کی دس راتوں) میں پڑھے، خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور جو شخص باقی ایام میں پڑھے تو قیامت کے دن اس کے لیے نور و روشنی ہوگی۔[1]

ایک حدیث امام جعفر صادقؑ کی ہے کہ سورہ فجر کو ہر واجب و مستحب نماز میں پڑھو کہ یہ حسینؑ بن علیؑ کا سورہ ہے۔ جو شخص اسے پڑھے گا وہ قیامت میں امام حسینؑ کے ساتھ بہشت میں ان کے درجہ میں ہوگا۔[2]

اس سورہ کا تعارف سورۂ امام حسینؑ کے عنوان سے ممکن ہے کہ اس وجہ سے ہو کہ نفس مطمئنہ کا واضح مصداق، جو اس سورہ کی آخری آیات میں واقع ہوا ہے، حسینؑ بن علیؑ ہی ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے انہی آیات کے ذیل میں آیا ہے۔ یا پھر اس بنا پر کہ لیال عشر (دس راتوں سے مراد) کی تفسیر محرام الحرام کی پہلی دس راتیں ہیں جو حسینؑ بن علیؑ سے خاص رابطہ رکھتی ہیں۔ بہرحال یہ سب اجر و ثواب و فضیلت ان اشخاص کے لیے ہے جو اس کی تلاوت کو اپنی اصلاح اور تربیت کی تمہید قرار دیں۔

---

[1] و [2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۱۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) وَالۡفَجۡرِ ۙ
(۲) وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ
(۳) وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۙ
(۴) وَالَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ ۚ
(۵) ھَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ

ترجمہ

(۱) صبح کی قسم۔
(۲) اور دس راتوں کی۔
(۳) اور زوج و فرد کی۔
(۴) اور رات کی جبکہ وہ (دن کی روشنی کی طرف) حرکت کرتی ہے قسم ہے (کہ تیرا پروردگار ظالموں کی گھات میں ہے)۔
(۵) کیا جو کچھ کہا گیا ہے اس میں صاحبانِ عقل کے لیے اہم قسم نہیں ہے؟

تفسیر

تمہاری صبح کی سفیدی کی قسم

اس سورہ کے آغاز میں پانچ بیدار کرنے والی قسموں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: "قسم ہے فجر اور رات کے سیاہ پردے کے چاک ہونے کی" (والفجر)۔ "اور قسم ہے دس راتوں کی" (ولیال عشر)۔

"فجر" اصل میں وسیع شگاف کے معنی میں ہے۔ چونکہ صبح کا نور شب کی تاریکی میں شگاف ڈال دیتا ہے لہٰذا اُسے فجر کہا گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ فجر دو قسم کی ہے، کاذب اور صادق۔ فجرِ کاذب طولانی سفیدی ہے جو آسمان میں ظاہر ہوتی ہے اور اسے لومڑی کی دُم سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا باریک نقطہ افق کی طرف ہے اور اس کا قاعدہ مخروط وسط آسمان میں ہے۔

فجرِ صادق ابتداء ہی سے افق میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ اس میں نورانیت اور صاف قسم کی شفافیت ہوتی ہے۔ وہ آبِ زلال کی نہر کی مانند افقِ مشرق کو گھیر لیتی ہے۔ اس کے بعد پورے آسمان میں پھیل جاتی ہے۔ فجرِ صادق رات کے ختم ہونے اور دن کے آغاز کا اعلان ہے۔ اس موقع پر روزہ داروں کو اکل و شرب سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیئے۔ اس وقت صبح کی نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں فجر کے اس کے مطلق معنی یعنی صبح کی سفیدی مراد لی ہے جو یقیناً عظمتِ پروردگار کی ایک نشانی ہے۔ یہ انسانوں اور تمام زمینی موجودات کے لیے نور کی حاکمیت کے آغاز اور ظلمت کے ختم ہونے کا نقطۂ عطفی ہے۔ یہ زندہ موجودات کی جنبش و حرکت کا آغاز اور نیند و سکوت کا اختتام ہے۔ اس زندگی کی بنا پر خدا اس کی قسم کھاتا ہے۔

لیکن بعض مفسرین نے اس سے نئے سال کا پہلا دن یعنی پہلی محرم مراد لی ہے۔ بعض نے اس کی تفسیر عیدِ قربان کی فجر کی ہے جس میں حج کے اہم مراسم انجام پاتے ہیں اور یہ دس راتوں سے متصل ہے۔ بعض نے اس کو ماہِ رمضان مبارک کی صبح قرار دیا ہے اور بعض نے روزِ جمعہ کی فجر سمجھا ہے۔ لیکن آیت کا وسیع مفہوم ہے جو ان سب مفاہیم پر حاوی ہے، اگرچہ اس کے بعض مصداق دوسرے بعض مصداقوں سے زیادہ واضح اور اہم بھی ہیں۔

بعض نے آیت کے معنی اس سے زیادہ وسیع سمجھے ہیں اور کہا ہے کہ فجر سے مراد ہر وہ روشنی ہے جو تاریکی میں چمکتی ہے۔ اس بنا پر اسلام اور نورِ پاک محمدیؐ کا عصرِ جاہلیت پر طلوع ہونا اس فجر کا ایک مصداق ہے۔ اسی طرح قیامِ محمدیؐ کی صبح کی سفیدی کا عالم کے ظلم و ستم کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہونے کے وقت چمکنا، اس کا ایک دوسرا مصداق شمار ہوتا ہے جیسا کہ بعض روایات میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے[1]

علیٰ ہذا دشتِ کربلا میں عاشورہ حسینی کا قیام اور اس کا بنی امیہ کے مظالم کے تاریک پردوں کو چاک کرنا اور اُن دیو صفت لوگوں کے حقیقی چہروں کو بے نقاب کرنا، اس کا ایک اور مصداق ہے۔

اسی طرح تمام سچے انقلاب، جو کفر و جہالت اور ظلم و ستم کے خلاف گزشتہ اور موجودہ تاریخ میں برپا ہوتے ہیں، نہ صرف وہ فجر کے مصداق ہیں بلکہ بیداری کا وہ پہلا شعلہ جو گنہگاروں کے تاریک دل میں ظاہر ہوتا ہے اور انہیں توبہ کی دعوت دیتا ہے، وہ بھی فجر ہے۔ البتہ یہ آیت کے مفہوم کی ایک وسعت ہے جبکہ ظاہر آیت وہی فجرِ

---

[1] یہ معنی امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث میں نقل ہوئے ہیں۔ تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۵۰ حدیث (۱)۔

یعنی سپیدہ صبح کا طلوع ہونا۔

باقی رہا "لیال عشر" (دس راتیں) تو مشہور وہی ذوالحج کی دس راتیں ہیں جو مسلمانانِ عالم کے سیاسی اور عبادتی عظیم ترین اور نہایت متاثر کرنے والے اجتماعات کی گواہ ہیں۔ یہ معانی ایک حدیث میں جابر بن عبداللہ انصاری کے واسطے سے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہوئے ہیں[1]

بعض مفسرین نے ان دس راتوں کو ماہِ مبارکِ رمضان کی آخری دس راتیں قرار دیا ہے جن میں شب قدر ہے۔ بعض نے محرم کی ابتدائی دس راتوں کو "لیال عشر" کا مصداق قرار دیا ہے۔ ان تینوں تفسیروں کو جمع کرنا بھی مکمل طور پر ممکن ہے۔

بعض ایسی روایات جو بطونِ قرآن کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان کے مطابق فجر سے مراد حضرت مہدیؑ کا وجود ذی جود ہے اور یہاں عشر ان سے پہلے کے دس ائمہ ہیں اور شفع جو بعد والی آیت میں آیا ہے اس سے مراد حضرت علیؑ و حضرت فاطمۃ الزہراؑ ہیں۔ بہرحال ان دس راتوں کی قسم خواہ اس کی تفسیر کچھ بھی کیوں نہ ہو، ان کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ قسم ہمیشہ اہم امور کی کھائی جاتی ہے[2]

ان تمام معانی کی جمع بھی ممکن ہے۔

اس کے بعد قسموں کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "جفت وطاق کی قسم" (والشفع والوتر)۔ یہ کہ شفع و وتر (زوج و فرد) سے اس آیت میں کیا مراد ہے، مفسرین نے بہت سے اقوال اور احتمال بیان کیے ہیں۔ بعض نے ۲۰ اقوال تک پیش کیے ہیں[3] اور بعض نے اس سے بھی زیادہ یعنی ۳۶ اقوال تک نقل کیے ہیں[4]

ان میں سے زیادہ اہم امور مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

۱۔ مرادِ زوج و فرد اعداد ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق خدا نے ان تمام اعداد کی قسم کھائی ہے جو زوج و فرد سے تشکیل پاتے ہیں۔ وہ اعداد ایسے ہیں کہ تمام حسابات اور تمام نظام ان کے محور کے گرد گھومتے ہیں اور انہوں نے سارے عالمِ معنی کو گھیر رکھا ہے گویا فرماتا ہے:

قسم ہے نظم و ضبط اور حساب و کتاب کی، اور حقیقت میں عالم ہستی میں اہم ترین مفہوم یہی نظم و حساب اور عدد

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۱۲ ص ۴۷۔

[2] اگرچہ "لیال عشر" یہاں نکرہ کی شکل میں بیان ہوئی ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نکرہ یہاں بیان عظمت کے لیے ہے لہٰذا یہ عدد کا مفہوم پیدا کرتی ہیں اور یہ ان مخصوص راتوں کی طرف اشارہ ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔

[3] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱ ص ۱۶۴۔

[4] علامہ طباطبائی نے المیزان میں بعض مفسرین سے جلد ۲۰ ص ۴۰۶ پر نقل کیا ہے اور روح المعانی نے التحریر و التنویر سے جلد ۳۰ ص ۱۲۰ پر نقل کیا ہے۔

کا مسئلہ ہے جو انسانی زندگی میں اصل بنیاد کو تشکیل دیتا ہے۔

۲۔ شفع سے مراد مخلوقات ہیں کیونکہ ساری مخلوق جوڑا جوڑا ہے اور ایک دوسرے کی قرین ہے جبکہ وتر سے مراد خدا ہے، جس کی شبیہ و نظیر و مانند و مثل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام ممکنات ماہیت و وجود سے مرکب ہیں جسے فلسفہ میں زوج ترکیبی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صرف غیر متناہی شے جو ماہیت کے بغیر ہے وہ خدا کی اپنی ذات ہے۔ اس تفسیر کی [illegible] معصومینؑ [illegible] روایات میں اشارہ ہوا ہے [1]

۳۔ زوج و فرد سے مراد اس جہان کی تمام مخلوق ہے جو ایک لحاظ سے زوج اور ایک لحاظ سے فرد ہے۔

۴۔ مراد نمازیں ہیں جن میں رکعات کی تعداد کے لحاظ سے بعض زوج اور بعض فرد ہیں۔ یہ معنی بھی ایک روایت میں معصوم سے نقل ہوئے ہیں [2] یا یہ کہ وہی نماز شفع و وتر ہے جو نماز تہجد کے آخر میں پڑھی جاتی ہے۔

۵۔ شفع سے مراد روز ترویہ ہے (آٹھویں ذی الحج جس دن حاجی عرفات کی طرف کوچ کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں) اور وتر سے مراد عرفہ کا دن ہے جس میں خانہ خدا کے زائرین عرفات میں ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ شفع سے مراد عید قربان کا دن ہے (دس ذی الحج) اور وتر سے مراد عرفہ کا دن ہے۔ یہ تفسیر بھی معصومینؑ کی روایات میں آئی ہے [3]

عمدہ بات یہ ہے کہ اگر الف لام ان دونوں الفاظ میں عموم کے لیے ہوں تو یہ تمام معانی اس میں جمع ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ ان تفسیروں میں سے ہر ایک تفسیر اس کی کوئی نہ کوئی مصداق ہے۔ شفع و وتر کا خصوصیت سے ذکر ہونا اس مفہوم میں مخصوص ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایک واضح مصداق سے مطابقت رکھنے کی قسم سے ہے۔ لیکن الف لام اگر ان دونوں میں عہد کا ہو تو پھر خاص قسم کے زوج و فرد کی طرف اشارہ ہوگا اور یہاں گزشتہ قسموں کی مناسبت سے سب سے زیادہ دو معنی مناسب ہیں:

ایک یہ کہ عید کا دن اور عرفہ کا دن ہو جو ذی الحج کی ابتدائی دس راتوں سے مکمل طور پر مناسبت رکھتا ہے اور مناسک حج کا اہم ترین حصہ انہیں دنوں میں انجام پاتا ہے۔ یا یہ کہ مراد نمازیں ہوں جو فجر کی قسم کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں، جو سحر کا اور بارگاہ خدا میں راز و نیاز کا وقت ہے، خصوصاً جبکہ یہ دونوں تفاسیر ان روایات میں بھی وارد ہوئی ہیں جو معصومینؑ سے مروی ہیں۔

آخر میں آخری قسم میں فرماتا ہے: "اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ صبح اور دن کی روشنی کی طرف جاتی ہے" (واللیل اذا یسر) [4]

---

[1] ابوسعید خدری نے اسے پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے۔ مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۵۔

[2] [3] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۵۔

[4] یسر اصل میں یسری ہے جو مادہ سری کا فعل مضارع ہے اس کے بعد اس کی یا تخفیف اور گزشتہ آیات سے ہم آہنگی کی بنا پر حذف ہوگئی ہے۔

کیسی، پُرکشش، اور عمدہ تعبیر ہے کہ چلنے کی نسبت رات کی طرف دی ہے، وہ بھی رات کو چلنا اس لیے کہ "یسر" "سری" کے مادہ سے (بروزن شما) بقول راغب مفردات میں رات کے چلنے کے معنی میں ہے۔ گویا رات ایک زندہ وجود ہے اور حس و حرکت رکھتی ہے جو تاریکی میں قدم بڑھاتی ہے اور روشن صبح کی طرف جاتی ہے۔

جی ہاں! اس تاریکی کی قسم کھائی ہے جس کا رُخ روشنی کی طرف ہے، متحرک تاریکی نہ کہ ٹھہری ہوئی ——

تاریکی اس وقت وحشتناک ہوتی ہے جب وہ رُکی ہوئی ہو لیکن اس میں اگر نور و روشنی کی طرف حرکت ہو تو اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ظلمتِ شب کرۂ زمین پر حرکت کی حالت میں ہے اور اصولی طور پر جو رات اہم مفید اور حیات بخش ہے وہ وہی رات ہے جو حرکت کی حالت میں ہو، یعنی جو مستقل طور پر بتدریج خود کو دن سے تبدیل کرے، اس لیے کہ اگر رات کرۂ زمین کے نصف حصہ پر جا کر رُک جائے اور میخ کی طرح گڑ جائے تو وہ آدھا حصہ بھی ختم ہو جائے اور دوسرا آدھا حصہ بھی جو ہمیشہ سورج کی روشنی کے مقابل ہو۔

رات سے مراد یہاں کیا ہے؟ کیا سب راتیں مراد ہیں، یا کوئی خاص رات؟

اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اگر اس کا الف لام عموم کے لیے ہو تو اس میں تمام راتیں شامل ہوں گی، جو خدا کی آیات میں سے خود ایک آیت ہیں اور آفرینش کے مظاہر میں سے خود ایک مظہر ہیں۔ اگر اس کا الف لام عہد ہو تو پھر معین رات کی طرف اشارہ ہے اور گزشتہ قسموں کی مناسبت سے مراد عید قربان کی رات ہے جس میں حجاج کرام مزدلفہ (مشعر الحرام) کی طرف اور اس وادیٔ مقدس میں رات گزارنے کے بعد طلوع آفتاب کے وقت سرزمین منیٰ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تفسیر معصومینؑ سے منقول روایات میں بھی آئی ہے[1]

جن لوگوں نے اس رات کا منظر قریب سے عرفات و مشعر میں دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہر گوشہ و کنار سے لاکھوں افراد حرکت کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات اپنے وجود کے ساتھ حرکت کر رہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حاجی چل رہے ہوتے ہیں لیکن یہ حرکتِ عمومی اس قدر وسعت رکھتی ہے گویا زمین و زمان سب حرکت میں ہوں اور یہ سب اس وقت محسوس ہوتا ہے جب انسان عید کی رات اس سرزمین میں ہو اور واللیل اذا یسر کے معنی اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ بہرحال رات کسی بھی معنی میں ہو، عام یا خاص، عظمتِ الٰہی کی نشانی ہے اور عالم ہستی کے اہم موضوعات میں سے ہے۔

رات ہوا کی حرارت میں اعتدال پیدا کرتی ہے، تمام موجودات کو آرام پہنچاتی ہے اور بارگاہِ خدا میں راز و نیاز کے لیے فضا میں سکون پیدا کرتی۔ باقی رہی عیدِ قربان کی رات جس کا نام (لیلۃ الجمع) ہے، وہ بھی اس مقدس وادی مشعر الحرام میں سال کی عجیب ترین رات ہے۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۷۱۔

بہر حال ان پانچ قسموں کا رشتہ (فجر کی قسم، دس راتوں کی قسم، زوج و فرد کی قسم اور رات کی قسم) اس صورت میں بالکل واضح ہے جب ہم ان سب کو ایام ذی الحج اور حج کے عظیم مراسم سے متعلق سمجھیں۔

اس صورتِ حال کے علاوہ پھر عالم تکوین اور عالم تشریع کے اہم حوادث کے مجموعہ کی طرف اشارہ ہے جو خدا کی عظمت کی نشانیاں ہیں اور عالم ہستی کے عجیب وغریب اور حیران کن مظاہر ہیں۔ ان پُرمعنی اور بیدار کرنے والی قسموں کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"کیا جو کچھ کہا گیا ہے اس میں صاحبان خرد کے لیے اہم قسم ہے" (هل فی ذالک قسم لذی حجر)۔

حجر یہاں عقل کے معنی میں ہے اور اصل میں منع کے معنی میں ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ قاضی نے فلاں شخص کو حجر (بروزن زجر) کیا یعنی اسے اس کے اموال میں تصرف کرنے سے منع کر دیا۔ یا یہ کہ کمرہ کو حجرہ کہا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ ایک محفوظ و ممنوع جگہ ہوتی ہے کہ اس میں دوسرے وارد نہیں ہو سکتے۔

دامن اور آغوش کو حجر (بروزن فکر) کہا جاتا ہے دوسروں سے محفوظ ہونے اور ممنوع ہونے کی وجہ سے، اور عقل بھی انسان کو غلط کاموں سے روکتی ہے لہٰذا اسے حجر سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ خود لفظ عقل کے معنی بھی خود منع کرنے کے ہیں۔ اسی لیے وہ رسّی جسے اونٹ کے گھٹنے سے باندھتے ہیں کہ اسے چلنے پھرنے سے روکیں عقال کہلاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ منقسم بہ (وہ چیز جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں) کیا ہے؟ اس سلسلہ میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ جملہ (ان ربک لبالمرصاد) تیرا پروردگار کمین گاہ میں ہے، ان قسموں کا جواب قسم ہے۔ دوسرا یہ کہ جواب قسم محذوف ہے اور آنے والی آیات جو سرکشوں کی سزا اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کی بات کرتی ہے اور وہ اس پر گواہ ہیں۔ یہ معنی کے لحاظ سے اس طرح ہے۔ قسم ہے ان چیزوں کی جو کہی گئی ہیں کہ ہم کافروں اور سرکشوں پر عذاب نازل کریں گے[1] اس طرح قسم اور منقسم بہ واضح ہو جاتے ہیں۔

---

[1] تقدیر میں اس طرح ہے لنعذبن الکفار والطاغین۔

(۶) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝
(۷) اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝
(۸) الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝
(۹) وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝
(۱۰) وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝
(۱۱) الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝
(۱۲) فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝
(۱۳) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝
(۱۴) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝

ترجمہ

(۶) کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟
(۷) اور اس باعظمت شہر ارم کے ساتھ۔
(۸) وہی شہر جس کی نظیر شہروں میں پیدا نہیں کی گئی۔
(۹) اور قوم ثمود جو درّوں میں سے بڑے بڑے پتھر کاٹتی تھی۔
(۱۰) اور فرعون جو صاحب قوت اور سخت سزا دینے والا تھا۔
(۱۱) وہی قومیں جنہوں نے شہروں میں۔
(۱۲) اور ان میں بہت زیادہ فساد انہوں نے کیا۔

(۱۳) لہٰذا خدا نے ان کو عذاب کا تازیانہ لگایا۔

(۱۴) یقیناً تیرا پروردگار کمین گاہ میں ہے۔

تفسیر

تیرا پروردگار ظالموں کی گھات میں ہے

گزشتہ آیات کے بعد جو سرکشوں کی سزا اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کے بارے میں بامعنی قسموں کی ضمانت لیے ہوئے تھیں، ان آیات میں گزشتہ اقوام میں سے چند طاقتور قوموں کے متعلق، جن میں سے ہر ایک عظیم قوت کی مالک تھی، لیکن ساتھ ہی مغرور بھی متکبر و سرکش بھی تھی، ان کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان کی دردناک سرنوشت کو واضح کرتا ہے تاکہ مشرکین مکہ اور دوسری اقوام جو اُن کے مقابلہ میں بہت کمزور ہیں، اپنا انداز لگالیں اور خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ پہلے فرماتا ہے: "کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا ہے" (الم تر کیف فعل ربك بعاد)۔

رویت (دیکھنا) سے یہاں مراد علم و آگاہی ہے چونکہ ان اقوام کی داستانیں اس قدر مشہور و معروف تھیں کہ گویا بعد کے زمانے کے لوگ بھی انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، لہٰذا رویت کی تعبیر صرف ہوئی ہے۔ البتہ اس آیت میں مخاطب پیغمبرؐ ہیں لیکن مقصود سب کو تنبیہ کرنا اور خبردار کرنا ہے۔

"عاد" خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ہودؑ کی قوم ہے۔ بعض مؤرخین کا نظریہ ہے کہ عاد کا اطلاق دو قبیلوں پر ہوتا ہے ایک وہ جو بہت پہلے تھا اور قرآن نے اسے عاد الاولیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ (نجم۔ ۵۰)۔ وہ غالباً تاریخ سے پہلے موجود تھا۔ دوسرا قبیلہ جو تاریخ بشر کے دور میں اور تقریباً ولادت مسیحؑ سے سات سو سال پہلے تھا اور عاد کے نام سے مشہور تھا۔ یہ احقاف یا یمن میں رہائش پذیر تھا۔ اس قبیلہ کے افراد بلند قامت اور قوی الجثہ تھے اور اسی بنا پر بہت نمایاں جنگجو شمار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ متمدن بھی تھے۔ ان کے شہر آباد اور زمینیں سرسبز و شاداب تھیں۔ ان کے باغات پُربہار تھے اور انہوں نے بڑے بڑے محل تعمیر کیے تھے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ عاد اس قبیلے کے جد اعلیٰ کا نام تھا اور وہ قبیلے کو اپنے جد کے نام سے موسوم کر کے پکارتے تھے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"وہی پُرشکوہ اور عظیم شہر ارم" (ارم ذات العماد)۔ اس بات میں کہ ارم کسی شخص کا نام ہے یا قبیلے کا یا جگہ کا یا کسی شہر کا، مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ زمخشری کشاف میں نقل کرتا ہے کہ عاد بیٹا ہے عوص کا، وہ بیٹا ہے ارم کا وہ بیٹا ہے سام ابن نوح کا اور چونکہ قبیلے کے اجداد سے قبیلے منسوب ہوتے تھے لہٰذا عاد کو ارم بھی کہتے ہیں۔ بعض مورخین کا نظریہ یہ ہے کہ ارم وہی عاد اولیٰ ہے اور عاد دوسرا قبیلہ ہے جبکہ کچھ اور حضرات کا نظریہ ہے کہ ارم ان کے

شہر اور سرزمین کا نام ہے[1]

لیکن بعد والی آیت سے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارم ان کے بے نظیر شہر کا نام ہے۔

عماد کے معنی ہیں ستون اس کی جمع ہے عمد (بروزن شتر)۔ پہلی تفسیر کی بنا پر قوم عاد کے طاقتور جسموں اور ستون جیسے پیکروں کی طرف اشارہ ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق باعظمت عمارتوں، بلند و بالا محلات اور ان عظیم ستونوں کی طرف اشارہ ہے جو عظیم محلوں میں تعمیر کیے گئے تھے اور ان دونوں صورتوں میں قوم عاد کی طاقت و قوت کا اشارہ ہے[2] دوسری تفسیر (ان کے محلوں کے عظیم ستون) زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: وہی شہر و دیار جن کی مانند و مثل دنیا کے شہروں میں پیدا نہیں ہوئی تھی (التی لم یخلق مثلها فی البلاد)۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ ارم سے مراد وہی شہر ہے نہ کہ قبیلہ و طائفہ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض بزرگ مفسرین نے اسی تفسیر کو قبول کیا ہے اور ہم نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے[3]

بعض مفسرین نے جزیرۃ العرب کے بیابانوں اور عدن کے صحراؤں میں شہر ارم کے برآمد ہونے کی ایک دلچسپ داستان بیان کی ہے جس میں وہ اس شہر کی بلند و بالا عمارات اور سامان زینت وغیرہ کی بات کرتے ہیں۔ لیکن مذکورہ داستان واقعیت کی نسبت خواب یا افسانے سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قوم عاد طاقتور قبائل پر مشتمل تھی، ان کے شہر ترقی یافتہ تھے اور جیسا کہ قرآن اشارہ کرتا ہے ان جیسے شہر پھر آباد نہیں ہو سکے۔ بہت سی داستانیں شداد کی جو عاد کا بیٹا تھا، زبان زد عام ہیں اور تاریخ میں مرقوم ہیں یہاں تک کہ شداد کی بہشت اور اس کے باغات ضرب المثل کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن ان داستانوں کی حقیقت کچھ نہیں ہے یہ محض افسانے ہیں، یہ ایسے افسانے ہیں کہ ان کی حقیقت پر بعد میں حاشیہ آرائی کر لی گئی۔

اس کے بعد گزشتہ اقوام کے دوسرے سرکش گروہ کا حوالہ دے کر فرماتا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی میں بڑے بڑے پتھروں کو کاٹتی اور ان سے گھر اور قصر بناتی تھی (وثمود الذین جابوا الصخر بالواد)۔ ثمود کی قوم قدیم ترین اقوام میں سے ہے۔ ان کے پیغمبر حضرت صالحؑ تھے اور وہ وادی القریٰ نامی سرزمین میں رہتے تھے، جو مدینہ اور شام کے درمیان تھی۔ ان کا تمدن ترقی یافتہ تھا، زندگی مرفہ الحال تھی اور ان کی عمارتیں عظیم تھیں۔

بعض مؤرخین کہتے ہیں ثمود اس قبیلے کے باپ کا نام تھا۔ اسی نام سے وہ قبیلہ موسوم ہوا[4] جابوا اصل میں جوبہ

---

[1] تفسیر کشاف، جلد ۴، ص ۷۴۷۔ اس مضمون کو قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح دوسری تفسیروں میں بھی ہے۔

[2] پہلی تفسیر کی بنا پر ذات کا مؤنث ہونا طائفہ و قبیلہ کی بنا پر ہے جو مؤنث لفظی ہے۔

[3] ارم غیر منصرف ہے اس لیے حالت جر میں منصوب ہوتا ہے۔

[4] ثمود اہل لغت کے لحاظ سے ثمد (بروزن مند) اس تھوڑے سے پانی کے معنی میں ہے جس کا کوئی مادہ نہ ہو اور ثمود اس شخص کو کہتے ہیں جس
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بروزن توبہ) سے لیا گیا ہے جو پست زمین کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ہر قطعہ زمین کی قطع و برید کے معنی میں آیا ہے۔ کسی بات کے جواب کو اس لیے جواب کہتے ہیں گویا وہ ہوا کو قطع کرتا ہے اور کہنے والے کے منہ سے نکل کر سننے والے کے کان تک پہنچتا ہے (یا اس لحاظ سے کہ سوال کو کاٹ کر ختم کر دیتا ہے)۔

بہرحال یہاں مراد پہاڑوں کے ٹکڑوں کا کاٹنا اور اطمینان کے ساتھ ان سے گھر بنانا ہے، جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت ۸۲ میں اسی قوم ثمود کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں (وکانوا ینحتون من الجبال بیوتاً اٰمنین)۔ وہ دو پہاڑوں کے اندر پُرسکون گھر بناتے تھے۔ ان معنی کی نظیر سورہ شعراء کی آیت ۱۴۹ میں آئی ہے وہاں بیوتاً فارھین کی تعبیر صرف ہوئی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان گھروں میں عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے اور ہوس رانی سے کام لیتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ قوم ثمود وہ پہلی قوم تھی جنہوں نے پہاڑوں سے پتھر کاٹ کر پہاڑوں کے اندر مضبوط و محکم گھر بنانے کا اقدام کیا۔

"وادِ حجر، جس میں وادی تھا، دریا یا سیلابوں کی گزرگاہ کے معنی میں ہے اور کبھی درّہ کے معنی میں بھی آیا ہے، اس لیے کہ سیلاب ان سے جو پہاڑوں کے قریب ہوتے ہیں، گزرتے ہیں۔ یہاں دوسرے معنی مناسب ہیں یعنی درّے اور پہاڑ کے دامن، اس لیے کہ قرآن کی وہ آیات بھی یہی بتاتی ہیں جو اس قوم کے متعلق بیانات دیتی ہیں اور اس کا اوپر بھی اشارہ ہوا ہے کہ قوم ثمود اپنے گھر پہاڑوں کے دامن میں بناتی تھی۔ اس طرح وہ پتھر کاٹتے اور ان کے اندر پُرامن گھر بناتے۔[1]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ غزوہ تبوک کے موقع پر راستہ چلتے ہوئے دبستان کے شمال میں وادیٔ ثمود میں پہنچے۔ آپؐ گھوڑے پر سوار تھے۔ فرمایا جلدی کرو اس وقت تم ملعون و معذب سرزمین پر ہو۔[2]

اس میں شک نہیں کہ قوم ثمود کا تمدن ترقی یافتہ تھا کہ ان کے شہر آباد تھے۔ لیکن پھر ہمیں ایسے اعداد و شمار سے واسطہ پڑتا ہے جو مبالغہ آمیز نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک ہزار سات سو شہر بنائے تھے جو سب کے سب پتھروں سے تعمیر ہوئے تھے۔

اس کے بعد تیسری قوم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور اسی طرح فرعون صاحب ثروت" (وفرعون ذی الاوتاد)۔ جو اس طرف اشارہ ہے کہ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے طاقتور ظالم اور بیداد گر قوم فرعون کے ساتھ کیا کیا۔

"اوتاد" جمع وتد کی (بروزن صمد) جس کے معنی میخ کے ہیں۔ فرعون کو ذی الاوتاد کیوں کہتے ہیں؟ اس

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ: سے زیادہ مال کا مطالبہ کریں اتنی مقدار جس سے اس کے مال میں نقص پیدا ہو جائے بعض اس لفظ کو عجمی کہتے ہیں، مفردات راغب۔

[1] جابوا الصخر بالواد میں باء بظاہر ظرفیت کے معنی رکھتا ہے۔

[2] روح البیان، جلد ۲ ص ۴۲۵۔

کی مختلف تفسیریں ہیں۔

پہلی یہ کہ اس کے بہت سے لشکر تھے جن میں سے بہت سے خیموں میں زندگی گزارتے تھے اور جو خیمے ان کے لیے گاڑے جاتے تھے ان میں میخیں استعمال ہوتی تھیں۔

دوسری یہ کہ فرعون جس شخص پر غضبناک ہوتا، زیادہ تر اس کو یہ سزا دیتا کہ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں میخوں سے باندھ دیتا، یا اس کے ہاتھ اور پاؤں میں میخیں گڑوا دیتا اور اس کو چھوڑ دیتا یہاں تک کہ وہ مرجاتا۔ یہ تفسیر ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے [1]

تاریخ میں آیا ہے کہ جس وقت فرعون کی بیوی حضرت آسیہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئیں تو انہیں بھی یہی سزا دی گئی اور شہید کیا گیا۔ ذی الاوتاد اصولی طور پر قوت اور استقرارِ حکومت کا کنایہ ہے۔

تینوں تفسیریں آپس میں منافات بھی نہیں رکھتیں۔ ہوسکتا ہے کہ آیت کے معنی میں جمع ہوں۔ اس کے بعد مجموعی طور پر ان تینوں اقوام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"وہی جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی" (الذین طغوا فی البلاد) اور ان میں بہت سا فساد برپا کیا اور خرابی کی (فاکثروا فیھا الفساد)۔ فساد جو ہر قسم کے ظلم وستم، تجاوز عن الحدود، عیاشی اور ہوس رانی پر مشتمل تھا۔ واقعی ان کی سرکشی ایک اثر رکھتی ہے اور ہر سرکشی کرنے والی قوم آخرکار ہر قسم کے فساد میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد ایک مختصر اور پُرمعنی جملے کے ساتھ ان تمام سرکش قوموں کی دردناک سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: "لہٰذا خدا نے ان کو عذاب کا تازیانہ لگایا" (فصب علیھم ربک سوط عذاب)۔

"سوط" کے معنی تازیانے کے ہیں۔ اس کے معنی اصل میں ایک چیز کو دوسری چیز سے مخلوط کرنے کے ہیں۔ اس کے بعد اس کا تازیانہ پر بھی اطلاق ہوا ہے جو چمڑے وغیرہ سے بنا ہو۔ بعض مفسرین کے نزدیک عذاب کا کنایہ ہے، ایسا عذاب جو انسان کے گوشت و خون سے مخلوط ہوجائے اور اس کو سخت پریشان و بے حال کردے۔

امیرالمؤمنین حضرت علیؑ کے کلام میں امتحان کے بارے میں ملتا ہے (والذی بعثہ بالحق لتبلبلن بلبلۃ ولتغربلن غربلۃ ولتساطن سوط القدر)۔ "قسم ہے اس کی جس نے پیغمبرؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا تم شدت سختی کے ساتھ موردِ امتحان و آزمائش قرار پاؤ گے، چھلنی کی مانند ہوجاؤ گے، دیگ میں جو چیز ہو اس کی طرح اس کے جوش کھانے اور اُبال آنے کے وقت مل جل جاؤ گے اور اوپر نیچے ہوجاؤ گے" [2]

"صب" کی تعبیر جو اصل میں پانی انڈیلنے اور پھینکنے کے معنی میں ہے، یہاں اس عذاب کی لذت اور استمرار کی طرف اشارہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ صفحۂ زمین کے ان سرکشوں کے وجود سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ بہرحال

---

[1] علل الشرائع نورالثقلین کی نقل کے مطابق جلد ۵ ص ۵۱۰ حدیث ۶۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۔

سوط کے تمام معانی میں سے یہاں مناسب وہی پہلے معنی یعنی تازیانہ ہے۔ وہی تعبیر جو روزمرہ کی گفتگو میں بھی رائج ہے جیسا کہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے دشمن کی پشت پر عذاب کا تازیانہ لگایا۔

یہ مختصر سی تعبیر شدید اور مختلف قسم کے عذابوں کی طرف اشارہ ہے جو اس قوم پر نازل ہوئے۔ قوم عاد تو قرآن مجید کے بقول تیز ٹھنڈی اور جلانے والی ہوا اور آندھی سے ہلاک ہوئی (واما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیۃ) (حاقہ۔ ۶)۔ باقی رہی قوم ثمود تو وہ عظیم آسمانی چیخ کے ذریعہ نابود ہوئی۔ (فاما ثمود فاھلکوا بالطاغیۃ) (حاقہ۔ ۵)، اور قوم فرعون دریائے نیل کی موجوں میں غرق اور دفن ہوگئی (فاغرقناھم اجمعین) (زخرف: ۵۵)

آخری زیر بحث آیت میں ان تمام لوگوں کو ہشیار اور خبردار کرنے کے لیے، جو اس راستہ پر چلتے ہیں جس پر وہ سرکش لوگ چلتے تھے، فرماتا ہے:

"یقیناً تیرا پروردگار کمین گاہ میں ہے" (ان ربک لبالمرصاد) "مرصاد" رصد کے مادّہ سے کسی چیز کی نگہبانی کرنے کے لیے آمادگی کے معنی میں ہے۔ فارسی میں اسے کمین گاہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ عام طور پر ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کچھ افراد مجبور ہوں کہ کسی گزرگاہ سے گزریں اور کوئی شخص اس گزرگاہ میں ضرب لگانے کے لیے آمادہ و تیار ہو۔

اس ساری گفتگو میں اس طرف اشارہ ہے کہ گمان نہ کرو کہ کوئی شخص عذابِ الٰہی سے بچ کر جا سکتا ہے۔ سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور جس وقت وہ ارادہ کرے ان کو سزا دے سکتا ہے اور ان پر عذاب نازل کر سکتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ خدا کا کوئی مکان نہیں ہے اور وہ کسی گزرگاہ میں بھی نہیں بیٹھتا۔ یہ تعبیر اس بات کا کنایہ ہے کہ پروردگار اپنی قدرت کے ذریعہ تمام سرکشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ایک حدیث حضرت علیؑ سے منقول ہے: (ان ربک قادر علیٰ ان یجزی اھل المعاصی جزا ئھم) "تیرا پروردگار قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ گنہگاروں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے"۔[1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: (المرصاد قنطرۃ علی الصراط لا یجوزھا عبد بمظلمۃ عبد) "مرصاد ایک پل ہے اس راستہ پر جو جہنم کے اوپر سے گزرتا ہے۔ جس شخص کی گردن پر کسی مظلوم کا حق ہوگا وہ اس پر سے نہیں گزر سکے گا"۔[2]

یہ حقیقت میں ایک واضح مصداق کے بیان کی قسم میں سے ہے اس لیے کہ خدا کی کمین گاہ قیامت اور مشہور پُل صراط تک محدود نہیں ہے۔ خدا تو اس دنیا میں بھی ہر ظالم کی گھات میں ہے اور گزشتہ تینوں اقوام پر نازل ہونے

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۷۔

[2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۷۔

والا عذاب اس کا واضح مصداق ہے۔

"ربك" (تیرا پروردگار) کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ سنتِ الٰہی تیری امت کی سرکش، ظالم اور ستمگر قوموں کے بارے میں بھی جاری ہوگی۔ پیغمبرؐ اور مومنین کے دلوں کی تسکین بھی ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ یہ ہٹ دھرم اور کینہ پرور دشمن خدا کی قدرت کے چنگل سے کبھی فرار نہیں کرسکیں گے اور یہ ان لوگوں کے لیے خطرہ کی تنبیہ بھی ہے جو پیغمبر اکرمؐ اور مومنین پر ہر قسم کا ظلم وستم روا رکھتے تھے۔ انہیں جان لینا چاہیئے کہ وہ لوگ جو ان سے زیادہ صاحبِ طاقت تھے، ایک تیز آندھی، ایک طوفان، ایک شعلہ اور صیحۂ آسمانی کے مقابلے میں تابِ مقاومت نہ لاسکے، تو یہ کس طرح سوچتے ہیں کہ اپنے ان غلط اعمال کے باوجود عذابِ الٰہی سے نجات پاسکیں گے۔

ایک حدیث پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے آپؐ فرماتے ہیں: "جبرائیل امین نے مجھ کو خبر دی کہ جس وقت خداوند یکتا و اولین و آخرین کی مخلوق کو میدانِ حشر میں جمع کرے گا تو جہنم کو لے آئے گا اور پلصراط کو، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، اس پر رکھ دے گا۔ اس صراط پر تین پل ہوں گے۔ پہلے پُل پر امانت و رست گاری اور رحمت و محبت ہے۔ دوسرے پُل پر نماز اور تیسرے پُل پر پروردگارِ عالم کا عدل ہوگا۔ لوگوں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اس پُل پر سے گزریں۔ جنہوں نے امانت اور رحم میں کوتاہی کی ہوگی وہ پہلے پُل پر ہی رہ جائیں گے۔ اگر اس سے گزر گئے تو نماز میں کوتاہی کی ہوگی تو دوسرے پُل پر ہی رہ جائیں گے۔ اور اگر اس سے بھی گزر گئے تو اپنے راستے کے آخر میں عدلِ الٰہی پائیں گے اور ان ربك لبالمرصاد کے یہی معنی ہیں"[1]

حضرت علیؑ کے ارشادات وکلمات میں ہم پڑھتے ہیں (ولئن امهل الله الظالم فلن يفوت اخذه وهو له بالمرصاد على مجاز طريقه و بموضع الشجى من مساغ ريقه) اگر خدا ظالم کو مہلت دے دے تو اس کی سزا ہرگز ختم نہیں ہوگی۔ وہ ستمگاروں کی گھات میں ہے اور اس طرح ان کے حلق کو اپنے دستِ قدرت میں لیے ہوئے ہے کہ جس وقت چاہے گا اس طرح دبادیگا کہ اس کا لعاب دہن تک گلے سے نیچے نہیں جاسکے گا۔[2]

---

[1] روضہ کافی مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۳، ۵۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۹۷۔

(۱۵) فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝

(۱۶) وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝

(۱۷) كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝

(۱۸) وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

(۱۹) وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝

(۲۰) وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

ترجمہ

(۱۵) لیکن انسان کو جس وقت خدا آزمائش کے لیے عزت دیتا ہے (اس کا اکرام کرتا ہے) اور نعمت بخشتا ہے تو (مغرور ہو جاتا ہے) اور کہتا ہے میرے پروردگار نے میرا اکرام کیا ہے۔

(۱۶) لیکن جب امتحان کے لیے اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور کہتا ہے میرے پروردگار نے مجھے ذلیل و خوار کیا ہے۔

(۱۷) ایسا نہیں ہے جیسا تم نے خیال کیا ہے بلکہ تم یتیموں کا احترام نہیں کرتے۔

(۱۸) اور ایک دوسرے کو مساکین و فقراء کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتے۔

(۱۹) اور میراث کو جائز و ناجائز طریقہ سے جمع کر کے کھاتے ہو۔

(۲۰) اور مال و دولت کو بہت دوست رکھتے ہو۔

تفسیر

نہ اس کی نعمت کے ملنے پر غرور کرو اور نہ سلبِ نعمت پر مایوس ہو

گزشتہ آیات کے بعد جو سرکشی کرنے والوں کو خبردار کر رہی تھیں اور انہیں خدا کے عذاب سے ڈرا رہی تھیں، زیرِ بحث آیات میں مسئلۂ امتحان کو پیش کرتا ہے جو ثواب اور عقابِ الٰہی کا معیار ہے اور انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

لیکن انسان، جس وقت اس کا پروردگار اور اس کی آزمائش کے لیے اس کا اکرام کرے اور نعمت بخشے، تو مغرور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے عزت دی ہے (فاما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن)۔ وہ نہیں جانتا کہ خدائی آزمائش کبھی نعمت کے ذریعہ اور کبھی انواع و اقسام کی مصیبتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ نہ نعمت کا حصول سببِ غور بننا چاہیئے اور نہ مصائب مایوسی اور ناامیدی کا سبب بنیں۔ لیکن یہ کم ظرف انسان دونوں حالتوں میں مقصدِ آزمائش کو بھول جاتا ہے۔ نعمت کے ملنے کے وقت اس طرح خیال کرتا ہے کہ وہ مقربِ بارگاہِ خدا ہو گیا ہے اور یہ نعمت اس قرب کی دلیل ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ابتدا میں کہتا ہے کہ خدا اسے موردِ اکرام قرار دیتا ہے۔ لیکن آیت کے ذیل میں ہے کہ انسان خود کو موردِ اکرامِ خدا دیکھتا ہے۔ اس کی مذمت ہو رہی ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ پہلا اکرام انعام ہی کے معنی میں ہے اور دوسرا اکرام بارگاہِ خدا کے قرب کے معنی میں ہے۔ لیکن جس وقت امتحان لینے کے لیے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

"میرے پروردگار نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا ہے" (واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اھانن)۔ ناامیدی اسے ہر طرف سے گھیر لیتی ہے اور وہ اپنے پروردگار سے رنجیدہ و ناخوش ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے غافل ہے کہ یہ سب چیزیں تو اس کی آزمائش اور امتحان کے ذرائع ہیں۔ وہ امتحان جو انسان کی پرورش اور ارتقا کی رمز ہے اور اس کے بعد استحقاقِ ثواب کا سبب اور مخالفت کی صورت میں استحقاقِ عذاب کا باعث ہے۔

یہ دونوں آیتیں خبردار کرتی ہیں کہ نہ تو نعمت کا ورود تقربِ خدا کی دلیل ہے اور نہ اس کا سلب ہو جانا حق سے دُوری کی دلیل۔ یہ تو امتحان کی مختلف صورتیں ہیں کہ خدا اپنی حکمت کے مطابق ہر گروہ کی کسی چیز سے آزمائش کرتا ہے۔ یہ کم ظرف انسان ہیں جو کبھی مغرور ہو جاتے ہیں اور کبھی مایوس ہو جاتے ہیں۔ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۵۱ میں بھی آیا ہے:

(واذا انعمنا علی الانسان اعرض و نأ بجانبہ واذا مسہ الشر فذو دعاء عریض)۔ جس وقت

قسم کسی انسان کو نعمت دیتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور تکبر کر کے حق سے دور ہو جاتا ہے، لیکن جب اُسے تھوڑی سی تکلیف پہنچے تو ہمیشہ دعا کرتا ہے اور بے تابی دکھاتا ہے۔ اسی طرح سورہ ہود کی آیت ۹ میں آیا ہے (ولئن اذقنا الانسان منا رحمة ثم نزعناها منه انه لیئوس کفور)۔ جس وقت ہم انسان کو رحمت کا ذائقہ چکھائیں اور اس سے چھین لیں تو ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں آیتیں علاوہ اس کے کہ خدا کی آزمائش کے مسئلہ کو مختلف طریقوں سے بیان کرتی ہیں، یہ نتیجہ بھی بخشتی ہیں کہ نعمت سے بہرہ ور ہونا یا اس سے محروم ہونا قربِ خدا یا دُوری پروردگار کی دلیل نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایمان و تقویٰ کا معیار ہے۔

کتنے پیغمبر تھے جو اس دنیا میں انواع و اقسام کے مصائب میں مبتلا رہے۔ ان کے مقابلہ میں کتنے کافر تھے جو گوناگوں نعمتوں سے بہرہ مند تھے۔ دنیا کی زندگی کا مزاج و طبیعت یہی ہے۔ اس آیت کے ضمن میں پروردگارِ عالم ابتلائات اور دردناک حوادث کے فلسفہ کی طرف ایک سربستہ اور اجمالی اشارہ بھی کرتا ہے۔ اس کے بعد ان اعمال کی تشریح کرتا ہے جو خدا سے دوری اور عذابِ الٰہی کے چنگل میں پھنسنے کا موجب ہیں۔ فرماتا ہے:

"ایسا نہیں ہے جیسا تم خیال کرتے ہو (کہ تمہارے اموال پروردگار کے نزدیک تمہارے قربِ منزلت کی دلیل ہیں، بلکہ تمہارے اعمال تو تمہاری خدا سے دُوری کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں)" تم تو یتیموں کا احترام نہیں کرتے" (کلّا بل لا تکرمون الیتیم)۔ "اور ایک دوسرے کو فقراء و مساکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتے" (ولا تحاضّون علیٰ طعام المسکین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یتیموں کو کھانا کھلانے کی بات نہیں کرتا، بلکہ اکرام و احترام کی بات کرتا ہے۔ اس لیے کہ یتیموں کے سلسلہ میں صرف بھوک کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا بلکہ اسے احترام سے محرومی کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور وہ یہ احساس کرنے لگتا ہے کہ چونکہ اس کا باپ مرگیا ہے لہٰذا وہ ذلیل و خوار ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی عزت کی جائے تاکہ وہ باپ کے نہ ہونے کا احساس نہ کرے۔

اسی لیے اسلامی روایات میں یتیموں سے محبت اور ان پر نوازش کرنے کے مسئلہ کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ (ما من عبد یمسح یده علی رأس یتیم رحمة له الّا اعطاه الله بکل شعرة نوراً یوم القیامة) کوئی شخص کسی یتیم کے سر پر دستِ شفقت نہیں پھیرتا مگر یہ کہ خدا ان بالوں کی تعداد کے برابر جو اس کے ہاتھ کے نیچے آتے ہیں قیامت میں اُسے نور بخشے گا۔[1]

سورہ ضحیٰ کی آیت ۹ میں بھی آیا ہے (فاما الیتیم فلا تقهر) "باقی رہا یتیم تو اسے موردِ قہر و تحقیر قرار نہ دے"۔ یہ بالکل اس چیز کے مقابلہ میں ہے جو ایمان و اخلاق سے دور کل کے دورِ جاہلیت کے معاشرہ کی طرح آج کے معاشرہ

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱۵ ص ۱۲۰ (چاپ قدیم)۔

میں بھی رواج رکھتی ہے کہ یتیموں کے مال کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنی ملکیت بنایا جاتا ہے اور اس یتیم کو اس طرح تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ باپ کی غیر موجودگی کا دُکھ تلخ ترین شکل میں محسوس کرتا ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یتیموں کا اکرام ان کے مال کی حفاظت تک محدود نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے، بلکہ اس کے ایک واضح، صاف اور وسیع معنی ہیں جو مال کی حفاظت اور دوسرے امور دونوں کے متقاضی ہیں۔

"تحاضون"[1] کا جملہ حض کے مادّہ سے تحریص و ترغیب کے معنی میں ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ صرف مسکین کو کھانا کھلانا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ لوگ ایک دوسرے کو اس کارِ خیر کے مسئلہ میں شوق دلائیں تاکہ یہ طریق کار معاشرہ کی فضا میں وسعت پیدا کرے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سورہ حاقہ کی آیت ۳۳ میں اس موضوع کو خداوندِ عظیم پر ایمان نہ لانے کے برابر بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(انہ کان لا یؤمن باللہ العظیم ولا یحض علیٰ طعام المسکین) وہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا اور دوسروں کو مسکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتا۔[2]

اس کے بعد اس کے تیسرے غلط کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں موردِ مذمت و ملامت قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے: "تم میراث کو (حلال و حرام طریقہ سے) جمع کر کے کھا جاتے ہو۔ (و تأکلون التراث اکلاً لمّا)۔[3]

اس میں شک نہیں کہ اس مال کا کھانا، جو شرعی میراث کے طور پر کسی شخص کو پہنچے، بُرا نہیں ہے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں اس کام کی مذمت ہو سکتا ہے کہ ذیل کے امور میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہو۔

پہلا یہ کہ مراد اپنے اور دوسروں کے حق کو جمع کر لینا ہو، اس لیے کہ "لم" کا لفظ اصل میں جمع کے معنی میں ہے اور بعض مفسرین مثلاً زمخشری نے کشاف میں خصوصیت سے اس کی حرام و حلال کے درمیان جمع کرنے سے تفسیر کی ہے۔ خصوصاً زمانہ جاہلیت کے عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے اور ان کا حق خود لے لیتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ میراث انہیں ملنی چاہیئے جو جنگجو ہوں (اس لیے ان کے ہاتھ جو اموال لگتے تھے ان میں سے بہت سے مال وہ ہوتے تھے جو غارتگری کے نتیجے میں حاصل ہوتے تھے) لہٰذا وہ صرف ان لوگوں کو حقدار سمجھتے تھے جو غارتگری کے قابل ہوں۔

دوسرے یہ کہ جب میراث تم تک پہنچتی ہے تو تم فقیر و مسکین، عزیزوں اور رشتہ داروں اور معاشرہ کے محروم افراد پر بالکل خرچ نہیں کرتے اور جب تم میراث کے مال کے ساتھ، جو بغیر کسی زحمت و تکلیف کے تمہارے ہاتھ آتا ہے،

---

[1] تحاضون اصل میں تتحاضون تھا جس کی ایک تا تخفیف کے لیے حذف ہو گئی۔

[2] طعام اس آیت میں اور زیر بحث آیت میں مصدری معنی رکھتا ہے اور اطعام (کھانا کھلانے) کے معنی میں ہے۔

[3] "لم" کے معنی جمع کرنا ہیں اور کبھی ایسا جمع کرنا جس میں اصلاح کا مقصد بھی کارفرما ہو اس کے معنی میں آتا ہے۔

اس طرح کرتے ہو تو یقیناً اپنے کمائے ہوئے مال کے بارے میں تو تم زیادہ بخیل اور سخت ہو گے، جو بہت بڑا عیب ہے۔

تیسرے یہ کہ میراث اور چھوٹے بچوں کے حقوق کھاتا ہے، اس لیے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بے ایمان افراد اور وہ جو کسی قانون کے پابند نہیں ہوتے، جب میراث کا مال ان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ یتیم اور چھوٹے بچوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتے اور چونکہ وہ یتیم اور چھوٹے بچے اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتے لہٰذا یہ بے ایمان لوگ اس مال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ قبیح ترین اور شرمناک ترین گناہ ہے۔ ان تینوں تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے[1]

اس کے بعد ان کے چوتھے مذموم عمل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور تم دولت و ثروت کو زیادہ عزیز رکھتے ہو" (وتحبون المال حبًّا جمًّا)[2]۔ تم دنیا پرست اور مال و متاعِ دنیا کے عاشق افراد ہو اور یقیناً وہ شخص جو مالِ دنیا سے ایسا لگاؤ رکھے وہ اس کے جمع کرنے کے وقت جائز و ناجائز، حلال و حرام کا خیال نہیں رکھتا۔ اس قسم کا شخص حقوقِ الٰہی کو بالکل تسلیم نہیں کرتا، یا ان میں کمی کا مرتکب ہوتا ہے۔ جس شخص کو حبِ دنیا نے گھیر رکھا ہو، اس کے دل میں یادِ خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

اس طرح نعمت و بلا کے ذریعہ انسانوں کی آزمائش کے ذکر کے بعد چار ایسی اہم آزمائشوں کی طرف متوجہ کرتا ہے جن کے بارے میں یہ مجرم گروہ ناکام ہو کر مردود ہوا تھا: یتیموں کے بارے میں آزمائش، مسکینوں کو کھانا کھلانے کی آزمائش، میراث کے حصوں کی جائز و ناجائز طریقہ سے جمع کرنے کی آزمائش اور آخر میں بغیر کسی قید و شرط کے اموال جمع کرنے کی آزمائش۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ تمام آزمائشیں مالی پہلو رکھتی ہیں۔ واقعی اگر کوئی شخص مالی آزمائشوں سے عہدہ برآ ہو جائے تو پھر اس کے لیے دوسری آزمائشیں آسان ہو جائیں گی۔ یہ دنیا کا مال ہی ہے جو مشہور قول "ایمان فلک دادہ بباد" کے مطابق دنیا میں ایمان کو خراب کر دیتا ہے۔ آدم کے بیٹے کی عظیم ترین لغزشیں اسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو مال کے ایک حد تک تو امین ہیں لیکن جب ان کا پیمانہ پُر ہو جائے اور وہ اس حد سے گزر جائیں تو شیطانی وسوسے انہیں خیانت کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ سچے مومنین وہ ہیں جو امانت اور صحتِ عمل کا خیال دوسروں کے واجب و مستحب حقوق کے سلسلہ میں مال کی ہر حد میں بغیر کسی قید و شرط کے رکھتے ہیں۔ اس قسم کے افراد کو ایمان اور تقویٰ کا دعویٰ زیب دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ جو افراد ہر حالت میں اور مال کی ہر مقدار کے سلسلہ میں امتحان و آزمائش سے عہدہ برا ہو سکیں، وہ قابلِ اعتماد، متقی، پرہیزگار اور عمدہ شخصیت کے حامل ہوتے ہیں اور بہترین دوست و احباب شمار ہو سکتے ہیں۔ وہ دوسرے معاملات میں بھی (عام طور پر) پاک اور عمدہ افراد ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات جو مالی آزمائشوں تک محدود ہیں وہ اسی وجہ سے ہیں۔

---

[1] تراث اصل میں وراث (ترا ث ہی کے وزن پر) تھا اس کی واو تا میں تبدیل ہو گئی ہے۔

[2] جم جیسا کہ مصباح اللغۃ اور مقاییس میں آیا ہے کثیر اور فراواں کے معنی میں ہے اور جمۃ بروزن جبۃ سر کے آگے جمع شدہ بالوں کے معنی میں ہے۔

(۲۱) كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ

(۲۲) وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ

(۲۳) وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ ۝

(۲۴) يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۚ

(۲۵) فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۙ

(۲۶) وَّلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۝

ترجمہ

(۲۱) ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں جس دن زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی۔

(۲۲) اور تیرے پروردگار کا فرمان پہنچے گا اور ملائکہ صف بہ صف ہوں گے۔

(۲۳) اور اس دن جہنم کو حاضر کریں۔ جی ہاں! اس دن انسان متذکر ہوگا، لیکن کیا فائدہ اس لیے کہ یہ تذکر اس کے لیے سود مند نہیں ہوگا۔

(۲۴) وہ کہے گا کاش اس زندگی کے لیے میں نے کوئی چیز بھیجی ہوتی۔

(۲۵) اس دن کوئی بھی اس جیسا عذاب نازل نہیں کرے گا۔

(۲۶) اور کوئی شخص اس کی طرح کسی کو قید و بند میں نہیں جکڑے گا۔

تفسیر

اس دن بیدار ہوں گے کہ جب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا

ان مذمتوں کے بعد جو گزشتہ آیات میں سرکشی کرنے والوں، دنیا پرستوں اور دوسروں کے حقوق پر ہاتھ

صاف کرنے والوں کی ہوئی تھیں، ان آیات میں انہیں خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ آخر کار قیامت آنے والی ہے اور حساب و کتاب اور جزا و سزا کا مرحلہ درپیش ہے۔ ضروری ہے کہ آپ خود کو اس کے لیے تیار کریں۔ پہلے فرماتا ہے:

ایسا نہیں ہے جیسا وہ گمان کرتے ہیں (کہ حساب و کتاب نہیں ہے اور اگر خدا نے انہیں مال دیا ہے تو ان کے احترام و اکرام کی وجہ سے دیا ہے، نہ کہ آزمائش و امتحان کے لیے) (کلّا)۔

جس وقت زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی (اذا دکت الارض دکّا دکّا)۔ دکّ اصل میں نرم و صاف زمین کے معنی میں ہے۔ پھر اونچی جگہ اور عمارتوں کے لیے کوٹنے اور ریزہ ریزہ کرنے اور صاف کرنے پر اطلاق ہوا ہے۔ "دکان" اس جگہ کو کہتے ہیں جو صاف اور نشیب و فراز کے بغیر ہو۔ "دکّہ" (چبوترا) اس اونچی جگہ کو کہتے ہیں جسے بیٹھنے کے لیے صاف اور تیار کرتے ہیں۔ "دکّ" کی تکرار مندرجہ بالا آیت میں تاکید کے لیے ہے۔ مجموعی طور پر یہ تاکید دنیا کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے زلزلوں اور جھنجوڑ دینے والے حوادث کی طرف اشارہ ہے موجودات میں اس قسم کا تزلزل رونما ہوگا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ اور زمینیں ہموار ہو جائیں گی، جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیہ ۱۰۵ سے ۱۰۷ تک آیا ہے:

(ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفًا فیذرھا قاعًا صفصفًا لا تری فیھا عوجًا ولا امتًا) تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دے میرا پروردگار انہیں برباد کر دے گا اور اس کے بعد زمین کو صاف و ہموار اور بے آب و گیاہ کر دے گا، اس طرح کہ تو اس میں کسی طرح کا نشیب و فراز نہیں دیکھے گا۔

قیامت کے پہلے مرحلہ کے اختتام یعنی اس جہان کی ویرانی کے بعد، دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔ سارے انسان زندہ ہو جائیں گے اور عدالتِ الٰہی میں ظاہر ہوں گے۔ اس وقت تیرے پروردگار کا فرمان آن پہنچے گا۔ فرشتے صف در صف حاضر ہوں گے (وجاء ربک والملک صفًّا صفًّا)۔ محشر میں موجود لوگوں کے اطراف کا محاصرہ کر لیں گے اور فرمانِ حق کے اجرا کے لیے آمادہ ہوں گے۔

یہ تصویر کشی اس عظیم دن کی عظمت اور عدالت کے چنگل سے انسان کے فرار کرنے کی توانائی نہ ہونے کی ہے۔

(جاء ربک) "تیرا پروردگار آئے گا" کی تعبیر اس حقیقت کا کنایہ ہے کہ مخلوقات کے حساب و کتاب کا فرمان پہنچے گا۔ یا پھر خدا کی عظمت کی علامتوں کا ظہور مراد ہے، یا پروردگار کے ظہور سے مراد اس دن اس کی معرفت کا ظہور ہے، اس طرح سے کہ کسی شخص کے لیے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ گویا سب لوگ اپنی آنکھوں سے اس کی ذاتِ بے مثال کے جمال کا مشاہدہ کریں گے۔ بہر حال مسلّم ہے کہ خدا کا آنا، اس لفظ کے حقیقی معنی جن کا لازمہ جسم ہے اور کسی مکان میں منتقل ہونا ہے کوئی امکان نہیں رکھتے اور وہ مراد نہیں رہی اس لیے کہ خدا جسم اور خواصِ جسم سے مبرّا ہے[1]

---

[1] فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتا ہے کہ آیت میں کچھ محذوف ہے اور یہ محذوف ہو سکتا ہے کہ لفظ امر یا قہر یا جلائل آیات یا ظہور معرفت ہو۔ دوسرے مفسرین نے بھی ان چار الفاظ میں سے خصوصاً پہلے لفظ کو تقدیر آیت کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

یہی مفہوم بڑی صراحت کے ساتھ ایک حدیث میں امام علیؑ بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے۔[1] اس تفسیر کی شاہد سورہ نحل کی آیت ۳۳ ہے جس میں فرماتا ہے:

(ھل ینظرون الّا ان تأتیھم الملائکۃ او یأتی امر ربك) کیا وہ اس کے علاوہ توقع رکھتے ہیں کہ فرشتے ان کے پاس آئیں یا تیرے پروردگار کا امر آن پہنچے؟۔ صفاً صفا کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ملائکہ محشر میں مختلف صفوں میں وارد ہوں گے۔ احتمال ہے کہ ہر آسمان کے فرشتے ایک الگ صف میں حاضر ہوں گے اور اہلِ محشر کے گرد گھیرا ڈال دیں گے۔ اس کے بعد فرماتا ہے:

"اور اس دن جہنم کو لے آئیں گے، اس دن انسان متذکر ہوگا لیکن اس کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا" (وجیء یومئذ بجھنم یومئذ یتذکر الانسان وانّٰی لہ الذکریٰ)۔ اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم چلانے کے قابل ہے اور اسے لاکر مجرموں کے قریب کر دیا جائے گا، جیسا کہ جنت کے بارے میں بھی سورہ شعراء کی آیت ۹۰ میں ہم پڑھتے ہیں (وازلفت الجنۃ للمتقین) جنت پرہیزگاروں کے نزدیک کر دی جائے گی۔ اگرچہ بعض مفسرین مائل ہیں کہ ان الفاظ کو مجازی معنوں پر محمول کریں اور جنت و جہنم کے نیکوکاروں اور بدکاروں کے سامنے ظہور کا کنایہ سمجھیں، لیکن اس خلافِ ظاہر کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ بہتر ہے کہ انہیں اس کے ظاہر پر چھوڑ دیا جائے، اس لیے کہ عرصۂ محشر کی حقیقتیں ہم پر مکمل طور پر واضح نہیں ہیں اور وہاں کے حالات ہماری دنیا کے حالات سے بہت مختلف ہیں۔ پھر اس کا کوئی مانع نہیں ہے کہ اس روز دوزخ و جنت کو ان کی جگہ سے ہٹائیں گے۔

ایک حدیثِ پیغمبر اسلامؐ میں ہمیں ملتا ہے کہ جس وقت مندرجہ بالا آیت (وجیء یومئذ بجھنم) نازل ہوئی تو آپؐ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ یہ حالت اصحاب پر گراں گزری۔ وہ حضرت علیؑ کے پاس آئے اور ماجرا بیان کیا۔ حضرت علیؑ آئے اور پیغمبر اسلامؐ کے دونوں شانوں کے درمیان بوسہ دیا اور کہا:

"اے خدا کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں۔ کیا حادثہ رونما ہوا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا: "جبرائیلؑ آئے تھے اور یہ آیت تلاوت کی ہے"۔

حضرت علیؑ کہتے ہیں: "میں نے عرض کیا کس طرح جہنم کو لے آئیں گے"؟

فرمایا: "ستر ہزار فرشتے ستر ہزار مہاروں کے ذریعہ اسے کھینچ کر لائیں گے اور وہ سرکشی کی حالت میں ہوگی۔ اگر اس کو چھوڑ دیں تو وہ سب کو آگ لگا دے گی۔ پھر میں جہنم کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا اور وہ کہے گی: اے محمدؐ مجھے آپ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ خدا نے آپ کا جسم مجھ پر حرام کیا ہے"۔

اس دن ہر شخص اپنی فکر میں ہوگا لیکن جناب سید المرسلینؐ کہیں گے: "ربّ امتی ربّ امتی" (پروردگار میری

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۱۶۴۔

امت میری امت)۔[1]

جی ہاں! جب مجرم انسان ان مناظر کو دیکھے گا تو ہل جائے گا، بیدار ہو جائے گا اور غم واندوہ میں ڈوب جائے گا۔ اپنے ماضی پر نگاہ ڈالے گا اور اپنے اعمال سے سخت پشیمان ہوگا لیکن یہ پشیمانی اس کو کوئی فائدہ نہ دے گی۔ انسان آرزو کرے گا کہ واپس پلٹ جائے اور اپنے تاریک ماضی کی تلافی کرے لیکن واپسی کے دروازے مکمل طور پر بند ہوں گے۔ وہ چاہے گا کہ توبہ کرے لیکن توبہ کا زمانہ ختم ہو چکا ہوگا۔ وہ چاہے گا کہ اعمالِ صالح بجالائے تاکہ اپنے بُرے اعمال کی تلافی کر سکے، لیکن اعمال کا دفتر بند ہو چکا ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اس کی فریاد بلند ہوگی اور وہ کہے گا: "اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے اعمالِ صالح بھیجے ہوتے" (یقول یا لیتنی قدمت لحیاتی)۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہے گا کہ اپنی آخرت کی زندگی کے لیے، بلکہ کہے گا اپنی زندگی کے لیے، گو زندگی کا لفظ آخرت کی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اور جلدی گزر جانے والی، انواع واقسام کے مصائب کی آمیزش رکھنے والی دنیاوی زندگی، زندگی شمار ہی نہیں ہوتی، جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیت ۶۴ میں ہم پڑھتے ہیں (وما ھٰذہ الحیٰوۃ الدنیا الا لھو ولعب وان الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون) "یہ دنیا کی زندگی کھیل کود اور لہو ولعب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے اگر تم جانتے ہو"۔

جی ہاں! وہ لوگ جنہوں نے یتیموں کا مال کھایا، بھوکوں کے منہ میں لقمہ نہیں دیا، ان کا مال ومیراث غارت کیا اور مالِ دنیا کی محبت نے ان کے دل کو مسخر کر رکھا تھا، وہ اس دن آرزو کریں گے کہ کاش کوئی چیز آخرت کی زندگی کے لیے، جو حقیقی اور جاودان زندگی ہے، ہم نے آگے بھیجی ہوتی۔ لیکن یہ آرزو بے نتیجہ ہوگی۔

اس کے بعد دو مختصر جملوں میں اس دن کے عذاب کی شدت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس دن خدا اس قسم کی سزا دے گا کہ اس جیسی سزا کوئی بھی نہیں دے سکے گا" (فیومئذ لا یعذب عذابہ احد)۔

جی ہاں! یہ سرکش جو اپنی قوت کے وقت بدترین جرائم اور گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، اس دن ان کو اس قسم کی سزا ملے گی جو اس سے پہلے کسی کو نہیں ملی ہوگی، جیسا کہ نیکوکار اس قسم کی جزا پائیں گے جو کسی کے خیال وگمان میں بھی نہیں گزری ہوگی، اس لیے کہ خدا ارحم الراحمین بھی ہے اور اشد المعاقبین بھی۔ نیز اس دن کوئی بھی خدا کی طرح کسی کو قید وبند کی سزا نہیں دے گا۔

(ولا یوثق وثاقہ احد)۔ نہ اس کی قید وبند وزنجیر کی کوئی مثال ہے، نہ اس کے عذاب کی کوئی مثل ونظیر ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ انہوں نے اس دنیا میں خدا کے مظلوم بندوں کو جتنا ان سے ممکن تھا قید وبند میں رکھا اور ان کو سخت تکالیف پہنچائیں۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۸۳۔ ان معنی کے قریب نیز تفسیر درالمنثور میں آیا ہے، المیزان کی نقل کے مطابق جلد ۲۰ ص ۴۱۵۔

(۲۷) يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝

(۲۸) ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝

(۲۹) فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝

(۳۰) وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

ترجمہ

(۲۷) تُو اے سکون و اطمینان یافتہ نفس۔

(۲۸) اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جا، اس حالت میں کہ تُو بھی اس سے راضی ہے اور وہ بھی تجھ سے راضی ہے۔

(۲۹) اور میرے بندوں کی صف میں شامل ہو جا۔

(۳۰) اور میری جنت میں وارد ہو جا۔

تفسیر

اے صاحب نفس مطمئنہ!

اس وحشتناک عذاب کے تذکرے کے بعد جو سرکشوں اور دنیا پرستوں پر قیامت میں نازل ہوگا، زیر بحث آیات میں اس کے برعکس، جو صورتِ حال ہے اس کو پیش کرتا ہے۔ اب نفسِ مطمئنہ اور ان مومنین کی طرف جو ان عظیم طوفانوں میں مکمل سکون و اطمینان سے بہرہ ور رہے، متوجہ ہوا ہے۔ انہیں نہایت لطف و محبت سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے نفسِ مطمئنہ"! (یا ایتھا النفس المطمئنۃ)۔ "اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ، اس حالت میں کہ تُو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے" (ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ)۔ "اور میرے بندوں کی صف میں داخل ہو جا" (فادخلی فی عبادی)۔ "اور میری جنت میں داخل ہو جا" (وادخلی جنتی)۔

کیا ہی پُرکشش، دل خوش کن اور روح پرور تعبیریں ہیں، جن سے لطف و صفا اور اطمینان کی خوشبو آتی ہے۔

پروردگار کی دعوتِ مستقیم ایسے نفوس کے لیے، جو ایمان کے سائے میں اطمینان وسکون کی حالت کو پہنچے ہوئے ہیں، انہیں اپنے پروردگار، اپنے مالک و مربی اور مصلح کی طرف بازگشت کی دعوت دیتا ہے' ایسی دعوت جو طرفین کی رضامندی لیے ہوئے ہے۔ دلدادہ عاشق کی رضامندی معشوق کے لیے اور محبوب ومعبودِ حقیقی کی رضامندی۔ اس کے بعد افتخارِ عبودیت کا تاج اس کے سر پر رکھنا اور لباسِ زندگی سے اُسے مفتخر کرنا اور اپنے خاصانِ بارگاہ کی سلک میں انہیں پرونا اور جگہ دینا۔

اس کے بعد انہیں جنت میں ورود کی دعوت دینا اور وہ بھی "میری جنت میں داخل ہو جا" کی تعبیر کے ساتھ جو بتاتی ہے کہ اس مہمان کا میزبان صرف اور صرف خدا کی ذات پاک ہے۔ عجیب دعوت' عجیب مہمان اور عجیب میزبانی ہے۔

نفس سے مراد یہاں وہی انسان ہے اور مطمئنہ کی تعبیر اس سکون واطمینان کی طرف اشارہ ہے جو ایمان کے پرتو کے سائے میں پیدا ہوا ہے' جیسا کہ قرآن کہتا ہے: (الا بذکر اللہ تطمئن القلوب) "جان لو کہ صرف اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے" (رعد۔ ۲۸) اس قسم کا نفس اللہ کے وعدوں پر بھی اطمینان رکھتا ہے اور جو راہ اس نے اختیار کی ہے اس پر بھی مطمئن ہوتا ہے۔ دنیا اس کی طرف بڑھے' تب بھی اور اس سے منہ موڑے تب بھی، طوفانوں میں بھی اور حوادث و بلا میں بھی' اور سب سے بالاتر خوف و وحشت اور قیامت کے عظیم اضطراب میں بھی۔

پروردگار کی طرف بازگشت سے مراد مفسرین کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق، اس کے ثواب و رحمت کی طرف بازگشت ہے' یعنی اس کے جوار و قرب میں جگہ پانا معنوی و روحانی بازگشت پانا نہ کہ مادی وجسمانی۔

کیا پروردگار کی طرف بازگشت کی یہ دعوت صرف قیامت میں ہوگی یا جان دینے اور عمر کے لمحات کے ختم ہونے سے متعلق ہے؟ آیات کا سیاق تو البتہ قیامت سے مربوط ہے' اگرچہ خود اس آیت کی تعبیر مطلق و وسیع ہے۔ راضیہ کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ ثوابِ خداوندی کے تمام وعدوں کو، اس سے زیادہ کہ جتنا وہ تصور کر سکتا تھا، وہ حقیقی طور پر دیکھے گا اور اس طرح خدا کا فضل وکرم اس کے شاملِ حال ہوگا کہ وہ مجسم رضا بن جائے گا۔ باقی رہی مرضیہ کی تعبیر تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ موردِ قبول و رضائے دوست واقع ہوا ہے۔

اس قسم کا بندہ اس طرح کے اوصاف کے ساتھ اور مکمل رضا وتسلیم کے مقام پر پہنچنے کے ساتھ' جس نے عبودیت کی اس حقیقت کو جو معبود کی راہ میں ہر چیز کو چھوڑ دینا ہے، پالیا ہے اور اس نے خدا کے بندگانِ خاص کے دائرہ میں قدم رکھا ہے۔ یقیناً اس کے لیے جنت کے علاوہ کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ آیتیں سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکی ہے' یہ حقیقت میں ایک قسم کی تطبیق ہے، نہ کہ شانِ نزول، جیسا کہ امام حسینؑ کے بارے میں بھی ہم نے سورہ کے آغاز میں پڑھا ہے۔ قابلِ توجہ یہ کہ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک روایت میں ہمیں ملتا ہے کہ آپ کے ایک صحابی نے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مومن اپنی روح کے قبض ہو جانے سے خوش نہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا:

"نہیں خدا کی قسم! جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے تو وہ ناخوشی و ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ اس وقت موت کا فرشتہ اس سے کہتا ہے "اے ولی خدا! پریشان نہ ہو۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے محمدؐ کو مبعوث کیا ہے، میں تجھ پر مہربان باپ سے زیادہ شفیق ہوں۔ ٹھیک طرح سے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھ لے" وہ دیکھے گا رسولِ خداؐ، امیرالمومنینؑ، فاطمۃ الزہراؑ، حسنؑ و حسینؑ اور ان کی ذریت میں سے باقی ائمہ کو، تو فرشتہ اس سے یہ کہے گا: "یہ رسولِ خداؐ، امیرالمومنین، حضرت فاطمۃ الزہراؑ، حسنؑ و حسینؑ اور باقی ائمہؑ تیرے دوست و محبوب ہیں"۔ وہ اپنی آنکھوں کو کھولے گا اور دیکھے گا۔ اچانک ایک کہنے والا پروردگار کی طرف سے کہے گا "یا ایتھا النفس المطمئنۃ" اے وہ شخص جو حضرت محمدؐ اور ان کے اہلبیتؑ پر ایمان رکھتا ہے، پلٹ آ اپنے پروردگار کی جانب، اس حالت میں کہ تُو ان کی ولایت پر راضی ہے اور وہ اپنے ثواب پر تجھ سے راضی ہیں۔ داخل ہو جا میرے بندوں یعنی محمدؐ اور ان کی اہلبیتؑ کے درمیان اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ تو اس موقع پر اس مومن کے لیے کوئی اور چیز زیادہ محبوب نہیں ہوگی۔ وہ چاہے گا کہ جس قدر جلد ہو روح بدن سے رہا ہو اور اس منادی کے ساتھ مل جائے"[1]

خداوندا! ہمیں اس قسم کے اطمینان و سکون سے متفخر فرما تاکہ ہم اس عظیم خطاب کے لائق و شائستہ بنیں۔

پروردگارا! اس مقام تک پہنچنا تیرے لطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے ہمیں اپنے لطف و کرم سے نواز۔

خداوندا! یقیناً کوئی چیز تیرے کرم سے کم نہیں ہوگی، اگر ہمیں صاحبانِ نفوسِ مطمئنہ میں سے قرار دے، ہم پر احسان و کرم فرما۔

بارِ الٰہا! ہم جانتے ہیں کہ یہ سکون و اطمینان تیرے ذکر کے سائے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تُو ہمیں اپنے ذکر کی خود توفیق عطا فرما۔ آمین یارب العالمین

(اختتامِ سورہ فجر اور جلد ۲۶ تفسیر نمونہ کا اختتام)

۷ رمضان المبارک / ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ بتاریخ ۲۴ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۹۸۸ء بوقت ۹ بجکر ۲۰ منٹ شب، برمکان سیٹھ نواز کشن علی، ۸۱-E، ماڈل ٹاؤن لاہور، بدست حقیر پُرتقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور مرحوم۔

---

[1] کافی جلد ۳ باب ان المؤمن لا یکرہ علی قبض روحہ۔ حدیث ۲۔